

مودت اہلبیت علیہم السلام

دس مجالس



علامہ سید مظفر حسین طاہر حسینی مرہوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ طاہر جرولی حیات و خطابت کے آئینہ میں

خوش قسمتی کے رنگین شامیانے کے نیچے سے ہٹ کر دیکھیں تو زندگی سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی ہر وہ شخص جو اس آسمان تلے سانس لے رہا ہے اور زندہ ہے ایک نہ ایک دن نہ چاہتے ہوئے بھی موت کی وادی میں اتر جائے گا۔ جانے والے لوگ اور گزری ہوئی ساعتیں ہمارے لئے بھی جوانی میں عدم کے واسطے سامان کر غافل اور رخصت سفر باندھنے کا اعلان کر رہی ہیں۔ طوالت سفر کے پیش نظر زاد راہ و توشہ آخرت کے لئے ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو زندگی کے مقصد اور نصب العین کو سمجھ کر حیات دائمی اور کمال زندگی کے لئے کوشاں رہتے ہیں ان رہروان راہ خدا میں ایک مقتدر و محترم و بلند ترین نام خطیب ایمان علامہ سید مظفر حسین طاہر جرولی مرحوم کا ہے جو اپنی پوری زندگی اہل بیتؑ کی وکالت کرتے رہے زندگی کا بیشتر حصہ مداحی اہل بیتؑ میں بسر کیا اور بہ فیض جنوں عظمت اہل بیتؑ کے چراغوں کو فروزاں کئے رہے اور ہوا کے رخ پر ان چراغوں کو جلا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہو گئے۔ اور ذاکر حسینؑ و مداح اہل بیتؑ کے عظیم مرتبے پر فائز رہنے کے باوجود بھی آپ مرقع شرافت، مشفق و ہمدرد، خلیق و متواضع، منسار و منکسر المزاج، بے لوث، بے ریا، باعمل، بالاصول، نڈر بیباک، مخلص اور انتھک انسان تھے اور اپنے دور کے علماء، صلحا اور فقہاء کے میخانہ علوم و معارف اور حکمت و دانش سے سیراب و سرشار تھے۔

آپ کی دوستی و دشمنی اہل بیتؑ کی خاطر تھی۔ اور ہمیں بھی آپ سے اسی لئے محبت ہے کہ آپ کو ہمارے آقا و مولا اباعبداللہ حسینؑ اور اہل بیت الطاہرین علیہم السلام سے محبت تھی اور ہے ان کی محبت کا قرض ہم سب عزاداران امام حسین علیہ السلام پر ہے اور تاقیام قیامت باقی رہے گا۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ آپ کے آثار کو باقی رکھیں اسی محبت و عقیدت کے پیش نظر ہم علامہ مرحوم کی تیسری کتاب عزاداران سید الشہداء علیہ السلام اور خصوصاً خطباء و ذاکرین کی نذر کر رہے ہیں تاکہ خطیب ایمان کی ایمان افروز مجالس سے استفادہ حاصل کر سکیں اور مشابہ ہو سکیں۔ آپ کی مجالس کا پہلا مجموعہ ہم ”قرآن و اہل بیتؑ“ کے نام سے شائع کر چکے ہیں یہ انجمن امامیہ کی صد سالہ یادگار کے موقع پر انجمن کی منعقد کردہ سالانہ مجالس کا مجموعہ ہے جو جناب اظہار حسین

● کتاب کا نام _____ مودت اہلبیتؑ

● مصنف _____ طاہر جرولی مرحوم

● اشاعت کا سال _____ جون ۱۹۹۷ء

● ہدیہ _____ چالیس روپے

● ناشر _____ حیدری کتب خانہ ممبئی

● طباعت _____ کلاسیکل پرنٹرس، دہلی

التاس

ایک سورہ فاتحہ

مرحوم و مغفور جناب مولانا سید مظفر حسین صاحب طاہر جرولی
کے روح پر فتوح کوڑھکر بخش دیے۔ احارہ

حیدری کتب خانہ

ناشر۔ ۱۲/۱۵ مرزا علی اسٹریٹ، امام باڑہ روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۹

درد اوڑھے ہوئے چہرے سمندر کی طرح محو حیرت ہیں۔
 یکم دسمبر کی ٹھنڈی سہمی اور برفیلی رات میں تمام اہل خانہ غمیدہ دل گرفتہ تصویر
 یاس بنے ہوئے گزرتے لمحوں کی پییم ازیت سہ رہے تھے کسی کو ایک عمر کی رفاقت ختم
 ہونے کا غم تو بچوں کو شفیق باپ کے سایہ عاطفت سے محرومی کا احساس اور ان کے ماننے
 اور چاہنے والوں کو اپنے محبوب اور شیریں بیاں خلیب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑنے کا
 احساس، لمحہ لحظہ ڈھلتی ہوئی طویل اور بے رحم رات نے ذہن میں الاؤ سا جلا رکھا تھا،
 روح سے نور کا احساس چھٹا جاتا تھا۔ نگاہوں کے آئینے میں عجیب منظر جھلک رہے تھے۔
 گزرتے لمحوں نے جانے کیسی زبان میں اپنے الم لکھے ہیں کہ ہر بڑھنے والا آبدیدہ اور
 اداس نظر آ رہا ہے۔ کہیں یاد کا کوئی ریزہ، کہیں کوئی وعدہ، کوئی دعا، کوئی نیکی، کوئی لمحہ نظر
 نظر اذیتوں کا مرحلہ اور کہیں شب کا کرب گہرے ہوئے ہے۔ مرنے والا عظیم تر تھا اس
 کے بغیر ان سب کا وجود بے اثر لگ رہا ہے ان سب کی آنکھوں میں بچھڑنے والے کی
 تصویر گھوم رہی ہے، بچھڑنے والا وہ کارواں ہے جس کے رکنے میں بھی سفر ہے۔ آنے
 والے طوفان اور گزرنے والی قیامت کا یقین تو سب کو ہے مگر یہ سب کس کو ڈھونڈ رہے
 ہیں متلاشی نگاہیں کس کو کھوج رہی ہیں۔ دلوں کی سرحدوں پہ جو غم دھڑک رہا ہے کہیں
 تو نار سائی کے جزیروں کو پالے گا لیکن یہ وہ دشت بے آرزو ہے جس کا مسافر لوٹ کر
 نہیں آتا۔

خطیب الایمان در ایران

خدا کے گھر میں مہمانان خدا کے ساتھ خود ساختہ پاسان حرم اور سعودی حکومت
 کے ظالم کارندوں کے مظالم اور بیت اللہ کی حرمت کی پامالی اور بیت الحرام کے حجاج کی
 حق پسندانہ مظلومیت کو دنیا کے باضمیر انصاف پسند طبائع، اسلام پسند اور اہل فکر و نظر
 تک پہنچانے کے لئے تہران (ایران) میں منعقد ہونے والی سانحہ مکہ کانفرنس میں شرکت
 کے لئے پوری دنیا کے علماء و دانشور تہران میں جمع ہوئے۔ خطیب الایمان مولانا مظفر
 حسین طاہر جرولی بھی اس کانفرنس میں شرکت اور زیارت ثامن علیہ السلام اور معصومہ
 قم کے آستانہ پر جبین سائی کے لئے اپنے بچوں کے ہمراہ ۲۰ نومبر ۱۹۸۷ء کو ایران ایئر

صاحب پروپرائٹز حیدری کتب خانہ شائع کر چکے ہیں، دوسری کتاب ریاض المجالس کے
 نام سے ہم نے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی۔ یہ مجالس علامہ مرحوم نے امام بارگاہ
 حسینہ مجادیہ میں دورہ پاکستان کے موقع پر پڑھی تھیں۔ مجالس کی یہ تیسری کتاب ہم نذر
 عزاداران سید الشہداء کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے مجلس کو کیسٹ
 سے صفحہ قرطاس تک لانا کتنا مشکل ہے اور اس میں غلطیوں کا بھی بے پناہ امکان ہے۔
 ہم اپنی اس کمزوری و کوتاہی کے لئے اپنے بارہویں آقا حضرت قائم آل محمد علیہ السلام
 راج اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف شہید کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام، خطیب ایمان علامہ
 مظفر حسین طاہر جرولی طاب ثراہ اور عزاداران سید الشہداء علیہ السلام سے شرمندہ
 و معافی کے خواستگار ہیں۔ پروردگار عالم علامہ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے اور جوار
 سرکار وفا میں جگہ عطا فرمائے۔ اور ان کی لحد کو جہاں دن رات رحمت حق کا نزول ہوتا
 ہے مزید منور فرمائے، علامہ مرحوم بڑے خوش قسمت ہیں کہ ان کے تمام بیٹے سرکار
 علامہ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں خصوصاً مولانا غیسم جرولی اور عزیزم شوزب جرولی جو
 خود اب بہترین خطیب ہیں۔ ہم ان کی درازی عمر اور خوش آئند مستقبل کے لئے دعا گو
 ہیں۔

کہاں کا مسافر کہاں رہ گیا!

زائر معصومہ قم مولانا طاہر جرولی کو ان کے جد نے مشہد طلب کر لیا

یکم دسمبر ۱۹۸۷ء کا سورج غم و اندوہ کے بے شمار رقت آمیز مناظر کا امین ہے ابھی
 اسے طلوع ہوئے ایک پہر گزرا تھا کہ آفتاب خطابت غروب ہو گیا۔ زمان و مکان ایک
 لمحے پہ آکر ٹھہرے گئے اس ایک لمحے نے ساری فضا کو اداس اور بے شمار نگاہوں کو
 نمیدیدہ کر دیا۔ ساگن کو بیوگی کی چادر اوڑھادی اور بچوں کو یتیمی کی روح فرسا خبر سنا گیا،
 سوگواروں کو کرب کے عجیب و غریب مراحل سے گزرنا پڑا۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ
 افق تہران پر غم و یاس کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ خطیب الایمان سورہ ہے ہیں اور
 سب جاگ رہے ہیں، اداسی کی گہری دلدل میں دھنسے ہوئے لوگوں کی ننداسی آنکھیں اور

حالیہ سکونت — لکھنؤ
 تفصیلات — سرکار ناصر الملت آپ کے نانا اور
 جناب نصیر الملت محمد نصیر قبلہ اور
 سعید الملت مولانا محمد سعید قبلہ آپ کے
 ماموں تھے
 ابتدائی تعلیم — بسم اللہ سرکار ناصر الملت نے پڑھائی اور
 قرآن و روایات کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔
 انٹرمیڈیٹ — شیعہ کالج سے کیا
 بی اے اور ایل ایل بی — لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔
 آپ کے اساتذہ کرام — سرکار ناصر الملت سرکار نصیر الملت سعید الملت
 مولانا محمد سعید صاحب قبلہ، پروفیسر اکبر علی، ماسٹر تلمیذ حسین،
 امیر حسین صاحب، شہنشاہ حسین، مرزا محمد طاہر، ملا احمد حسین،
 پروفیسر یوسف حسین موسوی اور پروفیسر احتشام حسین۔
 آپ کی شادی — جنوری ۱۹۶۰ء میں سید محسن کاظمی صاحب کی
 صاحبزادی سے ہوئی۔
 اولادیں — آپ کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔
 ذاکری کا آغاز — ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء میں کیا۔
 وفات — یکم دسمبر ۱۹۸۷ء
 جائے تدفین — روضہ اقدس حضرت ثامن علیہ السلام

مولانا مظفر حسین طاہر جرولی کی قومی خدمات

مولانا مظفر حسین طاہر جرولی ایک متحرک، مخلص اور فعال انسان تھے وہ زمانہ طالب
 علمی ہی سے علمی، ادبی، مذہبی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ یہاں ہم ان کی
 گرانقدر خدمات کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ مزار شہید خاٹ
 کے لئے فنڈ اکٹھا کرنے کے سلسلے میں آپ کی کوششوں کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ آپ مزار

لائسنز سے تھران پہنچے جہاں آپ کے قیام کا انتظام ہوٹل لالہ انٹرنیشنل میں کیا گیا تھا۔
 آپ ۲۸ نومبر سے ۲۹ نومبر ۱۹۸۷ء تک کانفرنس میں مصروف رہے۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۷ء کو
 آیت اللہ العظمی آقائے خمینی مدظلہ العالی سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اسی شام
 تھران ٹیلیوژن سے آپ کا ایک انٹرویو نشر کیا گیا۔ ۲۹ نومبر ۱۹۸۷ء کو آپ نے سازمان
 تبلیغات اسلامی کے اعلیٰ اراکین اور وزارت خارجہ کے ڈائریکٹر جنرل سے ملاقات کی
 بعد دوپہر شاہ عبدالعظیم اور بی بی شریانو کے مزار پر حاضری دی۔
 یکم دسمبر کو معصومہ قم سلام اللہ علیہا کے مزار اقدس پہ جانے کے لئے تیار تھے
 میزبان قم کے لئے ٹیکسی لینے کے لئے گئے ہوئے تھے کہ پیام اجل آگیا اور دس بجے صبح
 حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ۲ دسمبر ۱۹۸۷ء
 کی شام آپ کے جد خاکی کو تدفین کے لئے تھران سے مشہد لے جایا گیا۔ ۳ دسمبر
 ۱۹۸۷ء ساڑھے گیارہ بجے سوگواروں کا یہ قافلہ مشہد مقدس پہنچا۔ ۱۳ بجے میت غسل
 و کفن کے لئے بہشت امام رضا لے جاتی گئی۔ ۳ بجکر کچھ منٹ پر جنازہ صحن آزادی پہنچا
 اور طواف کے بعد علماء کرام، طلاب، عوام اور شہری حکام نے نماز جنازہ ادا کی اور پھر
 خدام آپ کے جنازہ کو مزار اقدس حضرت امام رضا علیہ السلام کے احاطہ میں لے گئے
 جہاں خطیب ایمان کی تدفین عمل میں آئی اور وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو کر اپنے
 خالق حقیقی سے جا ملے اور اپنے جد نامدار اپنے آقا و مولا کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

خطیب الایمان کی مختصر سوانح حیات

اسم گرامی — مظفر حسین
 تخلص — طاہر
 لقب — خطیب الایمان
 ولادت — سید نظیر حسین
 جائے ولادت — لکھنؤ
 تاریخ ولادت — ۳۱ دسمبر ۱۹۳۹ء لکھنؤ
 آبائی وطن — جرولی ضلع بہار اور زید پور

نہیں یہ سوچتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے ذہن و دل دریا دریا ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک فعال مبلغ تھے جو شیعیت کی ترویج اور عزاداری سید الشہداء کے تحفظ و قیام کے لئے چالیس سال تک سعی پیہم کرتے رہے۔

ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے ان ارباب جذب و جنوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے اور مذہب حق کی تبلیغ و ترویج کچھ اس طرح کی کہ چودہ صدیوں کی محلاتی سازش و جبر مسلسل کے باوجود آج پوری دنیا میں ۱۸ کروڑ شیعہ وجود ہیں اور یہ فیض صرف اور صرف عزاداری کا ہے جس نے اندرونی و بیرونی دونوں محاذوں پر ہماری حفاظت کی اور یہ ہمارے ان علماء و خطباء کی سعی پیہم اور خلوص خدمات کا نتیجہ ہے کہ ہمارا شمار دنیا کی فعال قوموں میں ہوتا ہے۔

علامہ مرحوم اپنے وقت کے معروف ترین خطیب اور ہر لعزیز شخصیت تھے اور دینی و دنیاوی دونوں علم سے آشنا تھے لیکن اس کے باوجود کمال کی سادگی و انکساری تھی، علامہ مرحوم اپنے مجموعہ مجالس ”قرآن و اہل بیت“ کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں ”میں نے کبھی دعویٰ علم نہیں کیا مجھے اپنی جمالت اور بے بضاعتی کا ہمیشہ احساس رہا ہے، مگر پھر بھی اسکی سعی کرتا ہوں کہ آل محمد کے مسلک کے خلاف جو پروپیگنڈے ہوتے ہیں ان کا سہل اور آسان زبان میں توڑ کر دیا جائے جس میں سوائے توفیقات اہل بیت کے اپنا کچھ نہیں۔ مجھے جو کچھ ملتا ہے اسی در سے ملتا ہے اسے آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اس لئے جو دلیل آپ کو پسند آئے سمجھئے عطاءئے مولا ہے اور جو کی نظر آئے وہ کمر علمی اور بے بضاعتی ہے اس لئے امید ہے کہ آپ اسے برائے اہل بیت معاف فرمائیں گے۔“

علامہ طاہر جرولی کی خطابت کا ایک جائزہ

خطیب ایمان علامہ مظفر حسین طاہر جرولی کی خطابت گزشتہ چالیس سال پر محیط ہے آپ چالیس سال تک محمد و آل محمد علیہم السلام کے وکیل کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ خطابت میں آپ کا اسلوب بہت دلکش تھا، آپ کے لہجے میں نرمی بھی تھی اور گہن گرج بھی، انداز بیان سادہ مگر استدلالی تھا، زبان شیریں و فصیح مطالب لطیف و عام فہم و عالمانہ کوثر کی روانی، تسلیل کا بہاؤ، منبر کا وقار اور آواز میں دبدبہ تھا۔ ان کی

شہید ثالث کے سیکریٹری بھی رہے۔ ۱۸ سال تک شیعہ کالج لکھنؤ کے سیکریٹری رہے۔ وقف حسین آباد مبارک کے پہلی کمیٹی کے متولی رہے۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ۳ سال تک جنرل سیکریٹری رہے آپ کے زمانے میں ۱۹۸۰ء میں بمبئی میں ایک عظیم الشان کانفرنس کے انعقاد کا سربراہ بھی آپ کے سر ہے۔ انجمن تحفظ حسینیہ کے ۱۹۷۶ء سے تادم مرگ صدر رہے شیعہ کاؤنسل کے چیئرمین اور کتب خانہ وقف نامری کے سیکریٹری کی حیثیت سے بھی آپ کی خدمات قابل ستائش و لائق تحسین ہیں۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں مولانا مظفر حسین طاہر جرولی تہذیب لکھنؤ کے چراغوں میں ایک روشن چراغ تھے۔ آپ ادب، شائستگی، سادگی، تہذیب، نفاست، لطافت، آداب اور نجابت کے پیکر تھے۔ خوش طبع، خوش فکر، خوش اخلاق، خوش گفتار انسان تھے آپ کی وضع داری، مہمان نوازی، تواضع شعاری، نرم گفتاری، شیریں لہجی، بلند حوصلگی اور احباب پروری تعارف سے بے نیاز ہے۔

خطیب الایمان جب بھی پاکستان تشریف لاتے آپ کی مجلس سننے کا شرف حاصل ہوتا گاہ گاہ آپ کی محفل میں بیٹھنے کی سعادت بھی حاصل ہوتی ایک بار تنظیم المکاتب کے موضوع پر آپ سے کچھ گرم و سرد اور تلخ و شیریں گفتگو ہو گئی تھی تلخی و گرمی گفتار کا مرتکب و گنہگار میں ہوا تھا سرد و شیریں خطیب الایمان تھے جو ایک خلیق، عزادار و وضع دار انسان تھے دوسری ملاقات پر مرحوم نے محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ پہلی ملاقات سازگار ماحول میں نہ ہوئی تھی بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور خود ہی مخاطب ہوئے اور مزاج پر سی کی آپ کے رویے کو دیکھ کر مجھے بڑی غالت ہوئی، میں نے اپنے گزشتہ رویے پر معذرت چاہی ہنس کر فرمایا۔ رزی میاں ہم تو ان باتوں کے عادی ہیں اور پھر آپ ٹھہرے رزی آپ کے ان الفاظ سے گھڑوں پانی پڑ گیا ان بزرگوں کے ساتھ یہ وضع واریاں بھی ختم ہوتی جارہی ہیں۔ ہر وہ نفس جو زندہ ہے اور اس آسمان تلے سانس لیتا ہے ایک نہ ایک دن اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر جائے گا زندگی کا یہ سفر ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا لیکن خطیب الایمان اب ہم میں

خطابت، امدی دل کے ذرے ذرے کو منور کر دیتی تھی، محبت اہل بیتؑ سے خالی دلوں میں محبت اہل بیتؑ کی شمع روشن کر دیتی تھی۔ آج ان کی خطابت کی خوشبو ہندوستان سے نکل کر دنیا کے کونے کونے میں پھیل چکی ہے، ان کی خطابت رنگ آلود دلوں کو صیقل کر دیتی تھی۔ شیشہ دل کو اجال دیتی تھی، ان کی خطابت کبھی نشتر تھی، کبھی مرہم، کبھی اس میں علم کی مہک ہوتی کبھی حکمت کی خوشبو، کبھی ان کی خطابت شعلہ جوالہ بن کر دشمنان و منکرین اہل بیتؑ کے دلوں کو خس و خاشاک کی طرح جلا دیتی تھی۔ کبھی مومن کے دلوں کو جلا دیتی تھی۔ علامہ طاہر جرولی کی خطابت کبھی شعلہ تھی کبھی مٹھنم، وہ جس نظریے کے حامل و مالک تھے اس سے دوسروں کو متعارف کرانے کا ملکہ رکھتے تھے، علم، ذہانت، بے جگری و بے خونی، عقیدہ کی پختگی، بے غرضی، خلوص، جرات، شعور، ایمان، غرض حسن اخلاق و حسن کردار کی حسین ترین مثال تھے۔ انہیں مخالفین اہل بیتؑ و عزاداری، مقصرین اور اصلاح کے نام پر قوم کو عظمت اہل بیتؑ سے دور کرنے والے خطباء کے خلاف قیام کا ڈھنگ آتا تھا آپ چالیس سال سے زائد عرصہ تک خطابت کے جوہر دکھاتے رہے اور فضائل و مصائب محمدؐ و آل محمدؐ سناتے رہے اور اپنی مخصوص خطابت کی وجہ سے برصغیر بلکہ پوری دنیائے شیعیت میں منفرد مقام رکھتے تھے۔

آپ آیات قرآنی، تفاسیر و احادیث، روایات و درائیت، تاریخ و فلسفہ، معقولات و منقولات نہایت ہی عمدہ اور سادہ طریقے سے پیش فرماتے، اپنی تقریروں میں قوم و مذہب پر کئے گئے اعتراضات کا بڑا شافی اور معقول و مدلل جواب دیتے تھے۔ لیکن مثبت، تعمیری اور صلح جویانہ انداز کے ساتھ۔ آپ نے ہندوستان و پاکستان کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی بے شمار مجالس پڑھیں اور دنیا کا وہ کون سا عزا دار شیعہ ہے جو آپ کے نام سے واقف نہ ہو۔ ان میں سے کچھ نے بالمشافہ آپ کی مجلس سنی ہیں اور کچھ نے آڈیو اور ویڈیو کے ذریعہ آپ کی مجالس سماعت کی ہیں، عقیدہ کی معراج، نظریے کی پختگی، لہجہ کی انفرادیت، الفاظ کی نشست و برخاست، سادگی و پرکاری کا امتزاج آپ کے یہاں پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ آپ اپنے منفرد انداز بھرپور فضائل، بہترین طرز استدلال، منطقی و عقلی استنباط اور اظہار بیان کے حوالے سے دل میں اتر جانے والے اور ذہنوں میں جگہ بنالینے کا سلیقہ جانتے تھے۔ آپ کی موت سے خطابت کا ایک درخشاں باب اور عظیم دور

ختم ہو گیا۔ آسمان علامہ مرحوم کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

آل محمد رزمی

خُطْبَہ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ — الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا
لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ
رَبِّنَا بِالْحَقِّ

وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُوْلِ الثَّقَلَيْنِ مَحْبُوْبِ رَبِّ
الْمَشْرِقَيْنِ وَالْمَغْرِبَيْنِ مَجْدِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ ابْنِ الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ
وَأَهْلِ بَيْتِهِ الطَّاهِرِينَ الْمُعْصومِينَ وَلَعَنَهُ اللّٰهُ عَلَى
أَعْدَاءِهِمْ أَجْمَعِينَ مِنْ يَوْمِنَا هَذَا إِلَى يَوْمِ الدِّينِ
أَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى فِي كِتَابِهِ الْمَجِيدِ
وَفُرْقَانِهِ الْحَمِيدِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ
قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ

خدمت میں اعمال صالحہ کے ذیل میں اور اعمال کی اہمیت پر مجالس پڑھیں تھیں اور یہ عرض کرنے کی کوشش کی تھی کہ ”دین اسلام“ اور اس کے ”احکام“ انسان کے لیے کتنے ضروری ہیں اور خصوصاً مسلمان کے لیے احکام شریعت پر عمل کرنا کتنا ضروری ہے۔

اس سال آپ کے سامنے ”محبت اہل بیت“ کو اس لیے عنوان بنایا ہے کہ اعمال بجالانا، اعمال کرنا ہمارا فرض ہے۔ واجبات پر عمل کرنا ”محرمات“ حرام چیزوں سے پرہیز کرنا، یہ ایک اسلامی فریضہ ہے جو ہر کلمہ پڑھنے والے کے لیے ضروری ہے، مگر عمل کے ساتھ ساتھ ایک لفظ لگا ہوا ہے ”شریعت“ یعنی عمل کرنا ہمارا فرض ہے اور اس عمل کو قبول کرنا اللہ کا کام ہے۔ تو شرائط قبولیت کیا ہیں؟ اس میں اول ترین اور بہترین اور واجبی اور ضروری شرط جو ہے وہ ”محبت اہل بیت“ ہے یعنی اگر آل محمدؑ کی محبت ہے تو اعمال قبول ہوتے ہیں اور اگر آل محمدؑ کی محبت نہیں ہے تو عمل انسان کو اور مسلمان کو سودمند اور فائدہ بخش نہیں ہے۔ اس لیے اس سال آپ کی خدمت میں ”محبت اہل بیت“ کے موضوع پر کچھ گفتگو کرنا ہے۔ ویسے عام طور پر تصور یہ ہے عام طور پر اسلام میں پروپیگنڈہ یہ ہے، شرت اس بات کی ہے کہ عالم اسلام میں کچھ لوگ ہیں جو اتنا سے زیادہ ”محبت اہل بیت“ پر زور دیتے ہیں اور ”محبت اہل بیت“ ہی کو سب کچھ تصور کرتے ہیں اور محبت آل محمدؑ ہی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ یعنی اس طرح سے یہ بات کہی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے، کچھ لوگوں کا نظریہ ہے، کچھ لوگ مسلمانوں میں ایسے ہیں جو سب کچھ محبت کو سمجھتے ہیں یعنی درحقیقت محبت اہل بیت عالم اسلام میں اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی کہ کچھ لوگوں کے پیش نظر ہے۔ اسی لحاظ سے یہ موضوع اختیار کیا گیا ہے کہ آیا وہ کچھ لوگ جو ”محبت اہل بیت“ رکھتے ہیں، کچھ لوگ جو ”محبت اہل بیت طہیبن و طاہرین“ کو اہمیت دیتے ہیں، یہ ان کا ذاتی خیال ہے، ذاتی نظریہ ہے، اسلام میں ان کی ایجاد ہے، اسلام میں ان کا اضافہ ہے، یا یہ کہ حکم الہی یوں ہی ہے، یا مقصد رسولؐ یوں ہی ہے۔ اس لیے میں نے جو آیت آپ کے سامنے عرض کی ہے وہ بہت ہی بین ثبوت ہے، اس بات کا کہ محبت اہل بیتؑ کو کیا اہمیت حاصل ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے :

پہلی مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل لا اسئلكم عليه اجرا“ الا المودة فی القربی

برادران ملت!

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرما رہا ہے کہ ”میرے حبیب! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے ہیں سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقرباء ہیں، قرابت دار ہیں، ان سے مودت اور محبت رکھو۔“

بہت ہی مشہور اور معروف آیت ہے قرآن مجید کی۔ اسے آپ اکثر و بیشتر سماعت فرماتے رہتے ہیں، سنتے رہتے ہیں، علماء و ذاکرین اور عجمان اہل بیتؑ کثرت سے اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں اور کثرت سے آپ اس آیت کے ذیل میں بیانات، مواعظ اور مجالس سماعت فرماتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی اس آیت کو اس سال آپ کی خدمت میں سرنامہ سخن قرار دیا ہے اور موضوع بھی میرا اس سال ان مجالس میں ”محبت اہل بیتؑ“ ہے۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا اور آپ کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے کہ اس سے قبل سن ۸۲ء کے عشرہ محرم میں جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو یہاں میں نے آپ کی

قل لا اسئلكم عليه اجرا" الا المودة فى القربى

اے میرے حبیب! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے۔ سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقرباء ہیں، ہمارے قربت دار ہیں، ان سے تم مودت رکھو، ان سے تم محبت رکھو۔ تو جو چیز قرآن میں حکم کے طور پر آجاتی ہے، اسی کو واجب قرار دیا جاتا ہے اور حکم سے بڑھ کر اللہ نے محبت کا سوال کیا ہے، اور سوال بھی اپنے رسولؐ کے ذریعے کیا ہے۔ میری صرف ایک گزارش ہے، تمام مسلمانوں سے کہ ”محبت اہل بیتؑ“ پر گفتگو کرتے وقت ان کو کم سے کم اتنا لحاظ تو کرنا ہی چاہیے کہ محبت وہ مسئلہ ہے جس کے لیے اللہ نے اپنے رسولؐ کو سائل بنایا ہے اور قرآن مجید کا کھلا ہوا حکم ہے اور کھلا ہوا اشارہ ہے :

سانلہ فلا تنہو ”دیکھو کبھی کسی سائل کو جھڑکنا نہیں۔“

تو جب عام سائلوں کے لیے قرآن کلام واضح حکم ہے کہ ”کسی سائل کو جھڑکنا نہیں“ تو جو ”محبت اہل بیتؑ“ کا سائل ہے اور اسلام کا رسولؐ ہے، کیا اس سلسلے میں بحث کرنا نبیؐ کو جھڑکنے کے برابر نہیں قرار پائے گا۔ اگر عام مسلمان کو عام سائل کو جھڑکنا گناہ ہے اسلام میں، تو اس کو جس نے اسلام پہنچایا، اس کے موضوع پر بحث و مباحثہ کرنا اور اس کو جھڑکنا، یہ کتنا بڑا گناہ ہوگا۔ اب مجھے جو چیزیں اس ذیل میں آپ کے سامنے عرض کرنا ہیں اس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اک غلط فہمی فی زمانہ، آج کے دور میں اور پیدا کی جاتی ہے اور وہ غلط فہمی ہے، عمل اور محبت کے درمیان، یعنی کچھ لوگ، کچھ سوچنے والے، کچھ فکر کرنے والے، ظاہر ہے کسی کی فکر پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ انسان اپنے دماغ سے مختلف موضوعات پر مختلف انداز سے سوچتا ہے اور اظہار کرتا ہے لیکن کم سے کم انسان کو بحیثیت انسان کے اور پھر مسلمان کو بحیثیت مسلمان کے اپنی ہر فکر کے اظہار سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ اس کی فکر اسلام کے مطابق ہے، یا خلاف اسلام ہے۔ اس کی فکر رضائے معبود کے مطابق ہے یا خلاف رضائے معبود ہے۔

ایک فکر یہ ہے کہ ”محبت اہل بیتؑ“ آل محمدؐ کی محبت اور اس محبت پر زور دینا اور اس محبت میں سرشار رہنا اور محبت ہی کو سب کچھ سمجھنا، خارج ہے، حائل ہے، راستہ روکتی ہے، مسلمان کو یا اس طبقہ مسلمان کو جو محبت ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے، اعمال

کرنے سے، عبادت کرنے سے، خدا کے احکام پر عمل کرنے سے اور یہ ایک سوال ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ عبادت کرے اللہ کی، احکام شریعت پر عمل کرے، اللہ کے احکام کو بجالائے یا اہل بیتؑ سے محبت کرے۔ گویا اس طرح سے اس مسئلے کو پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا یہ، یا وہ۔ حالانکہ جو اس بحث کو اٹھائے کہ عبادت کرے اللہ کی، اطاعت کرے، احکام شریعت پر عمل کرے، یا اہل بیتؑ سے محبت کرے تو ”یا“ کا لفظ وہاں لگتا ہے جہاں دونوں ایسی چیزوں کے درمیان سوال آجائے جن کا ایک ساتھ جمع ہونا ممکن نہیں ہے یعنی میں اگر آپ سے پوچھوں کہ میں بولوں یا چپ رہوں تو ظاہر ہے جب بولوں گا تو چپ نہیں رہ سکتا اور جو چپ رہوں گا تو بول نہیں سکتا۔ یعنی جب دو چیزیں متضاد ہوتی ہیں تب ”یا“ پوچھا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی دو چیزیں ایسی ہوں جو ایک دوسرے کا جز ہوں، جس کے بغیر ”یہ“ مکمل ہو نہ اس کے بغیر ”وہ“ مکمل ہو تو وہاں لفظ ”یا“ لگانا کتنی انصاف کی خلاف بات ہے۔ یعنی ”محبت اہل بیتؑ“ اور ”عبادت“ کے درمیان بحث چھیڑنا کتنا بڑا ظلم ہے قرآن مجید کی تشریح اور تفسیر پر، اور کتنا بڑا ظلم ہے سیرت رسولؐ پر اور احادیث پیغمبرؐ پر اور احادیث آئمہ طاہرینؑ پر اور سیرت آئمہ طاہرینؑ پر۔ اگر عبادت اور اہل بیتؑ کی محبت ایک ساتھ جمع نہ ہو سکتیں تو لفظ ”یا“ لگ سکتا تھا لیکن عالم یہ ہے کہ محبت بغیر عبادت کے مکمل نہیں ہوتی اور عبادت بغیر محبت کے قبول نہیں ہوتی۔ صلوٰۃ بر محمدؐ و آل محمدؐ۔

خالق کائنات نے اس کائنات میں جتنی چیزوں کو خلق کیا ہے ان میں زیادہ تر اشیاء، اکثریت سے، کثرت سے، مرکب ہیں۔ اجزاء سے مل کر بنی ہیں۔ بہت سی چیزوں سے مل کے اللہ نے خلق کیا ہے۔ جیسے پانی آپ کے سامنے ہے ”ہائیڈروجن“ اور ”آکسیجن“ سے ملا کر پانی کو بنایا ہے۔ اسی طریقے سے کائنات کی ہر چیز کے ذرے ذرے میں اجزاء کو شامل کیا ہے۔ کچھ چیزوں کو شامل کیا ہے اور شامل کر کے اس کو خلق کیا ہے۔ یہ عالم، یہ کائنات، یہ تخلیق نگوینی ہے۔ اس کی خلقت میں اللہ نے اجزاء کو رکھا ہے۔ جب اجزاء ہم وزن اور معینہ وزن کے مطابق ملتے ہیں تو وہ شے باقی رہتی ہے اور جب اجزاء میں کمی آجاتی ہے تو وہ شے فنا ہو جاتی ہے۔ انسان کو جن چیزوں سے ملا کر بنایا ہے، ان چیزوں کی صحت ہی انسان کی صحت ہے اور ان میں کمی و زیادتی ہی صحت کی خرابی ہے۔

ذرے کو جن چیزوں سے ملا کے بنایا ہے، ان کی صحت اور ان کا وزن اور وزن ہی اس ذرے کے وجود کا سبب ہے اور اوزان کے کھٹنے بڑھنے ہی سے ان چیزوں کے وزن ختم ہو جاتے ہیں اور اجزاء ختم ہو جاتے ہیں۔ جب ساری کائنات کو اس نے اوزان پر خلق کیا، اجزاء سے خلق کیا، تو اس نے اپنے دین میں بھی بت سے جز رکھے۔ ایک جز کا بھی انکار کفر ہو جائے گا اور سارے اجزاء کا تسلیم کرنا اسلام ہوگا۔ سب سے کمزور اور سب سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت جس بات میں ہے وہ دین اسلام ہے۔

اسلام وہ دین نہیں ہے کہ جس میں ہم غلط بحث اور مباحثے کو چھیڑ کر کچھ چیزوں کو تسلیم کر لیں اور کچھ چیزوں کا انکار کر لیں۔ اسلام وہ دین ہے، اسلام وہ آئین ہے، اسلام وہ قانون ہے، اسلام وہ مخلوق ہے، اسلام وہ دستور ہے، جس کے ایک جز کے انکار کا نام کفر ہے۔ یعنی کل کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ جب ہم کل کو تسلیم کریں گے تو مسلم رہیں گے۔ میں ہمیشہ کہہ دیتا ہوں کہ مسلمان بننا مشکل ہے اور اس سے زیادہ مسلمان رہنا مشکل ہے۔ کفر اختیار کرنا آسان ہے اور کافر بننا آسان ہے۔ مسلمان بننا آسان نہیں ہے۔ مسلمان بننے کے لیے بڑی زحمات اٹھانا پڑتی ہیں اور مسلمان رہنے کے لیے اس سے زیادہ زحمات اٹھانا پڑتی ہیں کیونکہ خالق کائنات جانتا تھا کہ کلمہ تو لاکھوں پڑھ لیں گے، کلمہ تو لاکھوں پڑھ پڑھ کے مسلمان ہو جائیں گے، نبی کا کام مسلمان بنانا ہے، نبی کا کام میرا دین پہنچانا ہے، نبی کا کام کلمہ حق کو بیان کرنا ہے۔ لوگوں کا کام اس کو تسلیم کرنا ہے لیکن اسلام تسلیم کر کے اگر اسلام پر باقی نہ رہے تو اسلام قبول کرنے سے فائدہ کیا ہوگا۔ اسی کی حفاظت کے لیے، اس ہی کے تحفظ کے لیے، اسی کی بقاء کے لیے، اسی کی عبدیت کے لیے، اللہ نے اہل بیت کی محبت کو واجب قرار دیا ہے تاکہ وہ دین جو نبی سے ہم تک پہنچا ہے، وہ ویسے کا ویسا ہی باقی رہے جیسا نبی نے ہم تک پہنچایا۔ پھر اس کے بعد یہ سوال کہ عبادت و محبت میں تضاد ہے۔ عبادت اور محبت میں تضاد کیسے ممکن ہے۔ کن کی محبت کو واجب قرار دیا گیا ہے؟ جن کی زندگیاں مرضی معبود میں گزریں، جن کی زندگیاں رضائے معبود میں گزریں، جن کا اٹھنا بیٹھنا ہی عبادت کہلایا، جن کی گفتگو عبادت کہلانی، جن کا سونا عبادت کہلایا، جن کی ایک ضرورت عقلیں کی عبادت پر بھاری کہلانی، ان کی محبت عبادت سے کیسے جدا ہو سکتی ہے۔ صلوٰۃ

اور پھر جہاں تک عبادت کا مسئلہ ہے، عبادت کی روح ہے اہل بیت کی محبت۔ اس لیے کہ اس کو اجر رسالت کے طور پر مانگا گیا۔ جتنی عبادتیں ہیں، قرآن مجید کی آیات سے صریحی طور پر واجب قرار دے دی گئیں۔ جیسے نماز کا حکم شریعی آیا قرآن میں اور حکم ہو گیا ”اقیم الصلوٰۃ“ (نماز کو قائم کرو)۔ جیسے حکم دیا گیا ”کتبا علیکم الصیام“ (روزے تم پر لکھ دیئے گئے)۔ یہ سب احکام کس سے ملے؟ رسول اللہ سے ملے۔ کہاں ہے؟ قرآن مجید میں ہے۔ جس قرآن مجید میں نماز کا حکم ہے، جس قرآن میں نماز کی آیت ہے، جس قرآن میں روزے کی آیت ہے، جس قرآن میں حج کی آیت ہے، جس قرآن میں زکوٰۃ کی آیت ہے، جس قرآن میں خمس کی آیت ہے، جس قرآن میں تمام احکام اسلام کی آیتیں ہیں، اسی قرآن میں ”محبت اہل بیت“ کی آیت ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہر عمل کو انفرادی قرار دیا اور محبت کو اجتماعی قرار دیا یعنی سارے اعمال کا انحصار صلوٰۃ پر قرار دیا۔ حکم ہوتا ہے :

لان	قبلت	قبل	ماسواھا
لان	ردت	ردا	ماسواھا

”دیکھو اگر نماز قبول ہوگئی تو ہر عمل قبول ہے اور اگر نماز رد ہوگئی تو ہر عمل رد ہو گیا۔“

میں ایک بات آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی نماز نہیں پڑھتا تو پھر اس کا کوئی عمل کام نہیں آئے گا۔ میں اس سے ذرا اختلاف رکھتا ہوں۔ اور میرا اختلاف یہ ہے کہ خالی نماز پڑھنے کا حکم نہیں ہے کہ اگر کوئی نماز نہیں پڑھے گا تو اس کا کوئی عمل کامیاب نہیں ہوگا۔ کہاں فرمایا ہے کہ جو نماز نہیں پڑھے گا اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوگا؟ کہاں ہے؟ کہا آپ نے ابھی دہرایا :

لان	قبلت	قبل	ماسواھا
لان	ردت	ردا	ماسواھا

”یعنی اگر نماز قبول ہوگئی تو ہر عمل قبول ہوگا اور اگر نماز رد ہوگئی تو ہر عمل رد ہو گیا۔“

تو پڑھنے کا ذکر کہاں ہے؟ قبولیت کا ذکر ہے یعنی نماز نہ پڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں

”رحمت نازل فرما محمدؐ پر اور محمدؐ کی آلؑ پر۔“

سوال یہ ہے کہ محمدؐ و آل محمدؐ ہماری دعا کے محتاج نہیں ہیں۔ جسے رحمت نازل کرنا ہے، وہ جب چاہے گا، رحمت نازل کرے گا اور جسے رحمت اللعالمین بنا دیا اس کے لیے رحمت الہی کی کیا کمی رہے گی۔ تو آخر ہم کیوں دعا کریں۔ کہا کہ تم اس لیے دعا کرو کہ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم ان کے خیر خواہوں میں ہو کہ نہیں ہو۔ تو اس سے ان پر رحمت میں اضافہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے تم پر بھی رحمت نازل ہوگی۔ اس لیے کہ تم نے خواہش رحمت کی تو اس رحمت کی دعا ہم اپنے اوپر کیوں نہ کریں۔ کہا اگر تم اپنے لیے کرو گے تو اگر مستحق رحمت ہو گے تو رحمت نازل ہوگی اور اگر مستحق رحمت نہیں ہو گے تو رحمت نازل نہیں ہوگی۔ اس کی مثال میں اس طرح سے دیتا ہوں کہ میں نے آپ سے ۱۰۰ روپے مانگے۔ آپ نے کہا کہ اس وقت میری جیب میں ۱۰۰ روپے نہیں ہیں۔ ایک دوسرے صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے کہا آپ کو ۱۰۰ روپے کی ضرورت ہے۔ آپ انہیں ۱۰۰ روپے دے دیں۔ تو اب ظاہر ہے کہ میں آپ سے مانگتا تو شاید آپ مجھے نہ دیتے لیکن جس کے لیے میں نے کہا، آپ نے کھٹ سے کہا ۱۰۰ نہیں ہزار حاضر ہیں۔ جب ان کو مل گئے تو وہ بھی سوچیں گے کہ اب میں اس سے کس بنیاد پر انکار کروں یعنی کسی کو دلا کے وصول کرنا۔ وہی صلوٰۃ کا فائدہ ہے کہ محمدؐ و آل محمدؐ کے لیے دعا کرنے پر خدا سوچتا ہے کہ یہ بندہ بڑا ہوشیار ہے یہ جانتا ہے کہ اس کے اعمال ایسے نہیں ہیں کہ میں اس پر رحمت کی نظر کروں مگر رحمت اللعالمین کے لیے دعا کر رہا ہے لہذا اسے پیار آجاتا ہے۔ رحمت کس چیز کا نام ہے؟ اللہ کے پیار کا نام ہے۔ قمر کس چیز کا نام ہے؟ اللہ کے غضب کا نام ہے۔ صلوٰۃ

اور جب عبادت کی منزل آتی ہے تو آل محمدؐ کا حق، آل محمدؐ کی منزلت، اہل بیتؑ طبعین و طاہرین کی منزلت اتنی بلند ہے کہ قرآن مجید پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ارشاد ہو رہا ہے۔

ان الله و ملائكتہ يصلون علی النبیؐ

”اللہ اور اس کے ملائکہ صلوٰۃ بھیجتے ہیں نبیؐ پر۔“

آپ انصاف سے فرمائیے ہر عبادت میں بندہ تنہا ہے۔ معبود شریک عبادت نہیں

ہوتا۔ خطاب ان سے نہیں جو نماز نہیں پڑھتے۔ خطاب ان سے ہے جو نماز پڑھتے ہیں کہ :

فان	قبلت	قبل	ماسواھا
فان	رحت	ردا	ماسواھا

دیکھو، اگر تمہاری نماز قبول ہوئی تو ہر عمل قبول ہوگا اور اگر تمہاری نماز رد ہوگئی تو ہر عمل رد ہو جائے گا۔ آپ تو بھلا اللہ سب نمازی ہیں۔ میں اگر گناہگار ہوں، خدا نخواستہ تارک الصلوٰۃ ہوں، تو یہ حدیث میرے لیے نہیں ہے۔ اس لیے کہ جو پڑھتا ہی نہیں اس کی قبولیت کا کیا سوال ہے۔ سوال تو پڑھنے والوں کے لیے ہے۔ نماز کو پڑھنا ہی ہے، نماز تو فرض ہی ہے، اس پر تو بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس میں انکار کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں قبولیت کا سوال ہے۔ اے نمازیوں، اے نماز پڑھنے والوں، خالی پڑھ نہ لینا، یہ خیال رکھنا کہ اگر میں نے تمہاری نماز قبول کر لی تو ہر عمل قبول کر لوں گا اور اگر میں نے نماز رد کر دی تو ہر عمل رد کر دوں گا۔ یعنی نماز پڑھ لینا کافی نہیں ہے۔ نماز کو قبول کرانا بھی بندے کا فرض ہے۔ مال سلائی کرنا خالی کام نہیں ہے۔ مال کو پاس بھی کرانا ہوگا۔ تو اللہ کتنا ہے۔ حکم ہوتا ہے۔

فان	قبلت	قبل	ماسواھا
-----	------	-----	---------

”اگر یہ قبول ہوئی تو ہر ماسواہ جو ہے ہر عمل قبول ہو جائے گا۔“

فان	رحت	ردا	ماسواھا
-----	-----	-----	---------

”اور اگر یہ رد ہو گیا تو ہر عمل رد ہو جائے گا۔“

اب میں تمام مفکرین اسلام سے، تمام علمائے اسلام سے، سوال کرتا ہوں کہ نماز کی قبولیت کا سبب کیا ہے؟ اعمال کی قبولیت کا سبب تو نماز ہے مگر خود نماز کی قبولیت کا سبب کیا ہے۔ تو پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا : جو نماز میں مجھ پر اور میری آل پر درود نہ بھیجے گا اس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔ صلوٰۃ

اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے اعمال کا انحصار نماز پر ہے اور نماز کا انحصار درود پر ہے۔ درود کیا ہے؟ دعائے رحمت ہے۔

اللهم صلی علی محمد و آل محمد

نماز قائم کرو۔ کما نماز مسلمانوں کے لیے ہے۔ جب تک مسلمان ہی نہ ہوگا نماز کیا پڑھے گا۔ تو مجھے کہنے دیجئے کہ جیسے یہ حکم اہل اسلام کے لیے ہے، صلوٰۃ کا حکم اہل ایمان کے لیے ہے۔ تو جب تک ایمان ہی نہ لائے گا، صلوٰۃ کیا بھیجے گا اور ایمان لے آیا ہوگا تو صلوٰۃ میں چپ کیسے بٹھا رہے گا۔ صلوٰۃ

اگر کسی تارک صلوٰۃ کو نماز نہ پڑھنے والے کو، دیکھ کر کہا جاسکتا ہے بھی تم کیسے مسلمان ہو جو نماز نہیں پڑھتے۔ تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کیسے مومن ہو جو صلوٰۃ نہیں بھیجتے۔ صلوٰۃ

میری منزلیں ابھی بہت آگے ہیں۔ انشاء اللہ مجلس جوں جوں آگے بڑھتی جائیں گی تو میرا موضوع واضح ہوتا جائے گا۔ اس وقت تو مجھے صرف اتنا آپ کے سامنے عرض کرنا ہے کہ نماز کا حکم سارے مسلمانوں کے لیے ہے کہ نہیں؟ کیا نماز صرف فرقہ شیعہ انشاء عشری کے لیے واجب قرار دی گئی؟ کیا حنفی مسلک پر چلنے والوں کے لیے نماز واجب نہیں؟ کیا شافعی حضرات کے لیے نماز واجب نہیں؟ کیا مالکی حضرات کے لیے نماز واجب نہیں؟ کیا حنبلی حضرات کے لیے نماز واجب نہیں؟ کیا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ نماز تو اللہ کا حکم ہے۔ سب کے لیے واجب ہے۔ تو نماز سب کے لیے واجب ہے نا؟ کہا ہاں سب کے لیے واجب ہے۔ روزہ کس فرقے کے لیے ہے؟ آپ بتائیں، روزہ اللہ نے اسلام کے کس فرقے پر واجب قرار دیا ہے؟ شیعوں سے کہا ہے کہ روزہ رکھو؟ سینوں سے کہا ہے کہ روزہ رکھو؟ دیوبندیوں سے کہا ہے کہ روزہ رکھو؟ وہابیوں سے کہا ہے کہ روزہ رکھو؟ بلوچوں سے کہا ہے کہ روزہ رکھو؟ پاکستان کے مسلمانوں سے کہا ہے کہ روزہ رکھو؟ بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے کہا ہے کہ روزہ رکھو؟ کہا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ تو حکم سب کے لیے ہے۔ تو نماز کا حکم سب کے لیے، روزے کا حکم سب کے لیے ہے۔ کیوں؟ جب اسلام میں فرقے الگ الگ ہیں تو حکم الگ الگ کیوں نہیں ہے۔ تو کہا، صاحب! اللہ نے تھوڑی فرقے بنائے ہیں جو الگ الگ حکم دیتا۔ پھر کس نے بنائے؟ ہم نے بنائے۔ تو جب آپ نے بنائے تو یہ حکم بھی بانٹ لیتے یا یہ کہتے کہ جو نماز پڑھے وہ شیعہ، جو نہ پڑھے وہ سنی۔ یا جو نہ پڑھے نماز وہ شیعہ، جو پڑھے وہ سنی۔ کہا کمال کرتے ہیں۔ قرآن میں صریح حکم ہے۔ ”اقیم الصلوٰۃ“ یہ تو سب کے لیے ہے۔

ہے لیکن یہ وہ عبادت ہے کہ جس میں اللہ بھی شریک ہے۔ فرماتا ہے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ صلوٰۃ بھیجتے ہیں، درود بھیجتے ہیں نبی پر۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔

یا ایہا النبی امنو

”اے وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو۔“ اے وہ لوگوں جو کلمہ پڑھتے ہو نہیں، جو ایمان لائے ہو یعنی درود بھیجنا دلیل اسلام نہیں ہے، دلیل ایمان ہے۔ صلوٰۃ پیغمبر اسلام سے کسی نے پوچھا کہ حضور بجل کی کیا سزا ہے؟ کجوسی کی کیا سزا ہے۔ تو پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ جس چیز کو سب سے زیادہ ناگوار کرتا ہے، وہ بجل ہے۔ کہا کس کو سب سے زیادہ بجل کی سزا ملے گی؟ فرمایا سب سے زیادہ بجل کی سزا اس مسلمان کو ملے گی جو مجھ پر درود بھیجنے میں بجل کرے۔ صلوٰۃ

آج میں آپ کے سامنے تمہید کی منزل سے گزر رہا ہوں تاکہ موضوع کی وضاحت میں مجھے زحمت نہ ہو۔ اس لیے عرض کر رہا تھا۔ اب حقیقت آپ ملاحظہ فرمائیں کہ درود بھیجنا محمد و آل محمد پر، محبت رکھنا اہل بیت طہیٰین و طاہرین سے، یہ اسلامی فرض ہے۔ یعنی قابل فکر یہ بات ہے کہ جس اللہ نے نماز کو واجب کیا ہے، جس اللہ نے روزے کو واجب کیا ہے، جس اللہ نے حج کو واجب کیا ہے، جس اللہ نے زکوٰۃ کو واجب کیا ہے، جس اللہ نے خمس کو واجب کیا ہے، جس اللہ نے جہاد کو واجب کیا ہے، جس اللہ نے دوسرے احکام اسلامی کو واجب کیا ہے، جس اللہ نے رسول کو بھیجا ہے، جس نے رسول کو مبعوث کیا ہے، جس نے رسول کو رحمت اللعالمین بتایا ہے، اسی اللہ نے اہل بیت کی محبت کو اجر رسالت قرار دیا ہے۔ صلوٰۃ

میری منزل ایک قدم آگے ہے۔ حکم خدا سب کے لیے ہے۔

”اقیم الصلوٰۃ“ یعنی ”نماز پڑھو۔“ ”اقیم الصلوٰۃ“ کس سے خطاب ہے؟ کیا ہندوؤں سے کہا گیا ہے ”اقیم الصلوٰۃ؟“ کیا عیسائیوں سے کہا گیا ہے ”اقیم الصلوٰۃ؟“ کیا یہودیوں سے کہا گیا ”اقیم الصلوٰۃ؟“ کیا سکھوں سے کہا گیا ”اقیم الصلوٰۃ؟“ آپ کہیں گے کیا باتیں کر رہے ہو۔ ہندوؤں سے نہیں کہا گیا کہ نماز قائم کرو۔ سکھوں سے نہیں کہا گیا، عیسائیوں سے نہیں کہا گیا، یہودیوں سے نہیں کہا گیا۔ کس سے کہا گیا ہے؟ کہا اللہ مسلمانوں سے کہہ رہا ہے۔ کہاں ہے یہ لفظ کہ اے وہ لوگوں جو اسلام لائے ہو،

کہ اجر رسالت، اہل بیت کی محبت ہے۔ تو کہا کہ میاں یہ تو ہے مگر تھوڑے سے لوگ محبت کرتے ہیں۔ چونکہ تھوڑے لوگ ہر دور میں اہل بیت کے چاہنے والے رہے، تو اہل بیت کے چاہنے والے نہ کئے، تھوڑے سے لوگ اجر رسالت ادا کرنے والے رہے تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے۔ تو کہا کہ چونکہ ایک مخصوص طبقہ ہے مہمان اہل بیت کا، اس لیے عام مسلمانوں نے اس کو فرض نہیں جانا۔ اگر یہی معیار ہے کہ محبت کرنے والے کم رہ گئے تو محبت جزو اسلام نہ رہی تو پھر جس دن نماز پڑھنے والے کم رہ جائیں گے، نماز بھی جزو اسلام نہ رہے گی۔ روزہ رکھنے والے کم رہ جائیں گے تو روزہ بھی جزو اسلام نہ رہے گا۔ حاجی جس دن گھٹ جائیں گے تو اس دن حج بھی جزو اسلام نہ رہے گا۔ تو کہا نہیں۔ وہ تو فرض ہے۔ یہ کب غیر فرض ہے۔ ہر فرض کی اجرت یہی ہے۔ جب اجرت ہے تو حکم سب کے لیے ہے۔ اب اگر کوئی نماز نہیں پڑھتا تو نماز حکم اسلام سے خارج نہیں ہوگی۔ اگر کوئی روزہ نہیں رکھتا تو روزہ شریعت محمدی سے خارج نہیں ہوگا۔ اگر کوئی زکوٰۃ نہیں دیتا تو زکوٰۃ شریعت محمدی سے خارج نہیں ہوگی۔ اگر کوئی جہاد نہیں کرتا تو جہاد شریعت محمدی سے خارج نہیں ہوگا۔ تو اگر کوئی اہل بیت سے محبت نہیں رکھتا تو محبت شریعت محمدی سے خارج نہیں ہوگی۔ صلوٰۃ

ایک چیز۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا اسے تارک الصلوٰۃ کہتے ہیں۔ جو روزہ نہیں رکھتا اسے تارک صوم کہتے ہیں۔ جو حج کرتے نہیں جاتا مستطیع ہوتے ہوئے، اسے تارک الحج کہتے ہیں۔ تو جو محبت نہیں کرتا، ہم اسے تارک المعبت کہیں گے۔ محبت تو فرض ہے۔ جیسے نماز فرض ہے، جیسے روزہ فرض ہے، جیسے حج فرض ہے، جیسے زکوٰۃ فرض ہے۔ لوگ کہتے ہیں، مگر محبت اہل بیت کو اللہ نے اسلام میں واجب تو نہیں قرار دیا جیسے نماز کو واجب قرار دے دیا، جیسے روزے کو واجب قرار دے دیا، جیسے حج و زکوٰۃ کو واجب قرار دے دیا۔ اس طرح محبت کو واجب قرار نہیں دیا۔ تو تشریح واجب کیا ہے؟ کہا جس کا صریح حکم قرآن میں ہے وہ چیز مسلمان پر واجب کھلا ہوا حکم ہے۔ جب کھلا ہوا حکم ہے تو واجب ہے۔ یہاں تو سوال ہے۔

قل لا اسئلكم عليه احرا "ہم اجر کے سلسلے میں تم سے کوئی سوال نہیں کرتے۔"
الا المودة فی القرابی "سوائے اقرباء کی مودت کے۔"

تو معلوم ہوا ہے کہ جو حکم قرآن میں آجائے وہ فرقوں میں نہیں بٹتا۔ روزے کا حکم قرآن میں آگیا تو فرقوں میں نہیں بٹا۔ یہ نہیں کہا سنی روزہ رکھے گا، شیعہ کیوں رکھے۔ سنی رکھتا ہے تو شیعہ روزہ کیسے رکھے۔ شیعہ روزہ رکھتا ہے تو سنی کیسے رکھے۔ حنفی رکھتا ہے تو شافعی کیوں رکھے۔ شافعی رکھتا ہے تو مالکی کیوں رکھے۔ تو کہا داغ آپ کا صحیح ہے؟ سب کو حکم ہے۔ کہا ہاں سب کو حکم ہے کہ اے جتنے فرقے والے ہو سب روزہ رکھنا۔ کہا اللہ کیوں کئے فرقے والوں۔ اس نے تو اسلام بھیجا تھا، فرقے تو نہیں بھیجے تھے۔ تو جب اس نے اسلام بھیجا تھا تو ہر کلمہ گو کو حکم دیا کہ نماز پڑھو، ہر کلمہ گو کو حکم دیا کہ روزہ رکھو، ہر کلمہ گو کو حکم دیا کہ حج کو جاؤ۔ حج میں کون جاتے ہیں؟ حنفی جاتے ہیں کہ شافعی جاتے ہیں کہ مالکی جاتے ہیں کہ حنبلی جاتے ہیں کہ شیعہ جاتے ہیں کہ سنی جاتے ہیں۔ تو کہا کہ آپ کیسی بحث کر رہے ہیں جناب۔ سب جاتے ہیں۔ ارے سب کیوں جاتے ہیں۔ کوئی ایک چلا جائے، کافی ہے۔ کہا نہیں۔ قرآن کا حکم صریح ہے۔ اہلسنت حج کر آئے۔ اب شیعوں کی کہاں ضرورت ہے جانے کی۔ شیعہ کر آئے، اب سینوں کو کیا ضرورت ہے جانے کی! تو کہا آپ نے کمال کر دیا۔ اللہ کوئی فرقوں کو حکم دیتا ہے۔ اللہ تو سب کو حکم دیتا ہے۔ ہر مسلم کو حکم دیتا ہے۔ ہم حج نہ کریں گے، آپ کر آئیں گے تو آپ کا حج ادا ہوگا، ہمارا ادا نہیں ہوگا۔ ہم نماز نہ پڑھیں گے، آپ نماز پڑھیں گے تو حق نماز آپ کا ادا ہوگا، میرا نہیں ہوگا۔ تو جب سارے احکامات اجتماعی ہیں تو پھر قومیں تقسیم نہیں ہیں۔ زکوٰۃ کا حکم اللہ نے شیعوں کو دیا کہ سینوں کو دیا۔ کس کو دیا ہے؟ کہا پھر آپ وہی بحث شیعہ سنی کی نکال رہے ہیں۔ ارے بھئی زکوٰۃ کا حکم سب کو ہے۔ نماز کا حکم سب کو ہے۔ زکوٰۃ کا حکم سب کو، روزے کا حکم سب کو، حج کا حکم سب کو ہے۔ کہا سب کو ہے۔ سب کی پہچان کیا ہے؟ کہا قرآن میں صریح حکم ہی پہچان ہے "سب کو" کی اور یہ آیت بھی میں نے قرآن ہی کی پڑھی ہے :

قل لا اسئلكم عليه احرا "الا المودة فی القرابی

تو یہ حکم بھی سب کو ہی ہے۔ صلوٰۃ

بھئی یہ حکم تو سب کو ہے۔ کہاں کہا کہ اے شیعوں، اہل بیت سے محبت کر کے اجر رسالت ادا کرنا۔ ارے بھئی اے مسلمانوں، جو بھی مسلمان ہے، اس کو حکم دیا جا رہا ہے

رہتے ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت آپ کرتے رہتے ہیں۔ معنی پر بھی آپ غور کرتے رہتے ہیں۔ آپ نے نہ جانے کتنے قرآن ختم کیے ہوں گے۔ مجھے آپ یہ بتانے کی زحمت فرمائیں کہ قرآن میں لفظ ”قل“ کہاں کہاں پہ آیا ہے۔ ”قل هو اللہ احد“۔ ”قل یا ایہا الکفرون“ یعنی جہاں بھی لفظ ”قل“ استعمال ہوا ہے وہ کافروں کے لیے، مشرکوں کے لیے، منافقوں کے لیے۔ ”قل“ کا کیا مطلب ہے؟ کہہ دو، کہو۔ تو کیوں نہیں کہتا؟ کہا یہ میرا انداز ہے کہ میں ان سے خفا ہوں۔ میں ان سے بات نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میرے حبیب تم کہہ دو۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے، جب اللہ مومن سے گفتگو کرتا ہے تو نہیں کہتا میرے حبیب کو، فرماتا ہے ”یا ایہا النین امنوا“ اے وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو۔ اور جب کوئی کافر و مشرک و منافق کی بات آتی ہے تو کہتا ہے ”قل“ کہو۔ یعنی ”قل“ پہچان ہے کہ جن سے کہا جا رہا ہے وہ اللہ کے پسندیدہ نہیں ہیں۔ اب ہم کو ڈھونڈنا پڑے گا تفسیر میں کہ یہ آیت کب نازل ہوئی، کیوں نازل ہوئی، کس کے سامنے نازل ہوئی اور وہ کون تھے جن کے لیے قرآن نے ”قل“ کہا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اسلام پر اللہ کو بھروسہ نہیں ہے کہ کلمہ گو بھی ہیں، اجرت بھی دینا چاہتے ہیں اور اللہ ”قل“ کہہ کے خطاب کر کے بتا رہا ہے، یہ ادا ان کی مجھے پسند نہیں آئی ہے، یہ طریقہ ان کا مجھے بھایا نہیں ہے، اللہ اسلام لانے والوں کو میں اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، میں ان کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میں ان سے کچھ کہوں۔ میرے حبیب تم ان سے کہو۔ ”قل لا اسئلكم“ کوئی سوال نہیں ہے۔

اب میں اس آیت کے واقعہ نزول کو آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں۔ مفسرین نے، عجلائے علمائے اہلسنت نے، دیگر مفسرین نے اپنی اپنی تفسیروں میں تحریر فرمایا ہے کہ مدینے میں کچھ مسلمانوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ پیغمبر اسلام نے اسلام پہنچانے میں بڑی محنت کی ہے، بڑی مشقت کی ہے، لہذا کم سے کم ہم رسول اللہ کو ان کا محتاج نہ دے دیں، ان کو اجرت دے دیں۔ یہ طے کرنے کے بعد ان لوگوں نے: مت رسول میں حاضر ہو کر کشتیاں نذرانے میں گزاریں۔ کشتیوں پر کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ ان کشتیوں میں کیا تھا؟ کچھ قیمتی کپڑے تھے، کچھ جواہرات تھے، کچھ درہم و دینار تھے، سکے

تو دیکھئے ”لا“ بھی ہے اور ”الا للہ“ بھی ہے۔ یہ یاد رکھئے گا، یہ عربی کے دو لفظ اسلام میں جہاں استعمال ہوتے ہیں، وہاں سے پھر نکلنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ”لا للہ“ کوئی اللہ نہیں ہے۔ الا للہ سوائے اس واحدہ لا شریک کے۔ وہی ”لا“ اور ”الا للہ“ یہاں بھی ہے۔

قل لا اسئلكم ”تم سے کوئی سوال نہیں ہے۔“

الا المودة ”سوائے مودت کے لیے۔“

یعنی ماحضر ہے۔ اللہ نے سب چیزیں تم پر واجب کی ہیں۔ تم سے مانگا کچھ نہیں ہے۔ مانگی ہے صرف ان کی محبت۔ اے میرے معبود جہاں تو نے ہر چیز واجب قرار دے دی وہاں ”محبت اہل بیت“ کو بھی واجب قرار دیتا۔ سوال کیوں کیا اور اپنے حبیب سے سوال کیوں کروایا کہ ”کہہ دو تم سے کوئی سوال نہیں ہے۔“ لفظ ”سوال“ کے بجائے حکم ہوتا صریحی، تو کم سے کم فروغ دین میں ”محبت اہل بیت“ شامل ہو جاتی تو قدرت جواب دے گی تم سمجھ نہیں۔ جس چیز کا ہم نے تم کو حکم دیا ہے اس حکم کو نہ بجالانے کے لیے اور نہ بجالانے والے کے لیے توبہ اور استغفار بھی رکھی ہے کہ اگر کوئی کسی وقت تک نماز نہیں پڑھتا اور اسے احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور وہ توبہ کر کے پابند نماز ہو جائے اور قضائے عمری پڑھ لے اور اگر عمر و فائدہ کرے تو بیٹا اگر اس کی نمازیں پڑھ دے تو چونکہ واجب ادا ہو گیا۔ لہذا جزا لازم ہو گئی۔ توجہ فرمائیے گا۔ اس لیے میں نے واجب میں نہیں رکھا براہ راست۔ میں نے سوال کیا کیونکہ یہ بھی تو مغفرت کا سوال کرتے ہوئے آئیں گے۔ یہ بھی تو رحم و کرم کا سوال کرتے ہوئے آئیں گے۔ تو میں ان سے پوچھوں گا تم لاکھوں سوال کر رہے ہو۔ میں نے ایک سوال کیا تھا۔ جس نے میرے سوال کا جواب دیا وہ مجھ سے سوال کرنے کا مستحق ہے۔ لیکن جس نے میرے رسول کے سوال کی اہمیت نہیں سمجھی، اس کو کیا حق ہے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کر سکے۔

اب آپ ذرا اس منزل کو ملاحظہ فرمائیے۔ ”قل“ کہہ دو۔ ”لا اسئلكم“ تم سے کوئی سوال نہیں کیا جاتا اجر رسالت کے سلسلے میں سوائے اقراء کی مودت کے۔ تو یہ ”قل“ کا لفظ اور مسلمانوں سے خطاب۔ آپ ماشاء اللہ سے تلاوت قرآن مجید فرماتے

ناواقفیت میں نہیں پہچان رہا ہے اور یہ کلمہ پڑھ کے نہیں پہچان رہا ہے۔ لہذا ہر مسلمان کو اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ کم سے کم وہ اپنے رسولؐ کے مرتبے سے واقف ہو جائے۔ ایک مرتبہ ابروؤں پر بل پڑ گئے۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لوگ گھبرا گئے۔ نبیؐ خاموش تھے کہ امین وحی یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔

قل لا اسئلكم عليه اجرا الا المودة لى القربى

”میرے حبیبؐ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقرباء ہیں ان سے مودت رکھو۔“

جب یہ آیت نازل ہوئی۔ سب اپنی کشتیاں اٹھا کر لے گئے۔ یہاں پر دو یا تین باتیں آپؐ کی خدمت میں عرض کرنا ہیں جو میرے سوالات ہیں۔ وہ سوالات یہ ہیں کہ جو لوگ کشتیوں میں نذرانہ لے کر آئے تھے، تو یہ کوئی حادثہ تو نہیں تھا کیونکہ سب کا ساتھ آنا بتاتا ہے کہ بات منظم ہے۔ پہلے کہیں بیٹھے ہوں گے۔ لوگوں نے فکر کی ہوگی، غور کیا ہوگا، اصول طے کیا ہوگا کہ ہمیں اجرت دینا چاہیے۔ ہم کو تو اجرت ادا کرنا چاہیے، پھر اس کے بعد یہ سوچا ہوگا کہ کیسے اجرت ادا کی جائے۔ تو یہ طے ہوا ہوگا کہ جس کے پاس جواہرات ہوں، وہ جواہرات لائے۔ جس کے درہم و دینار ہوں، وہ درہم و دینار لائے۔ جس کے پاس پارچے ہوں، لباس ہو، کپڑے ہوں، وہ کپڑے لائے اور سب چندہ جمع کر کے، ایک جگہ جمع کر کے، نبیؐ کو اجرت دے دی جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سب نے ایک بات طے کی اور طے کر کے خدمت رسولؐ میں آئے۔ لیکن اللہ نے اس بات کو قبول نہیں فرمایا تو ایک بات کا ثبوت اور ملا کہ ضروری نہیں ہے کہ ہم مسلمان جس بات کو طے کر لیں، وہ اللہ کو پسند بھی ہو۔ یہ لازمی نہیں ہے چاہے ہماری نیت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے اس میں نیت کی کیا خرابی۔ اجرت دینا چاہتے ہیں۔ محتانہ دینا چاہتے ہیں۔ رسولؐ کی عظمتوں کا اقرار کر رہے ہیں۔ رسولؐ کو اجرت دے رہے ہیں مگر آواز آتی ہے ”قل“ کہہ دو ان سے۔ یہ ”کہہ دو“ یہ بتاتا ہے کہ اللہ ان کو پکا مسلمان نہیں سمجھ رہا ہے۔ کچھ خامی محسوس کر رہا ہے۔ تم اور میرے نبیؐ کو اجرت دو گے۔ تو کہا کہ نہیں۔ تو پھر نہیں تو نہیں، لے جاؤ۔ آواز آنا چاہیے تھی کہ میرا حبیبؐ نصرت نہیں چاہتا اس کی خدمتوں کا کوئی محتانہ نہیں ہے۔ اس کی کوئی اجرت نہیں ہے۔ یا یہ جواب

تھے سونے اور چاندی کے، وہ لے کر آئے تھے جس وقت پیغمبرؐ مسجد میں تشریف فرما تھے اور کشتیاں حضورؐ کے سامنے رکھی گئیں۔ تو حضورؐ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ کیا یا رسول اللہؐ آپ نے اسلام پہنچانے میں بڑی زحماتیں اٹھائیں۔ ہم عالم کفر و شرک میں تھے، آپ نے ہمیں کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ سے سرفراز فرمایا۔ ہم تاریکی میں تھے، آپ نے ہمیں نور عطا فرمایا۔ ہم عالم جہالت میں تھے، آپ نے ہمیں علم عطا فرمایا۔ تو اس کے لیے ہم یہ محتانہ لے کے آئے ہیں اور یہ کہہ کے وہ کپڑے ہٹا دیئے تاکہ پیغمبرؐ اسلام ملاحظہ فرمائیں۔ راوی کہتا ہے کہ جس وقت خوان پوش اٹھائے گئے اور پیغمبرؐ کی نظر قیمتی پارچوں پر پڑی، قیمتی کپڑوں پر پڑی، جواہرات پر پڑی تو ایک مرتبہ حضورؐ کا چہرہ مبارک بدل گیا۔ یہ بڑی اہم منزل ہے۔ یہاں پر میں آپؐ روکوں گا۔ یہ وہ رسولؐ ہے جس نے پتھر کھائے ہیں اور چہرہ بدلا نہیں جبکہ جبرئیل کو یہ حکم تھا، ملائکہ کو یہ حکم تھا کہ میرے حبیبؐ کے ابروؤں پر بل پڑیں تو زمین کا طبقہ الٹ دینا لیکن چاروں طرف سے پتھر آتے تھے۔ پتھروں میں حضورؐ چھپ جاتے تھے۔ ابو جہل (لعین) گھبرا جاتا تھا، ابوسفیان (لعین) پریشان ہو جاتا تھا کہ یہ اللہ کا رسولؐ ہمارے حق میں بددعا کر رہا ہے مگر جب کان قریب لے جاتا تھا تو سنتا تھا کہ آواز آرہی ہے ”معبود مجھے موقع دے کہ میں انہیں سمجھاؤں“ انہیں توفیق دیے کہ یہ میری بات کو سمجھیں اور میرے معبود ابھی عذاب نہ نازل کرنا۔ ”تو وہ رحمت اللعالمین جو پتھر کھا کے، عذاب روکے رہے اور جس کے ابروؤں پر بل نہ آئیں تو جواہرات سامنے آئیں، ہیرا سامنے آئے، پکھراج سامنے آئے، یا قوت سامنے آئے، لعل سامنے آئے اور کپڑے سامنے آئیں اور سونے اور چاندی کے سکے سامنے آئیں اور اس کے چہرے کا رنگ بدل جائے۔ مقام فکر ہے کہ نہیں۔ جس نبیؐ کے ابروؤں پر بل نہ آئیں پتھر کھا کے، دولت دیکھ کر اس کے چہرے پر بل آگیا۔ کیا سبب ہے؟ سبب یہی ہے کہ وہ ناواقف تھے مرتبہ رسالت سے۔ لہذا دعا کرتے تھے کہ سمجھانے دے، انہیں سمجھنے کا موقع دے۔ یہاں چہرے کا رنگ کیوں بدل گیا۔ اس لیے کہ یہ کافر نہ تھے، مسلم تھے۔ نبیؐ کے چہرے کا رنگ یوں بدلا کہ وہ تو جانتے ہی نہیں کہ میں کون ہوں۔ اس لیے کلمہ نہیں پڑھتے اور تم نے کلمہ پڑھ لیا اور نہ جانا کہ میں کون ہوں۔ یعنی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مشرک اور کافر سے زیادہ عذاب ہوگا اس مسلمان پر جو اپنے رسولؐ کا مرتبہ نہ پہچانے گا کیونکہ وہ تو

نے یہ بات دیکھی ہے۔ جیسے ایک پولیس سپاہی، ایک ٹیکسی میں، ایک رکشہ پر، سوار ہو جاتا ہے۔ چلو ہم کو یہاں سے اس چوراہے تک پہنچاؤ۔ اور جو رکشہ والا کہتا ہے، پیسے لاؤ۔ پیسے کیسے؟ ہم کار سرکاری سے آئے ہیں۔ کوئی ذاتی کام سے آئے ہیں؟ یعنی چونکہ ہم گورنمنٹ کے کام سے آئے ہیں لہذا کرایہ کیوں دیں۔ ایک مزاج بن جاتا ہے کہ بڑے کام کو تو چھوٹے کا گلا دبا دو۔ اللہ کہتا ہے میرا یہ مزاج نہیں ہے۔ میرا بھی حق ادا کرو تو میرے بندے کا بھی حق ادا کرو۔ تو جو ایک معمولی بندے کے حق کا اتنا محافظ ہے وہ اپنے رسول کے حق کا کتنا بڑا محافظ ہوگا؟ ہم تو نماز پڑھتے ہیں، ہم تو روزہ رکھتے ہیں، ہم نے توجہ بھی کیا ہے، ہم تو زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، ہم تو فسخ بھی نکالتے ہیں، ہمیں کیا ضرورت ہے محبت کی؟ آپ نے نماز پڑھی ہے، اسی لیے ضرورت پیدا ہوئی۔ نہ پڑھی ہوتی تو کیا ضرورت تھی۔ روزہ رکھا، اسی لیے ضرورت پیدا ہوئی۔ حج کیا، اسی لیے ضرورت پیدا ہوئی۔ اگر آپ احکام اسلامی پر عمل نہ کرتے تو محبت کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چونکہ عمل کر لیا ہے لہذا اب ضرورت ہے کہ اجرت ادا کیجئے تاکہ نماز قبول ہو جائے، تاکہ روزہ قبول ہو جائے، تاکہ حج قبول ہو جائے، تاکہ زکوٰۃ قبول ہو جائے، ہر عمل کی قبولیت کا انحصار محبت ہے۔

اب جیسے خدا کی اطاعت فرض ہے۔ اطیع اللہ ”اللہ کی اطاعت کرو۔“ اور آپ کہیں حکم اطاعت ہے، کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے، رکوع کی کیا ضرورت ہے، سجدے کی کیا ضرورت ہے۔ کہا بحث نہ کرنا۔ ”اطیع اللہ“ کا مطلب یہ ہے کہ جیسے نبی نے بتایا ہے ویسے نماز پڑھ لو۔ تو خدا نخواستہ اگر میں نماز نہ پڑھتا ہوں اور آپ مجھ سے پوچھیں، تم اللہ کا احترام نہیں کرتے، تم اللہ کو نہیں مانتے اور میں جواب میں کہوں مجھ سے زیادہ آپ کیا جانیں گے اللہ کو۔ میں جتنا اللہ کو مانتا ہوں، مگر میں دل سے مانتا ہوں۔ بھی میں ظاہر داری میں نہیں پڑتا لوگوں کی طرح سے۔ نماز پڑھ رہے ہیں، روزے رکھ رہے ہیں، حج کو چلے جا رہے ہیں، زکوٰۃ دے رہے ہیں، فسخ نکال رہے ہیں، جہاد کر رہے ہیں۔ ارے میں دل سے مانتا ہوں۔ مانتا دل سے ہوتا ہے۔ تو مانتا تو دل سے ہوتا ہے لیکن اظہار ہاتھ پیر سے ہوتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ کہ اسلام خالی دل سے ماننے کا مذہب نہیں ہے بلکہ اسلام عمل سے ظاہر کرنے کا مذہب ہے۔ نماز جماعت کی بھی ہے

آتا تمہاری حیثیت کہ تم ہمارے نبی کی اجرت ادا کرو۔ لیکن اللہ رے رحمت الہی۔ نہ یہ کہا کہ منظور ہے، نہ یہ کہا کہ نامنظور ہے۔ اجرت سے انکار نہیں کیا۔ شے اجرت کو بدل دیا۔ تم اجرت دینا چاہتے ہو۔ درہم و دینار سے، تم اجرت دینا چاہتے ہو لباس سے، تم اجرت دینا چاہتے ہو مال دنیا سے اور ہم اجرت مانگیں گے محبت اہل بیت سے۔ فرق کیا ہے اجرت در اجرت ہو جائے۔ یہ اجرت تم اس لیے دے رہے ہو کہ نبی کے کام آئے۔ میں وہ اجرت مانگ رہا ہوں جس کو تم ادا کرو تو پھر تمہارے ہی کام آئے۔ صلوٰۃ جیسے نماز کا حکم، جیسے روزے کا حکم، جیسے حج کا حکم، جیسے زکوٰۃ کا حکم، جیسے فسخ کا حکم، جیسے جہاد کا حکم، ویسے ہی محبت کا حکم۔ تو یہ حکم اسلام ہے، یہ حکم الہی ہے، یہ جزو شریعت اسلام ہے، اسے تو ہر مسلمان کو ماننا چاہیے کیونکہ اجرت ہے۔ اب اس میں آپ نزاکت محسوس کریں کہ اعمال کے طریقے مختلف ہو گئے۔ نماز ایک طرح سے مسلمان نہیں پڑھتا، مختلف انداز سے پڑھتا ہے۔ روزے کے بھی مسائل الگ ہیں۔ زکوٰۃ کے بھی مسائل الگ الگ ہیں۔ حج کے بھی مسائل الگ ہیں۔ مسائل الگ ہیں لیکن نماز تو سبھی پڑھتے ہیں۔ مسائل الگ ہیں مگر روزے تو سبھی رکھتے ہیں۔ مسائل الگ ہیں مگر حج تو سبھی کرتے ہیں اور یہ ہے اجر۔ کس کی اجرت ہے؟ نماز کی اجرت، روزے کی اجرت، حج کی اجرت، زکوٰۃ کی اجرت۔ نبی نے کیا پہنچایا؟ احکام خدا ہی تو پہنچائے۔ و احکام خدا پر عمل کرنا ادائے فرض ہے اور ان کی اجرت دینا، ان عمل کو جائز بنانا ہے۔ جب تک کہ اجرت ادا نہیں کی جائے گی، عمل جائز ہی نہیں ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ عمل کی قبولیت کا انحصار قواعد اور قانون پر ہے۔ میں آپ کے گھر میں گیا اور بغیر آپ کے اجازت کے میں نے نماز شروع کر دی۔ آپ کو یہ حق ہے کہ آپ مجھ سے پوچھیں کہ گھر میرا نماز پڑھنے والا ہے؟ آپ کون؟ آپ نے بغیر میری اجازت کے نماز کیوں پڑھی؟ نماز تو اللہ کی ہے۔ بے شک اللہ کی ہے مگر اسی اللہ کا یہ حکم ہے کہ جس کے گھر میں پڑھو، اس سے اجازت حاصل کر لو۔ اے میرے معبود، بندہ بھی تیرا، نماز بھی تیری، اجازت کا کیا سوال؟ تو خدا نے کہا کہ میں یہ سمجھا رہا ہوں کہ میرے حق کا سہارا لے کے بندوں کا حق غصب نہ کرنا۔ صلوٰۃ

یہ اس لیے آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں کہ سماج میں اور معاشرے میں آپ

نماز فرادہ بھی ہے لیکن حکم یہ ہے کہ اگر محلے میں مسجد موجود ہے اور وہاں تک تم پہنچ سکتے ہو تو گھر میں نہ پڑھو، مسجد میں جا کے نماز پڑھو۔ اور اگر خدا نخواستہ تم پر یہ شک ہونے لگے کہ تارک الصلوٰۃ ہو، تو اکیلے میں نہ پڑھو، دکھا کے پڑھو۔ تو یہ ریاکاری نہیں ہے۔ یہ بھی اطاعت الہی ہے۔ تو جب اللہ کی عظمت، اللہ کی اطاعت، اللہ کی عبادت بغیر دکھائے اسلام میں مکمل نہیں ہوتی تو اہل بیت کی محبت بغیر دکھائے دل سے کیسے ہوگی؟

لوگ کہتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ آپ صرف مجلس کرتے ہیں، آپ ماتم کرتے ہیں، آپ روتے ہیں، آپ سیاہ لباس پہنتے ہیں، آپ رسوم بجالاتے ہیں۔ بھی ہم بھی کرتے ہیں مگر ظاہر نہیں کرتے، آپ ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہ ویسا ہی بندہ ہے جو اللہ کا احترام تو کرتا ہے مگر نماز پڑھ کے ظاہر نہیں کرتا، روزہ رکھ کے ظاہر نہیں کرتا۔ ویسے ہی وہ چاہنے والے ہیں جو محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر اظہار محبت میں شرماتے ہیں۔ محبت کی منزل کیا ہے؟ محبت کی پہچان کیا ہے؟ محبت کے دو موقع ہوتے ہیں۔ یا خوشی میں محبت پہچانی جاتی ہے یا غم میں محبت پہچانی جاتی ہے لیکن خوشی کی محبت میں محبت معیار کو نہیں پہنچتی۔ اور غم میں محبت معیار کو پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے کہ خوشی میں کچھ مفادات ہوتے ہیں، کچھ نظر کا لطف ہوتا ہے، کچھ کانوں کا لطف ہوتا ہے، کچھ کام و دہن کا لطف ہوتا ہے۔ اس لیے یہ طے نہیں ہو پاتا کہ آپ محبت سے آئے ہیں یا لطف لینے کے لیے آئے ہیں۔ شادی میں جانا محبت کی دلیل ہے۔ ولیمہ کھانا محبت کی دلیل ہے۔ برات میں جانا محبت کی دلیل ہے لیکن طے نہیں ہو پاتا کہ یہ جو آئے ہیں، یہ محبت میں آئے ہیں یا ولیمے کے لالچ میں آئے ہیں۔ معین نہیں ہو پاتا لیکن غم کے موقع پر طے ہو جاتا ہے کہ اگر محبت نہ ہوتی تو آنے والا آتا کیوں! اس لیے کہ رونا ہے، خاموش رہنا ہے اور مصیبت میں شریک ہونا ہے اور مصیبت میں تسلی دینا ہے۔ آپ بھی اسے محبت سمجھتے ہیں جو آپ کے غم میں شریک ہوتا ہے۔ تو اللہ بھی اسے محبت سمجھتا ہے جو اہل بیت کے غم میں شریک ہوتا ہے۔

یہ ظاہر داری نہیں ہے، یہ رسم نہیں ہے، یہ رواج نہیں ہے۔ یہ مجالس، یہ عشرہ محرم، یہ دس دن، یہ حسین کا غم، یہ عبادت خدا ہے، بلکہ عبادتوں کی اجرت ہے۔ یہ جو اتنا بڑا مجمع جمع ہوا ہے، کیوں جمع ہوا ہے؟ آج پہلی محرم ہے۔ آج سے محرم شروع ہو گیا

ہے۔ محرم کیا ہے؟ یہ وہ مہینہ ہے جس میں حسینؑ کر بلا میں تین دن کے بھوکے پیاسے شہید کر دیئے گئے۔ اللہ اللہ ہم رونے آتے ہیں، ہم غم منانے آتے ہیں۔ یہ ظاہر داری ہے نہ سماج کا ایک رکن ہے، نہ یہ ہماری عادت ہے۔ بلکہ یہ اجر رسالت ہے اور اسی لیے محبت کی دلیل دے رہا ہوں سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے روز عاشور فرمایا تھا کہ ”نہ سنے گا میرا دوست میرا ذکر مگر یہ کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔“ یعنی حسینؑ نے دوست کی علامت بتائی ہے رونا۔ حسینؑ ابن علیؑ نے چاہنے والوں کی علامت بتائی ہے اپنے غم میں گریہ کرنا اور سبب کیا فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں ”میں رلا رلا کے قتل کیا گیا۔“ یعنی ایک قتل تو یہ ہوتا ہے کہ دشمن آئے اور آنے کے بعد انہوں نے کسی کو قتل کر دیا اور ایک یہ کہ رلا رلا کے قتل کیا۔ تو عاشور کے دن حسینؑ نے یہ پیغام بھیجا تھا کہ ”دیکھو! جب بھی ٹھنڈا پانی پینا، تو میری پیاس کو یاد کر لینا۔“ تو یہ محرم کس لیے آتا ہے؟ جیسے ماہ صیام کا مہینہ آتا ہے تو یہ پتہ چل جاتا ہے کتنے روزے دار ہیں اور کتنے روزے دار نہیں ہیں۔ اسی طرح سے محرم آکے بتا دیتا ہے کتنے اجر رسالت ادا کرنے والے ہیں اور کون اجر رسالت ادا نہیں کرتے ہیں۔ اور حضور یہ غم، فطری غم ہے۔ زبردستی کسی کو کوئی رلا نہیں سکتا، زبردستی کسی کے کوئی آنسو نکال نہیں سکتا۔ یہ حسینؑ کی محبت ہے جو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور محبت کبھی یکطرفہ نہیں ہوتی۔ محبت ہمیشہ دو طرفہ ہوتی ہے یعنی دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ ہمیں اگر حسینؑ سے محبت ہے تو حسینؑ کو بھی ہم سے اتنی محبت ہے کہ وہ ان ایام میں کر بلا چھوڑ دیتے ہیں، عزراخانہ میں آجاتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں آکے مہمان ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ بات ثابت ہے کہ مولا ہر اس عزراخانے میں پہنچ جاتے ہیں جو ان کے نام پر سجایا جاتا ہے۔ اسی لیے ہم احترام کرتے ہیں۔

آج محرم کی پہلی تاریخ ہو گئی۔ حسینؑ مدینے سے روانہ ہو رہے تھے تو مدینہ پر ادا اسی چھا گئی تھی۔ مدینہ دیران ہو رہا تھا۔ راوی کہتا ہے میں اسی دن مدینے میں وارد ہوا تھا۔ میں نے دیکھا مدینے میں ایک ہچل چلی ہوئی ہے۔ عورتیں گھروں سے نکل کر جا رہی ہیں۔ مرد گھروں سے نکل کر جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا آج کیا بات ہے کہ کوئی اپنے گھر میں نہیں ہے۔ تو لوگوں نے کہا تمہیں نہیں پتہ، آج نبیؐ کا نواسہ مدینہ چھوڑ رہا ہے۔ قافلہ

دوسری مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل لا اسئلكم عليه اجرا" الا المودة فی القربی

برادران ملت!

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرما رہا ہے کہ ”میرے رسول! آپ کہہ دیجئے ان لوگوں سے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقرباء ہیں ان سے مودت رکھو۔“

قرآن مجید کی یہ مشہور و معروف آیت ہے جسے ”محبت اہل بیت“ کے عنوان پر مجلس پڑھنے کے لیے سرنامہ سخن قرار دیا ہے۔ کل میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ خداوند عالم نے اجر رسالت میں پیغمبر کے ذریعے اہل بیت کی اقرباء کی محبت اور مودت طلب فرمائی ہے۔ اور یہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ قرآن مجید کے ہر حکم پر عمل کرے۔ میں اس بات کو برابر اس لیے دہراتا رہتا ہوں کہ ایک تصور ذہنوں میں یہ قائم ہو گیا ہے کہ جب قیامت کے دن میزان پر اعمال تولے جائیں گے اور حسانات اور سینئات کا مقابلہ اور موازنہ کیا جائے گا تو اگر نیک اعمال زیادہ ہوں گے تو نجات ہوگی، جنت ملے گی اور اگر بد اعمال زیادہ ہوں گے تو جہنم نصیب ہوگا یعنی خدا فیصلہ کی اور

تیار ہو رہا ہے۔ کتا ہے کہ میں محلہ بنی ہاشم میں پہنچا۔ کثرت سے ہجوم تھا۔ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے اور میں نے دیکھا کہ ابوالفضل العباس آگے بڑھے۔ انہوں نے قاتلین نصب کی اور نائقے اندر لے گئے۔ ناقوں پر بیہال سوار ہونے لگیں۔ اللہ اللہ عجب منظر تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ قافلہ روانہ ہو رہا تھا اور بیہال ناقوں پر سوار ہو رہی تھیں تو سب جانے کو تیار تھے مگر وہ نومولود وہ بچہ جس کی ولادت ابھی ہوئی تھی وہ جانے پر تیار نہیں تھا۔ کون؟ آپ سمجھ گئے۔ شہزادہ علی اصغر۔ کون علی اصغر؟ جن سے آج کر بلا کے واقعے کو اتنی عظمت ہے کہ دشمن بھی سنتا ہے تو آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں۔ دوست کا کیا حال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فاطمہ صغرا نے علی اصغر کو اپنی گود میں لے لیا اور ماں سے کہا۔ ماں آپ جائیے اس کو چھوڑے جائیے، یہی تو میرے دل بہلنے کا سبب ہوگا۔ بھیا علی اکبر جارہے ہیں، بھیا قاسم جارہے ہیں، ارے پورا گھر جارہا ہے۔ میں اکیلے کیسے بسر کروں گی۔ لہذا میں اپنے بھائی کی خدمت کوں گی۔ اس کا جھولا جھلاؤں گی۔ اسی سے مجھے تسلی رہے گی۔ جب جناب زینب کو یہ معلوم ہوا تو اک مرتبہ آئیں۔ دروازے پر آواز دی۔ بھیا حسین ذرا گھر میں آجائیے۔ حسین تشریف لائے۔ کہا، بن کیا بات ہے۔ کہا، سب چل رہے ہیں مگر علی اصغر، فاطمہ صغرا کی گود سے نہیں آتے۔ بھیا ماں نے بلایا مگر نہ آئے۔ حسین، فاطمہ صغرا کے قریب آئے۔ علی اصغر کو لینا چاہا مگر بچے نے آنے سے انکار کر دیا۔ امام حسین نے بچے کے کان میں کچھ کہا تو بچہ ہلک کر باپ کی گود میں آگیا۔ خدا جانے حسین نے علی اصغر کے کان میں کیا کیا مگر مقاتل بیان کرتے ہیں کہ حسین نے علی اصغر کے کان میں کہا۔ بیٹا، تمہارا نام بھی محضرتا میں شامل ہے۔ شہداء میں تمہارا نام بھی شامل ہے۔ ارے قافلہ روانہ ہو گیا اور فاطمہ صغرا مدینے میں اکیلی رہ گئی۔



زیادتی پر کرے گا۔ اگر نیکیاں زیادہ ہیں تو جنت مل جائے گی۔ اگر گناہ زیادہ ہیں تو انسان کو جہنم بھیج دیا جائے گا۔

لہذا زیادہ سے زیادہ کوشش اس بات کی کرنا چاہیے کہ ہم نیکیاں زیادہ کریں یعنی اگر ہم سے گناہ سرزد ہو بھی جاتے ہیں تو اگر اس کے مقابلے میں ہم نیکیاں زیادہ کر لیتے ہیں تو امکان ہے جنت میں جانے کا۔ یہ تصور جو اعمال کے سلسلے میں ہے، صحیح ہے، بمطابق قرآن مجید ہے، مگر اس کا تطابق (Application) عقیدے پر نہیں ہو سکتا۔ عام طور سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ ہے کہ نیکیاں زیادہ ہوں گی۔ زیادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی برائی نہ ہو۔ برائی ہو بھی تو اگر نیکیاں زیادہ ہیں جنت مل جائے گی یعنی ۵۱ فیصد پر جنت ملے گی۔ تو اگر ۴۹ فیصد بھی گناہ ہیں تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے لیکن یہ کہ گناہ زیادہ نہیں ہونا چاہئیں۔ ۵۱ فیصد گناہ نہیں ہونا چاہئیں۔ ۴۹ فیصد گناہ ہوں اور ۵۱ فیصد نیکیاں ہوں تو جنت تو مل ہی جائے گی۔ تو اب اس کا تطابق لوگوں نے عقیدے پر کر لیا کہ اسلام میں اگر ۱۰۰ چیزوں پر عقیدہ رکھنے کو کہا گیا ہے تو اس میں بھی اگر ۵۱ فیصد عقیدہ صحیح ہے تو ۴۹ فیصد اگر خراب بھی ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ عمل ۵۱ فیصد ہے اور عقیدے میں ۱۰۰ فیصد ہے۔ صلوٰۃ

اور اس لیے ہے کہ عقیدہ کہتے ہیں دل سے ایمان رکھنے کو، زبان سے اقرار کرنے کو اور عمل کہتے ہیں احکام الہی پر چلنے کو۔ تو چونکہ احکام الہی پر چلنا دشوار نہیں ہے تو آسان بھی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ۵۱ فیصد کا مار جن دے دیا لیکن عقیدے میں تو کوئی مزاحمت نہیں ہے، کوئی دشواری نہیں ہے، عقیدے اسلام کے عقل کے خلاف نہیں ہیں، عقیدے اسلام کے حقائق اور حقیقت کے خلاف نہیں ہیں، عقیدے اسلام کی سچائی کے خلاف نہیں ہیں لہذا اس سے راضی کرنے نہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ لہذا ۱۰۰ فیصد عقیدہ ہونا چاہیے، ہر اس چیز پر یقین کامل ہونا چاہیے جس کا ذکر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ تو اس بنیاد پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر قرآن مجید میں ۲۶۶۰ آیتیں ہیں تو اگر ہم نے ۳۳۳۱ آیتوں پر عمل کر لیا تو جنت تو مل ہی جائے گی۔ ایسا نہیں ہے۔ آیتوں میں ۱۰۰ فیصد ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ سے لے کر ”والناس“ کی ”س“ تک ”ب“ سے ”س“ تک۔ بس ”ب“ سے قرآن شروع ہے ”س“ پر ختم

ہے۔ اب اس میں کسی کا بس نہیں چل سکتا۔ بس اسلام وہی ہے جو ”ب“ سے شروع ہے ”س“ پر ختم ہے۔ اس پورے قرآن پر یقین رکھنا اور عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ اسی لیے تصور یہ پیدا ہوا کہ ”محبت اہل بیت“ اچھی چیز ہے، آل محمد سے محبت اچھی بات ہے، قرآن میں حکم بھی ہے، اجر رسالت بھی ہے مگر اگر ہم نماز کے پابند ہیں، روزے کے پابند ہیں، حج بجالائے ہیں، زکوٰۃ ادا کی ہے، جہاد میں شہید ہوئے ہیں، احکام الہی پر ہم نے عمل کیا ہے، نیکی سے زندگی بسر کی ہے، غریاء و فہراء اور مساکین کی مدد کی ہے، ہمسائے کے ساتھ نیکی کی ہے، زوجہ اور شوہر کے حقوق ادا کیے ہیں، باپ کا حق ادا کیا ہے، ہماری زبان سے اور عمل سے کسی کو اذیت نہیں پہنچی ہے، تو ہم مکمل مسلمان ہیں۔ اگر ایک اہل بیت سے محبت نہیں بھی ہے تو کیا حرج کی بات ہے۔ اس لیے کہ اکثریت پر تو ہم نے عمل کیا ہے، خالی ایک چیز چھوڑی ہے۔ اس کو ایک چیز نہ سمجھیں اس لیے اس نے اسے نماز، روزے، زکوٰۃ اور حج کی طرح واجب نہیں کیا بلکہ اجر رسالت میں مانگ کے ہر چیز کے برابر قرار دے دیا کہ یہ تمہارے رسول کی اجرت ہے۔ کس بات کی اجرت ہے؟ تم نماز پڑھ رہے ہو، تو جو تم نماز پڑھتے ہو یہ تم کہاں سے لائے ہو؟ تیرے رسول نے بتائی ہے۔ تو اجرت دو۔ تم روزہ رکھ رہے ہو، تو اجرت دو۔ زکوٰۃ ادا کر رہے ہو، تو اجرت دو یعنی جو تم کو نماز اور روزے کا بتانے والا ہے اس کو محنت کرنی پڑی ہے، اس کو مشقت کرنی پڑی ہے، اس کی جو مزدوری ہوئی ہے، اس کی اجرت ادا کرو۔ کیا اجرت دیں؟ ان کے بچوں سے، ان کے قرابت داروں سے محبت رکھو۔ تو اب جب محبت کے ذریعے اجرت مانگ لی تو اب نہ نماز پڑھنے کا کوئی فائدہ ہے، نہ روزے رکھنے کا کوئی فائدہ ہے، نہ حج کا کوئی فائدہ ہے، نہ کوئی زکوٰۃ کا فائدہ ہے۔ جب تک کے اجرت نہ ادا کر دی جائے تو اس واجب کو اس طرح سے واجب کیا کہ اس واجب کے بغیر کسی واجب کی جزاء مانگنے کا مسلمان مستحق نہ رہے۔ صلوٰۃ

یہ ہے اجرت۔ تو جب اسے اجرت میں طلب کیا ہے کہ یہ ہے اجر۔ اکثر لوگ یہ بات پوچھتے ہیں۔ میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ مجھے پاکستان کا حال نہیں معلوم ہے۔ میں اپنے ہندوستان ہی کا حال پڑھتا رہتا ہوں۔ بچت بھی اسی میں ہے۔ لوگوں نے یہ بات پوچھی کہ صاحب ہم نے نماز پڑھی، ہم نے روزہ رکھا، ہم نے حج کیا، ہم نے زکوٰۃ دی، ہم

ہے، کالا نہیں ہوتا۔ تو کہا وہاٹ منی۔ یہ وہاٹ کیا ہے؟ بلیک کیا ہے؟ روپیہ روپیہ ہے۔ تو کہا آپ سمجھ نہیں۔ بلیک اینڈ وہاٹ کو۔ جس پر ٹیکس ادا ہے وہ واٹ ہے اور جس پر ٹیکس ادا نہیں ہے وہ بلیک ہے۔ اچھا ہے تو روپیہ، مگر بلیک، یعنی کالی، وہاٹ یعنی سفید، کیوں کہا؟ جس پر ٹیکس ادا کر دیا ہے وہ وہاٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے وہاٹ بن سکتا ہے بلیک بھی۔ توجہ فرمائی آپ نے۔ اگر ادا کر دیا جائے ٹیکس اور اگر ادا نہیں کیا گیا ٹیکس تو وہاٹ بلیک کہلائے گا، بلیک ہو گا نہیں، کہلائے گا۔ اس لیے کہ ٹیکس ادا نہیں ہے۔ توجہ یہ ہزار روپے کا جو نوٹ کینسل ہوا ہے اس کے پیسے بینک دے گا لیکن آپ کو ثابت کرنا ہو گا کہ یہ وہاٹ ہے۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ اجر رسالت کیا چیز ہے۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے اپنے رسول کی محنتوں کا ٹیکس ہے۔ جو مسلمان ٹیکس ادا کر دے گا، اس کی نماز وہاٹ، اس کا روزہ وہاٹ، اس کا حج وہاٹ، اس کی زکوٰۃ وہاٹ۔ اور جو اجر رسالت میں محبت اہل بیت نہیں رکھے گا تو نماز کینسل نہیں ہے۔ نماز ہو گی مگر بلیک۔ صلوٰۃ

اب آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ تو میں نے دیکھا کہ لوگ بینک جا رہے ہیں اور ثابت کر رہے ہیں کہ ہزار کا نوٹ وہاٹ ہے۔ اور پیسے لے کر آرہے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا ہمارے پاس تو گڈیاں رکھی ہیں۔ جائے آپ بھی لے آئیے۔ کہا جا نہیں سکتے۔ یعنی نوٹ رکھے ہیں مگر بینک میں نہیں جاسکتے۔ کیوں؟ بیکار ہیں۔ کیوں بیکار ہیں؟ حساب نہیں ہے۔ حساب نہیں ہے، کیا مطلب؟ کہا ٹیکس نہیں دیا ہے۔ تو رکھے ہوئے ہیں، مگر جب معلوم ہو گیا کہ بلیک منظور نہیں ہو رہا ہے، تو رکھے ہی رہ گئے، ہمت نہیں لے جانے کی۔ تو جزا کا سوال تو جب ہے جب اللہ کے سامنے پیش کرنے کی ہمت ہو۔ جب قیامت کے دن معلوم ہو گا کہ جس نے اجر رسالت ادا نہیں کیا اس کی نماز منظور نہیں ہو گی۔ عمل کیے پڑے ہیں لیکن جزا کے لیے پیش نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ نماز ہے مگر وہاٹ نہیں ہے، بلیک ہے۔ تو جب عمل بلیک ہو سکتا ہے تو عقیدہ بھی بلیک ہو سکتا ہے یعنی جب اجر رسالت ”محبت اہل بیت“ کے ساتھ اسلام ہو گا تو وہاٹ اسلام ہو گا ورنہ بلیک اسلام ہو گا۔ تو لے جا کے بینک کو دے دینے میں کیا حرج ہے۔ کہا جناب جائیں گے تو پکڑے جائیں گے۔ ارے کیوں پکڑے جائیں گے؟ کہ یہ لائے کہاں سے۔ تو ویسے ہی جو دنیا میں

نے جہاد کیا۔ آپ کہتے ہیں اگر اہل بیت سے محبت نہیں، اجرت نہیں ادا کی، تو کچھ قبول نہیں ہے۔ یہ آخر اجرت دینا کیوں ضروری ہے۔ کیوں قبولیت کا سبب ہے۔ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو میں نے ان کو سمجھانے کے لیے کہا کہ دیکھئے جو قانون بناتا ہے اور اس قانون پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ اس عمل کے لیے، عمل درآمد کے لیے کچھ اجرت بھی رکھتا ہے۔ جیسے ہندوستان گورنمنٹ ہے، انڈیا کا قانون ہے تو دوسرے قانون ہیں، کینی لاء ہے، سول پروسیجر کورٹ ہے، کرمینل پروسیجر کورٹ ہے، ضابطہ فوجداری ہے، ضابطہ دیوانی ہے۔ ہم انڈیا کے شہری ہیں تو ہمیں عمل کرنا ہے لیکن TAX بھی ہے۔ ٹیکس ادا کرو۔ روڈ ٹیکس دو اگر گاڑی چلاتے ہو، دہلتھ ٹیکس دو، موت کا ٹیکس دو، موت تک کا ٹیکس ہے۔ اسلام نے تو خالی حیات پر رکھا ہے۔ صلوٰۃ موت کا ٹیکس بھی ہے ہمارے یہاں۔ یہ ٹیکس ہے اور وہ ٹیکس ہے تو لوگ ادا کرتے ہیں اور بہت سے لوگ ٹیکس نہیں دیتے۔ یہاں تو سب مسلمان ہیں۔ دیتے ہی ہوں گے ٹیکس۔ میں اپنے ملک کی بات کر رہا ہوں۔ بہت سے لوگ ہیں جو ٹیکس نہیں دیتے۔ تو ایک مرتبہ بسنٹی میں، میں مجلس پڑھ رہا تھا کہ جیسے ہی مجلس پڑھ کے اترا تو لوگوں نے کہا آپ کو کچھ خبر ہے۔ کیا خبر ہے؟ کہا ابھی ریڈیو پر خبر آئی ہے کہ ایک ہزار روپے کا نوٹ کینسل ہو گیا۔ تو میں نے کہا ہو جانے دیجئے۔ میرے پاس تو تھا نہیں کوئی ہزار روپے کا نوٹ۔ میری کیا پریشانی تھی۔ تو کہا صاحب بڑا غضب ہو گیا۔ لاکھوں کا نقصان ہو گیا۔ تو میری بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ریزرو بینک آف انڈیا نے نوٹ شائع کیا، چھاپا اور اس پر گورنر نے لکھا ”حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا“ اور پھر گورنمنٹ نے ایک میٹنگ کر کے اسے کینسل کر دیا۔ تو اپنے ہی چھاپے کو کینسل کیا۔ تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ پھر کس کو یقین رہ جائے گا ریزرو بینک پر۔ آج ہزار کا ہوا، کل ایک روپے کا کینسل ہو جائے گا۔ پھر بعد میں لوگوں سے معلوم ہوا کہ کینسل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک ہزار روپے کا نوٹ چلے گا ہی نہیں بلکہ بینک بدلے گا، ہزار روپے دے گا۔ مگر کب دے گا؟ جب آپ یہ بتا دیں کہ یہ ہزار کا جو نوٹ ہے اس کا ٹیکس آپ نے دے دیا ہے۔ میں نے کہا کہ بھئی یہ کیا بات ہوئی۔ تو کہا کینسل کرنے کے لیے کینسل نہیں کیا ہے بلکہ بلیک منی پر ٹیکس لینے کے لیے کیا ہے۔ میں نے کہا بلیک منی روپیہ تو سفید ہی ہوتا

”محبت اہل بیت“ نہیں رکھے گا وہ صرف یہ نہیں کہ نماز کی جزا نہیں پائے گا بلکہ حساب ہوگا تم نے پڑھی کیسے، روزہ رکھا کیسے، حج کو گئے کیوں۔ صلوٰۃ

تم کو کیا حق تھا جب تم نے پیغمبر اسلام کی اجرت کو ادا نہیں کیا تھا۔ آپ انصاف سے بتائیں میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ اگر آپ نے میرے ہاں دن بھر کوئی کام کیا۔ آپ وکیل ہیں۔ میرے اوپر کوئی مقدمہ چل گیا۔ آپ نے مقدمہ میں میرے لیے جا کے ڈیفنس کیا۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔ میں نے آپ کو نبض دکھائی۔ طبیعت خراب ہوئی۔ آپ نے نسخہ لکھا، دوا دے دی۔ اپنے مطب سے۔ جو بھی آپ کا کاروبار ہے۔ آپ دکاندار ہیں۔ میں آپ کے یہاں سے کپڑا لے آیا۔ آپ کچھ بھی کام کرتے ہیں میں نے آپ سے لے لیا اور اس کے بعد میں نے آپ کو پیسے نہیں دیئے۔ ڈاکٹر ہیں آپ کو فیس نہیں دی، وکیل ہیں آپ کو فیس نہیں دی، انجینئرز ہیں آپ کو فیس نہیں دی، تو آپ مجھے کیا کہیں گے۔ آپ کہیں گے خود جماعت سے، محفل مرتضیٰ کی جماعت سے کہ اے بھی آپ ان کو کبھی مجلس نہ پڑھوائیے گا۔ یہ تو مولوی بڑا بے ایمان آدمی ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مولوی بھی کہہ رہے ہیں اور بے ایمان بھی کہہ رہے ہیں۔ تو کہا صاحب کیا بات ہے مجلس میں تو انہوں نے کوئی بے ایمانی کی بات پڑھی نہیں۔ ہم نے کل پوری مجلس سنی ایمان پر پڑھی بے ایمانی پر نہیں پڑھی۔ پڑھے گا کون بے ایمانی پر۔ تو کہا صاحب ہمارے یہاں سے یہ چیز لے آئے اور پیسے نہیں دیئے اور ابھی جب منبر پر جانے سے پہلے میں نے کہا پیسے؟ تو کہتے ہیں کیسے؟ یہ بے ایمان ہیں۔ کیوں حضور اگر میں آپ کی اجرت نہ دوں تو مولوی ہو کے آپ مجھے بے ایمان کہیں گے اور جو رسول اللہ کی اجرت نہ دے تو اسے اللہ ایمان دار کہے گا۔ صلوٰۃ

اب صرف فکر کی بات ہے تو محبت کی۔ کس کی محبت۔ اہل بیت کی محبت اجرت کے طور پر مانگی گئی۔ تو سوال یہی ہے کہ اللہ نے اجرت مانگی کیوں؟ تو اللہ کے گاہم نے تو نہیں مانگی۔ قصہ ہمارا نہیں ہے، تم نے قصہ کیا کہ نبی اجرت لے لے، تم جمع کر کے لائے، تم روپیہ لائے، تم کپڑے لائے، تم جواہرات لائے، اور تم نے لا کے میرے نبی کی نبوت کو ہیرے میں تولنا چاہا، سونے میں تولنا چاہا، چاندی میں تولنا چاہا، جبکہ تم نے نہ دیکھا کہ یہ میرا نبی کون ہے۔ جو سونے کا لالچی نہیں ہے۔ جس کے اشارے پر لوہ ابو قیس

سونے کا ہو جائے، جس کے پوتے کے ہاتھ کا دھون جواہرات بن جائے، جس کا اشارہ کائنات کو تبدیل کر کے رکھ دے، اس نے کیا اتنی محنت صرف تمہارے اس مال کے لیے کی؟ تو ٹھیک ہے، نہیں منظور تھا تو واپس کر دیتا، لے جاؤ ہم کو نہیں چاہیے۔ نہیں کہا کہ اب آؤ گے تو جاؤ گے کہاں۔ آئے ہو اجرت دینے، یہ اجرت نہیں ہے، اجرت ہے ان کے اقرباء کی محبت، ان کی مودت، ان سے عقیدت۔ یہ اجرت دیتے رہو۔ تو جو اجرت کا قصد مسلمانوں نے پیش کیا تھا اللہ کے رسول کے سامنے تو مقصد منظور کر لیا اللہ نے۔

دیکھیے توجہ چاہ رہا ہوں۔ بہت چھوٹی بات ہے۔ مقصد منظور کر لیا یعنی اجرت دینا چاہتے ہو تو ہم انکار نہیں کرتے۔ اجرت لے لیں گے مگر اجرت دیتے ہو تو اجرت دو۔ اجرت کسے کہتے ہیں؟ جو چیز برابر کی ہو، وہ اجرت بنے گی۔ کتر چیز اجرت نہیں کہلاتی، برابر کی چیز اجرت کہلاتی ہے۔ میرے رسول نے جو اسلام پیش کیا ہے وہ ہمارا اس کے برابر نہیں ہے، سونا اس کے برابر نہیں ہے، یہ پارچے اور یہ کپڑے یہ برابر نہیں ہے۔ اس کا برابر ان کے بچوں کی محبت ہے۔ تو ایک چیز تو اس آیت سے ثابت ہو گئی کہ جو وزن پورے اسلام کا ہے وہ وزن اہل بیت کی محبت کا ہے۔ تو اسلام میں بیٹنس نہیں رہ سکتا جب تک ایک ہاتھ میں اسلام نہ ہو اور دوسرے ہاتھ میں اجرت نہ ہو کیونکہ وہ اس کے برابر ہے۔ جب اس کے برابر ہے تو طلب کیا کہ اقرباء کی مودت اور اقرباء کی محبت۔ جب مانگ لیا تو بحث کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ نے مانگ لیا بندے کو ادا کرنا ہے۔ اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب، نماز سمجھ میں آئی، روزہ سمجھ میں آیا، حج سمجھ میں آیا، زکوٰۃ سمجھ میں آئی، فہم سمجھ میں آیا، جہاد سمجھ میں آیا، یہ محبت سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر محبت سمجھ میں نہیں آئی تو پھر دلیل ہے کہ نماز بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ ہم کو غلط فہمی ہے کہ ہم نماز سمجھتے ہیں اور محبت نہیں سمجھتے۔ محبت کہتے کسے ہیں؟ تو آپ ذرا بتائیے کہ لفظ محبت حالانکہ قرآن میں لفظ مودت ہے۔ مودت اور محبت میں کیا فرق ہے؟ کوئی فرق نہیں ہے۔ درجوں کا فرق ہے۔ صلوٰۃ

محبت کے درجے ہیں۔ محبت کے مرحلے ہیں جس میں پہلا درجہ محبت کا جو ہے، اسے محبت کہتے ہیں۔ کسی کی طرف کھنچاؤ محسوس کرنے کو، کشش کو۔ میں نے آپ کو دیکھا، میں نے کہا مجھے آپ سے بڑی محبت ہو گئی۔ تو یہ دیکھتے ہی اچانک کیسے ہو گئی۔ تو کہا کشش،

اس نے کہا بھی یہ کیسے چاہنے والے ہیں۔ ایک لیلیٰ کا چاہنے والا تو دہلا ہو گیا۔ یہ میری محبت میں موٹے ہو گئے۔ تو مقصد یہ ہے کہ عشق کی منزل کو واضح کیا میں نے کہ عشق کی منزل یہ ہے کہ پھر کچھ تصویریں باقی نہیں رہے سوائے معشوق کے اور اس کے بعد آخری مرحلہ ہے محبت کا، مودت۔ جو قرآن نے صرف کیا ہے۔ مودت کون سا مرحلہ ہے جہاں چاہنے والے کو اتنی محبت ہوتی ہے کہ وہ مرعوب ہو جاتا ہے یعنی محبوب سے ڈرنے لگتا ہے، پھر اس کی کوئی تمنا، کوئی خواہش اپنی رہتی ہی نہیں، وہ صرف یہ دیکھا کرتا ہے کہ جسے میں چاہ رہا ہوں وہ چاہتا کیا ہے۔ وہ ہے مودت۔ وہ تو یہ ہم اردو میں ترجمے کے لیے محبت کہہ دیتے ہیں۔ محبت اجر رسالت نہیں ہے۔ مودت اجر رسالت ہے۔ صلوٰۃ

مودت اجر رسالت ہے۔ اجرت میں محبت نہیں مانگی، اجرت میں انس نہیں مانگا، اجرت میں شغف نہیں مانگا، اجرت میں عشق نہیں مانگا ہے، اجرت میں مودت مانگی ہے۔ مودت، محبت کا وہ درجہ ہے جہاں محبوب کی مرضی کے خلاف کوئی عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ بس خالی یہ دیکھ رہے ہیں چاہتے کیا ہیں، مرضی کیا ہے۔ تو محبت اہل بیت کا مطلب یہ ہے کہ چاہنے والا ہر عمل سے پہلے یہ سوچے کہ جو ایکشن ہم لینے جارہے ہیں، جو قدم ہم اٹھانے جارہے ہیں، جو کام ہم کرنے جارہے ہیں، یہ اہل بیت کی مرضی کے مطابق ہے کہ نہیں۔ اب اہل بیت کی مرضی کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ

”تم تو وہ چاہتے ہی نہیں جو خدا نہیں چاہتا۔“

تو ان کی مودت میں اطاعت خدا ہو جائے گی اور اطاعت خدا، اجر رسالت بن جائے گی۔ لیکن اگر اطاعت کی منزل بغیر مودت کے پیدا ہو سکتی تو خدا مودت کو کیوں اجر رسالت قرار دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اجرت بنا کے جس اسلام کا کلہ تم نے پڑھا ہے اسی اسلام پر ہم تمہیں دنیا سے اٹھانا چاہتے ہیں اور وہ ممکن نہیں ہے۔ بس تک ایسوں کے چاہنے والے نہ بنو، جو ہمارے چاہنے والے ہیں۔ صلوٰۃ

ایک منزل دوسری منزل جو کل میں نے بحث آپ کے سامنے اٹھائی تھی اس کا ایک رخ آج آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ہم جو عالم اسلام میں یعنی بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو کسی خاص طبقے سے ایک لگاؤ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ کسی خاص معاشرے

یعنی ایک طریقے کی الیکٹرو میگنیٹزم، دل کھینچے لگا، اس کو کہتے ہیں محبت، یہ پہلی منزل ہے۔ اور عربی زبان میں محبت سے زیادہ جو چیز ہے، دوسرا درجہ جو ہے، وہ ہے انس۔ انس کا کیا مطلب ہے کہ خالی دیکھ کے آپ اچھے نہیں لگے، خالی آپ کی بات پسند نہیں آئی، بلکہ انس ہو گیا۔ یعنی بار بار دیکھنے کو جی چاہنے لگا۔ جہاں ملے رک کے پانچ منٹ بات کرنے کو جی چاہنے لگا۔ تو محبت کی دوسری منزل ہے انس اور انس کے بعد تیسری منزل جو ہے وہ ہے شغف۔ شغف کا مطلب یہ ہے کہ اتنی محبت ہو جائے اٹھے بیٹھے، سوتے جاگتے، بس آپ ہی کا تصور چھایا ہوا ہے۔ شغف ہو گیا۔ گھر بند ہے تو بس آپ ہی کا در پسند ہے تو آپ ہی کا لباس پسند ہے تو آپ ہی کا زبان پسند ہے تو آپ ہی کی اور ہر ہر بات پسند ہے۔ آپ بچے میرے پاس مجلس کا وعدہ لینے۔ میں نے آپ کا ذکر چھڑ دیا۔ تو کما ان کو تو کوئی شغف ہی نہیں، سوائے ان کے ذکر کے۔ یہ ہے شغف کی منزل۔

شغف سے ایک درجہ اور بلند ہوتا ہے۔ اس کا نام ہے عشق۔ عشق محبت کا وہ درجہ ہے اور عشق محبت کی وہ ڈگری ہے کہ جہاں کوئی تصور ہی باقی نہیں رہتا سوائے اس کے جس سے محبت ہو گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عشق حقیقی سمجھنا اور سمجھنا مشکل ہے۔ مگر عشق مجازی تو بھی سمجھتے ہیں۔ تو جب مخلوق کے عشق میں لوگ دیوانے ہو جاتے ہیں تو خالق کا عشق۔ میرے ایک ماسٹر تھے۔ انہوں نے ایک عجیب و غریب بات کہی۔ میں صرف سمجھانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ آپ اور کچھ نہ سمجھیں چونکہ جو بچے ہیں، بزرگ ہیں، تو سب جانتے ہی ہیں۔ ان کے لیے کہ قیامت کے دن کا قصہ ہے۔ حدیث نہیں ہے آیت نہیں ہے، روایت نہیں ہے کہ آپ مجھ سے منبر سے اتر کر حوالہ پوچھیں۔ بہت سی باتیں سمجھانے کے لیے بھی کہی جاتی ہیں کہ قیامت میں انسانوں کا مجمع تھا کہ ایک شخص چیخا ہوا نکلا۔ تو اللہ نے پوچھا فرشتوں سے کہ یہ کون ہے؟ تو کہا یہ مجھوں ہے۔ کون ہے یہ؟ کہا اس کو لیلیٰ سے عشق ہو گیا تھا۔ تو محشر کے میدان میں بھی یہ لیلیٰ کو ڈھونڈ رہا ہے اور اس کے عشق میں چلا رہا ہے۔ تو اللہ نے دیکھا کہ ایک شخص نہایت دہلا پتلا، سوکھا، سما، بال بڑھے ہوئے، عجب حال اور لیلیٰ لیلیٰ کہتا ہوا چلا جا رہا ہے تو کہا کہ یہ کیوں دہلا ہو گیا؟ کہا لیلیٰ کے عشق میں! تھوڑی دیر کے بعد علماء پیش ہوئے، پوپ پیش ہوئے، پنڈت پیش ہوئے۔ خدا نے کہا یہ کون ہیں؟ کہا معبود یہ ترے چاہنے والے ہیں۔

ہے یہ بتاتا ہے کہ مسلم ہے کہ نہیں ہے۔ یعنی کچھ چیزیں واضح ہیں اسلام کی کہ جن پر جو عمل نہ کرے، نہ وہ شیعہ ہے، نہ سنی ہے، نہ حنفی، نہ شافعی ہے، نہ حنبلی ہے، نہ مالکی ہے۔ کیوں؟ قرآن میں صاف حکم موجود ہے تو جس چیز کا قرآن میں صاف حکم موجود ہو اس میں فرقے کی بحث نہیں ہوتی، اسلام کی بحث ہوتی ہے۔ تو محبت اہل بیت کا بھی صاف حکم موجود ہے۔ ذرا بھی شک نہیں ہے اس میں کیونکہ کلی آیت ہے۔

قل لا اسئلكم عليه اجرا" الا المودة فی القربی

”میرے حبیب! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے سوائے اس کے کہ جو ہمارے قربت دار ہیں ان سے محبت رکھو۔“
تو جب یہ حکم ہے خدا کا تو اس میں شیعہ سنی کی کیا بحث ہے۔ اس میں تو خدا کا حکم ماننے والے اور نہ ماننے والے کی بحث ہے۔ تو کما مگر سب تو محبت نہیں کرتے۔ تو بھی سب نماز بھی نہیں پڑھتے، سب روزہ بھی نہیں رکھتے، سب حج بھی نہیں کرتے، سب زکوٰۃ بھی نہیں دیتے، تو سب محبت بھی نہیں کرتے، لیکن جو چیز آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں وہ یہ کہ کما صاحب محبت کریں یا عبادت کریں؟ تو عبادت کیا ہے؟ اللہ کی اطاعت۔ محبت کیا ہے؟ رسول کے اقرباء سے محبت۔ تو ہم جو فیصلے کرتے ہیں، آپ نے دیکھا ہے دنیا میں ہوتا ہے فلاں آدمی بڑا مومن ہے، بڑا جنتی ہے۔ اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے اپنے لیے فیصلہ کرنے کو کہ تم طے کر کے آؤ کہ جنت جاؤ گے یا جہنم۔ ہم کو اپنے لیے تو ٹائم ہی نہیں ملتا۔ ہمیشہ دوسروں کے لیے ہمارے پاس ٹائم ہے۔ یہ آدمی جنتی ہے، یہ آدمی جہنمی ہے۔ اچھا فلسفہ کیا ہے جنتی اور جہنمی کے طے کرنے کا؟ نیکیاں گنتے ہیں۔ یہ آدمی نے اتنی نیکیاں کی ہیں، یہ جنت ضرور جائے گا۔ اس آدمی نے اتنے گناہ کیے ہیں، یہ جہنم ضرور جائے گا۔

ہم نے ٹوٹ لگالیا، کھلکھول پر لگالیا، کمپیوٹر پر لگالیا۔ آپ کو نہیں کہتا، میں اپنے کو کہتا ہوں۔ آپ میرے دوست ہیں۔ آپ کمپیوٹر پر بیٹھ کر رہے۔ میں نے نیکی کی وہ بیچ کر دی۔ میں نے گناہ کیا، وہ بیچ کر دیا۔ جب میں مر گیا تو مرنے کے دن آپ نے کمپیوٹر سے پوچھا، کتنی نیکی کتنے گناہ؟ اس نے کہہ دیا ظاہر صاحب نے ایک ہزار نیکی کی، دو ہزار گناہ کیے۔ آپ نے کہا گئے جہنم میں۔ تو یہ کمپیوٹر پر نہیں جوڑی جاتی نیکی۔ قرآن سمجھنا

سے، کسی خاص فرقے سے، کسی خاص جنس سے، اس کو اتنا ملا دیا جاتا ہے کہ دوسرے فرقے اور دوسرے جنس کے لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ ہماری بات نہیں ہے۔ یہ ان کی بات ہے۔ اسی میں محبت اہل بیت بھی آتی ہے کیوں کہ شیعہ اثنا عشری بارہ اماموں کے ماننے والے مہمان اہل بیت مشہور ہیں لہذا عام تصور مسلمانوں میں یہ ہے کہ اگر ہم بھی محبت اہل بیت ہوئے، تو کہیں شیعہ نہ ہو جائیں! اس لیے کہ محبت تو شیعہ رکھتے ہیں، ہم تو سنی ہیں، ہم کیسے محبت رکھیں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ شیعہ سنی کا کوئی فرق نہیں ہے محبت میں۔ آپ کہیں گے یہ کیسے؟ تو یہ تجربہ تو آپ کو بھی ہوا ہوگا اور میں بھی دنیا کے شہر شہر گھومتا رہتا ہوں۔ میں نے ایسے اہلسنت دیکھے ہیں جن کو انتہائی محبت اہل بیت پایا اور اب نہ کھوں گا ڈر کے مارے آپ سے ڈروں تو نہ کھوں، لیکن خدا سے ڈر رہا ہوں لہذا کہتا ہوں کہ میں نے ایسے شیعہ دیکھے ہیں کہ ان سے بڑھ کر دشمن اہل بیت نہیں ملتا۔

تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا تعلق کوئی نفرت سے نہیں ہے۔ یہ تو پیار ہے، یہ تو محبت ہے۔ کس کو، کس سے، کب محبت ہو جائے اور کب تک باقی رہے، اس کے لیے فرقے کی قید نہیں ہے۔ ہم نے ایسے ایسے اہلسنت والجماعت میں مہمان اہل بیت دیکھے ہیں کہ جو عشق کی حد تک ہیں اور ایسے شیعہ بھی دیکھے ہیں جو اس بات پر اعتراض کرتے ہیں کہ محبت کیا ہے۔ انہیں کوئی کیا بتائے کہ محبت کیا ہے۔ تو اس میں کوئی فرقہ واریت نہیں ہے۔ یہ تو سب کے لیے ہے۔ جیسے نماز سب کے لیے ہے، کیا اہلسنت حضرات یہ کہتے ہیں کہ چونکہ شیعہ نماز پڑھتے ہیں لہذا ہم نہ پڑھیں گے۔ کیا شیعہ یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ اہلسنت حضرات نماز پڑھتے ہیں لہذا ہم بھی ہم تو نماز نہیں پڑھیں گے۔ تو کیسے ایسا نہ ہو کہ نماز پڑھنے میں سنی ہو جائیں، نماز پڑھنے سے شیعہ ہو جائیں۔ تو کما اس میں شیعہ سنی کی بات نہیں مسلمان کی بات ہے۔ تو جو مخصوص نشان ہے وہ کہیں پر اسلام ہے کہیں پر فرقہ ہے۔ اللہ کو ایک ماننا وضاحت نہیں کرتا کہ آدمی شیعہ ہے کہ سنی ہے، وضاحت کرتا ہے کہ آدمی مسلم ہے کہ کافر ہے۔ ختمی مرتبت کو رسول ماننا وضاحت نہیں کرتا کہ ماننے والا کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے، وضاحت کرتا ہے کہ آدمی مسلم ہے یا کافر۔ بعدہ کا احترام کرنے والا کعبہ کی طرف پیشانی جھکانے والا یہ نہیں بتاتا کہ شیعہ ہے یا سنی

گرام کی ہے؟ روزہ کتنے سو گرام کا ہے؟ حج کا وزن کیا ہے؟ زکوٰۃ کا وزن کیا ہے؟ خیرات کا وزن کیا ہے؟ تو کہا ہم وزن کیا جانیں، اللہ جانتا ہے۔ تو معلوم ہوا اس نے وزن نہیں بتایا اعمال کا۔ چلے میں کہتا ہوں کہ میں جو نماز پڑھتا ہوں اس کا وزن پانچ سو گرام ہے۔ آپ نے کہا میں ایک کلو والی پڑھتا ہوں۔ ارے بھی یہ کیا معاملہ ہے؟ تو کہا آپ نے جلدی جلدی وضو کیا اور نماز پڑھی اور ٹکریں ماریں اور وہ چلے۔ یہ پانچ سو گرام کی ہے اور میں نے قاعدے سے وضو کیا، خضوع و خشوع کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم قرات کے ساتھ تو میں نے پڑھی پندرہ منٹ میں نماز اور آپ نے پڑھی تین منٹ میں۔ تو میرا اور آپ کا وزن برابر تھوڑی ہوگا۔ تو معلوم ہوا کہ عمل کے غلو ص سے بھی وزن بڑھ جاتا ہے۔ جب ہم عمل ہی کو سبک سمجھیں گے، جب ہم ہی ہلکا سمجھ رہے ہیں، تو وزن کہاں سے آئے گا۔ اور جب ہم عمل کو اہمیت دے رہے ہیں تو وزن پیدا ہوگا۔

مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ مولا سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ یعنی گناہان صغیرہ بھی ہیں، کبیرہ بھی ہیں۔ کچھ معصیتیں ہیں جو چھوٹی ہیں اور کچھ معصیتیں ہیں جو بڑی ہیں۔ تو سب سے بڑا گناہ کیا ہے، سب سے بڑا گناہ اکبر کیا ہے؟ تو امامؑ فرماتے ہیں جس گناہ کو تم سب سے ہلکا سمجھو، وہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ کیا فلسفہ ہے، سبحان اللہ، یعنی خدا کے جس جس حکم کو ہم نے اہمیت ہی نہ دی، اس سے بڑھ کے کوئی گناہ نہیں ہے۔ تو اب اس سے دیکھئے کہ صغیرہ کبیرہ کی بحث جاتی رہتی ہے۔ اس طریقے کا امامؑ نے فلسفہ پیش کیا تو اس میں بھی وزن کا سوال ہے۔ اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ وزن ہے کیا؟ ایک کلو گرام ایک طرف رکھا ہے۔ اتنا سا کھڑا، ایک کلو گرام لوہا اور جو روٹی رکھی تو اوپر تک اتنی روٹی اور اتنا سا لوہا۔ تو کہا آپ سمجھے نہیں، روٹی ہلکی ہوتی ہے اور لوہے کا وزن زیادہ ہے۔ یہ وزن کیا ہے؟ ارے بھی یہ کیا چیز ہے کہ کوئی چیز بھاری ہے کوئی چیز ہلکی ہے۔ پتہ ہلکا ہے۔ لکڑی اس سے بھاری ہے۔ لوہا اس سے بھاری ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ تو سائنس دان سے پوچھا بھی یہ وزن کیا ہے؟ کہا آپ کو نہیں معلوم، وزن کچھ نہیں ہے۔ وزن کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر وزن کیا چیز ہے؟ زمین کی جو کشش ہے، جو تباؤ ہے، جو کھپاؤ ہے۔ کیا چیز ہے تباؤ؟ کہا خالق کائنات نے زمین میں جتنی چیزیں پیدا کی ہیں ان سب کی کشش زمین سے رکھی ہے۔ تو جس

بہت مشکل ہے، اسلام سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کلمہ پڑھنا آسان ہے، دین سمجھنا بہت مشکل ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ کیسے لوگوں نے پرستش لگا لیا جب کہ وضاحت سے قرآن میں کہا گیا ہے کہ میزان ہے یعنی اعمال تو لے جائیں گے، قیامت کے دن۔ ایک پلڑے میں نیکیاں رکھی جائیں گی، ایک پلڑے میں گناہ رکھے جائیں گے۔ تو خدا کہہ رہا ہے وزن کروں گا۔ آپ گن رہے ہیں۔ بڑا فرق ہے گننے میں اور وزن کرنے میں۔ آپ نے تو میری زندگی کی نیکیاں گنیں، میری زندگی کے گناہ گنے اور فیصلہ کر دیا۔ خدا کہتا ہے گنتی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کوئی الیکشن تھوڑی ہو رہا ہے کہ ووٹ گنیں۔ ہم تو تویں گے، وزن کریں گے، وزن لیں گے۔ اگر نیکیوں کا وزن زیادہ ہے تو جنت دے دیں گے۔ گناہوں کا وزن زیادہ ہے، تو گننے اور وزن میں کچھ فرق ہے۔ دیکھیے میں مثال دیتا ہوں۔ آپ کے سامنے اسکیل ہے۔ آپ کے سامنے میزان ہے۔ آپ کے سامنے ترازو ہے۔ میں نے ایک کلو گرام کا وزن، ایک کلو گرام کا لوہے کا کھڑا ایک ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا اور رائی کے ۵۰۰ دانے ایک طرف رکھے۔ تو گننے میں وہ ہیں پانچ سو اور ایک کلو گرام کا لوہے کا کھڑا ہے ایک۔ تو یہ ہے ایک، وہ ہیں پانچ سو۔ مگر جو ایک ہے وہ پلڑا زمین سے لگ گیا اور جو پانچ سو ہیں وہ پلڑا اٹھ گیا۔ یہ کیسی گنتی ہے جناب، پانچ سو ہلکے اور ایک کا وزن زیادہ؟ تو کہا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ پانچ سو سے کیا ہوتا ہے۔ رائی کے دانے ہیں۔ ان کا وزن ہی کیا ہے۔ تو معلوم ہوا گنتی نہیں ہوتی۔ جوڑنے میں گنتی میں پانچ سو دانے ہیں، ادھر ایک۔ تو کہا اس کا وزن زیادہ ہے۔ پانچ سو بھی ہیں مگر اس کے برابر نہیں ہیں۔ کیوں نہیں ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں وزن نہیں ہے۔ اس ایک کلوے میں وزن ہے۔ کتنا وزن ہے؟ ایک کلو گرام۔ یہ پانچ سو دانے کتنے ہیں؟ کہا یہ تو ڈھائی سو گرام ہیں۔ تو پھر اگر پانچ سو میرے گناہ ہیں رائی کے دانے اتنے اور ایک نیکی ہے ایک کلو گرام کی تو میں جنتی ہوں کے نہیں اور آپ وہاں گنتی پر جنم بتا رہے تھے۔ تو وہ تو لے گا، جوڑے گا نہیں۔ تو لوگ فیصلہ غلط کرتے ہیں۔ فیصلہ کر ہی نہیں سکتے۔ کیوں؟ جزا تو معلوم ہے سب کو، اعمال کا وزن نہیں معلوم ہے۔

اسلام کے تتر (۷۳) فرقوں کے علماء سے آپ مجھے پوچھ کر بتائیے۔ نماز کتنے سو

کشی زمین سے نہیں ہے تو وہ غبارے کو بھی لے اڑی۔ ایسے ہی جب مسلمانوں میں عداوت اہل بیت کی گیس بھردی جاتی ہے تو وہ مجلسوں سے اڑنے لگتے ہیں، ماتم سے اڑنے لگتے ہیں، بھاگنے لگتے ہیں کیوں کہ جس چیز کی کشی نہیں ہے وہ گیس بھردی گئی ہے تو اب نتیجہ کیا ہے؟ اگر آپ ایک گیس بھرے غبارے کو تو لٹا چاہیں تو پکڑ پکڑ کے آپ اسے میزان میں رکھیں گے، وہ اڑے گا۔ تو اسی طریقے سے مسلمانوں کے اعمال ہوں گے۔ ان مسلمانوں کے جو اہل بیت کی محبت نہیں رکھتے، بشر، فرشتے پکڑ پکڑ کر نماز رکھیں گے، وہ اڑا اڑ جائے گی کیوں کہ عداوت کی گیس بھری ہوئی ہے۔ اس لیے اللہ نے کہا کہ ان سے محبت اس لیے قرار دی گئی ہے کہ کشی باقی رہے، وزن باقی رہے۔ میں جو اپنے بندے کو جزا دیتا چاہتا ہوں وہ جزا دے سکوں۔ اب وہ وزن کیا ہے، وہ کشی کیا ہے؟ صلوٰۃ

اس لیے کہا جاتا ہے کہ۔

بے حب اہل بیت عبادت حرام ہے

اچھا اب عبادت کیا ہے؟ اطاعت الہی۔ جیسے اطاعت الہی کا مظاہرہ نماز ہے۔ ویسے ہی محبت اہل بیت کا مظاہرہ ان کی خوشی میں خوش ہونا ہے اور ان کے غم میں رونا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں یہ مجلس کیا ہے؟ یہ گریہ کیا ہے؟ یہ ماتم کیا ہے؟ یہ کچھ نہیں ہے۔ صرف اظہار محبت ہے۔ جس کو جس سے محبت ہوتی ہے وہ اس کی خوشی میں خوش ہوتا ہے اور اس کے غم میں روتا ہے۔ آپ اس دنیا میں تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ کسی گھر میں اگر موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اس سے تو کوئی گھر خالی نہیں ہے۔ تو جس گھر میں موت ہوتی ہے اور آپ تعزیت کے لیے جاتے ہیں تو آپ کو محبت پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ کوئی چپکا بیٹھا ہوتا ہے۔ کسی کی آنکھ میں آنسو ہوتے ہیں۔ کوئی چیخ کے رو رہا ہوتا ہے۔ کوئی سراور سینہ پیٹتا ہے۔ آپ کیا تاثر لیتے ہیں۔ جس کو جتنا بے چین دیکھتے ہیں اس کو اتنا ہی قریبی سمجھتے ہیں مرنے والے سے۔ تو یہ ہماری عزاداری اور گریہ و بکاء جو ہے، قربت اہل بیت کی دلیل ہے۔ جس کو جتنا بے چین دیکھتے، سمجھتے اس کے دل میں اتنی ہی اہل بیت کی محبت ہے۔ اور جب محبت کی بات سننے کو آتی ہے اور غم کے وقت آزمائش محبت ہوتی ہے تو آنکھیں ٹپکتی ہیں اور بات سننے

میزائل، جس میز، جس ایلی منٹ، جس غصہ کا جتنا کچھاؤ زیادہ ہے، اس کا وزن زیادہ ہے اور جس کشی کا تناؤ جتنا کم ہے، اتنی ہی ہلکی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وزن کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل چیز کشی ہے۔ زمین جس کو جتنے زور سے کھینچتی ہے اس کا وزن بڑھ جاتا ہے اور جس کو زمین جتنا کم لٹ دیتی ہے وہ اتنی ہی ہلکی کھلاتی ہے۔ تو وزن کچھ نہیں ہے، کشی ہے۔ مسلمانوں ہوش کے ناخن لو، نماز میں کوئی وزن نہیں ہے، روزے میں کوئی وزن نہیں ہے، زکوٰۃ میں کوئی وزن نہیں ہے، حج میں کوئی وزن نہیں ہے، کسی عمل خیر میں کوئی وزن نہیں ہے جب تک کہیں کی کشی نہ ہو۔ اسی لیے اجر رسالت میں اہل بیت کی محبت مانگی کہ جب انہیں چاہو گے تو عمل میں کشی پیدا ہوگی جب کشی پیدا ہوگی تو وزن پیدا ہوگا۔ جتنی محبت اہل بیت بروہتی جائے گی اتنی ہی نماز کا وزن بڑھتا جائے گا، روزے کا وزن بڑھتا جائے گا۔ صلوٰۃ

جتنی محبت کم ہوتی جائے گی، اتنی ہی عمل کا وزن گھٹتا چلا جائے گا، اتنا ہی گھٹتا جائے گا جتنی کشی گھٹتی جائے گی اور اتنا ہی وزن بڑھتا جائے گا جتنی کشی بروہتی جائے گی، جتنا تناؤ اور کچھاؤ بڑھتا جائے گا۔ تو اہل بیت کی محبت اجرت میں اس لیے قرار دی گئی کہ اعمال کا وزن بڑھ جائے۔ اب چاہے لوہے والی نماز پڑھو، چاہے روٹی والی نماز، نماز ہے۔ اگر اہل بیت سے محبت ہے تو نماز لوہا ہوگی اور اگر محبت نہیں ہے تو روٹی کا گالہ ہوگی۔ دیکھیے کشی کی جو حد ہے جب اس سے کوئی نکل جاتا ہے تو وزن نہیں رہتا۔

آجکل بات سمجھانا کیا دشوار ہے۔ آپ روز اخبار پڑھتے ہیں کہ جب زمین کی کشی کی لائن سے نکل جاتا ہے انسان اور خلا میں آجاتا ہے جہاں زمین کی کشی نہیں ہے تو وہاں بے وزنی کی کیفیت ہوتی ہے۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو کلو کے انسان گئے ہیں اور جب خلا میں پہنچے ہیں تو تیرتے ہیں کیوں کہ وزن ہی نہیں۔ تو جیسے آدم خلا میں نکل کے تیرتا ہے بغیر وزن کے، ویسے ہی جس مسلمان کو اہل بیت سے محبت نہیں اس کی نماز قضا نہیں ہوگی بلکہ تیرے کی محشر میں۔ روزہ قضا ہوگا مگر تیرے گا۔ جیسے گیس کی کشی زمین سے نہیں ہے۔ اگر غبارے میں گیس بھردی جائے تو وہ اوپر اڑ جاتا ہے۔ ہر چیز نیچے گرتی ہے، وہ اپنا ثقل اپنے

چھوڑ دیں، بیویوں کو چھوڑ دیں، بچوں کو چھوڑ دیں۔ آقا ہم ان کی خدمت میں کوئی کی نہیں کریں گے کہ ایک مرتبہ ناقہ پر سے آواز آئی ایک محل سے، اے ابن عباس! آپ کو زیب نہیں دیتا کہ آپ بن کو بھائی سے چھڑا دیں۔ ہم بھائی کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ آپ پہچان گئے یہ کس کی آواز ہے؟ یہ بی بی زینب کی آواز ہے۔ تو حسین کیا فرماتے ہیں۔ ابن عباس! آپ نے دیکھا کہ میں انہیں نہیں لیے جا رہا ہوں، یہ مرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتیں۔

جب قافلہ مکہ سے روانہ ہوا اور راستے میں اطلاع ملی۔ ایک منزل پر امام فروکش ہیں۔ دیکھا دو ناقہ سوار آرہے ہیں۔ کہا بھیا عباس! ان سے پوچھو یہ کہاں سے آرہے ہیں؟ اگر کوفہ سے آرہے ہوں تو ان سے پوچھو میرے بھائی مسلم کو کس حال میں چھوڑا؟ جناب عباس! گئے۔ ناقہ سواروں کو روکا۔ کہا حسین! ابن علی! پوچھ رہے ہیں کہ تم نے مسلم بن عقیل کو کس حالت میں چھوڑا؟ یہ سننا تھا کہ وہ رونے لگے، ناقہ بٹھا دیئے۔ کہا ہمیں امام کی خدمت میں لے چلو۔ وہ آئے۔ کہا تم کوفہ سے آرہے ہو؟ کہا ہاں فرزند رسول! ہم کوفہ سے آرہے ہیں۔ آقا کوفہ نہ جائیے۔ کہا یہ تو بتاؤ مسلم کو کس حال میں چھوڑا؟ کہا کیسے بتائیں مسلم کا سردار العمارہ پر نٹکا ہوا ہے۔ مسلم کی لاش کوفہ کی گلیوں میں تشیر کی جارہی تھی۔ یہ سننا تھا کہ امام حسین نے آہ سرد بھری، آنکھوں میں آنسو ڈھبائے۔ اٹھے، خیمے میں گئے، آواز دی۔ بن زینب! مسلم کی بیٹی کہاں ہے؟ مسلم کی بیٹی کہاں ہے؟ جناب زینب! مسلم کی بیٹی کو لے کر آئیں۔ وہ کمن پچی آئی۔ حسین نے زانو پر بٹھایا۔ کانوں میں گوشوارے پہنائے۔ سر پر دست شفتت پھیرا۔ بیٹی نے کہا۔ چچا جان آپ تو میرے ساتھ وہ سلوک کر رہے ہیں جو قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ امام نے فرمایا بیٹی تیرا باپ مار ڈالا گیا۔ آج سے میں تیرا باپ ہوں۔ یہ سننا تھا کہ اہل بیت میں کھرام برپا ہو گیا۔

آغا محرم جناب مسلم کی شہادت سے ہوا۔ کون مسلم؟ جو جب کوفہ میں پہنچے تھے تو اٹھارہ ہزار کوفیوں نے جن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی مگر جب نماز صبح میں پلٹ کر دیکھا تو اٹھارہ مومنین باقی تھے۔ پورا کوفہ برگشتہ ہو گیا تھا۔ ابن زیاد (لعین) اچکا تھا اور آنے کے بعد اس نے سب کو لالچ دے کر توڑ لیا تھا۔ جناب مسلم کے لیے کوفہ میں کوئی پناہ گاہ

جناب یعقوب کے بارہ بیٹے تھے۔ کیوں مسلمانوں کو یہ خیال ہے کہ سب سے زیادہ یوسف کو چاہتے تھے۔ بارہ میں سے گیارہ موجود، ایک موجود نہیں مگر اتنا روئے کہ آنکھیں سفید ہو گئیں۔ تو کہا، جناب یعقوب! جناب یوسف کو اتنا چاہتے تھے، اتنا چاہتے تھے کہ فراق میں رویا کرتے تھے۔ تو گویا رونا دلیل محبت ہوتا ہے۔ اگر باپ کا بیٹے کے غم میں رونا دلیل محبت ہے تو بیٹے کا بھی باپ کے غم میں رونا دلیل محبت ہے۔ تو دوست کا دوست کے غم میں رونا دلیل محبت ہے۔ امت کا محمد و آل محمد کے غم میں رونا دلیل محبت ہے۔ لوگ کہتے ہیں نماز پڑھئے، مجلس کیوں کرتے ہیں؟ نماز پڑھتے ہیں اس لیے کہ واجب ہے، مجلس کرتے ہیں تاکہ اجرت ادا کر دیں اور نماز کو جائز قرار دیتے ہیں۔

یہ ہمارا محرم جو آتا ہے، یہ ادائے اجر رسالت کا ہفتہ ہے۔ یہ ہفتہ ہے جس میں ہم محبت کا مظاہرہ کر کے ثابت کر دیتے ہیں اللہ پر، اس کے رسول پر، اس کے فرشتوں پر کہ ہم مسلمان، اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ اظہار محبت میں ریا کاری ہو سکتی ہے لیکن آنسوؤں میں ریا کاری نہیں ہو سکتی جب تک دل پر چوٹ نہ پڑے۔ کیا وجہ ہے کہ ادھر محرم کا چاند نمودار ہوا، گھروں میں صف عزا بچھ گئی۔ لوگوں نے سیاہ لباس پہن لیا، چروں پر غم کے آثار طاری ہو گئے، کیوں؟ کہا یہ محرم مہینہ ہے شہادت حسین! ابن علی! حسین! سفر میں ہیں۔ حسین! مدینہ سے رخصت ہو چکے ہیں۔ حسین! نے مکہ میں اپنے حج کو عمرے سے بدلا ہے۔ جب ذی الحجہ کا مہینہ آتا ہے اور ساری دنیا سے مسلمان حج کے لیے روانہ ہوتا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کہ آج ساری دنیا کے مسلمان حج کرنے کے لیے جا رہے ہیں اور نبی کا نواسہ مکہ میں تھا اور حج نہ کر سکا۔ حج کو عمرے سے بدلا۔ جب کسی نے پوچھا، فرزند رسول! آپ حج سے پہلے کیوں سفر کر رہے ہیں، مکہ سے؟ کہا میں عمرہ بجالایا اور اب میں جا رہا ہوں تاکہ حرمت کعبہ بچ جائے۔ یزید (لعین) نے ۳۰ حاجی بھیجے جو احرام میں خنجر چھپا کے آئے تھے اور حکم تھا کہ اگر حسین! حجر اسود کو بوسہ دے رہے ہوں تو وہیں حسین! کو قتل کر دینا۔ اللہ اللہ کعبہ کی حرمت حسین! نے بچائی۔ چھوڑا تو حج مگر کیا دل پر گزری ہوگی اور جب قافلہ چلنے لگا تو ابن عباس! نے بڑھ کے کہا، آقا آپ سدھاریں، آپ تشریف لے جائیں، آپ بادی

نہیں تھی۔ جناب ہانی ابن عروہ کے مکان میں فروکش ہوئے لیکن جب آپ کو علم ہوا کہ ابن زیاد (لعین) کو پتہ لگ گیا ہے۔ تو آپ ہانی کے گھر سے نکلے گئے۔ جناب ہانی نے کہا آقا آپ نہ جائیے۔ کہا میں تمہارے گھر کی اہانت نہیں چاہتا۔ میں عرض کروں گا سفیر حسینی سے کہ آپ ہانی کے گھر کی اہانت نہیں چاہتے۔ وہاں کر بلا میں آکر دیکھئے کہ رسول اللہ کے گھر کا کیا احرام کیا گیا۔ کونے کی گلیاں اور تنہا پھر رہے ہیں۔ راستہ نہیں ہے۔ پیاس کا غلبہ ہوا۔ ایک گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایک ضعیف بیٹھی تھی۔ اس نے کہا تم کون ہو؟ کیوں میرے دروازے کے سامنے کھڑے ہو؟ کوفہ کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ اپنے گھر جاؤ۔ کہا تھوڑا سا پانی پلا دو۔ طوعا نے لاکے پانی پلایا۔ مسلم ابن عقیل نے پانی پیا، بیٹھ گئے۔ کہا اے شخص میں کہتی ہوں اپنے گھر جا۔ کہا وہ کہاں جائے جس کا کوئی گھر نہ ہو۔ کہا کہ تم کون ہو؟ کہا میں مسلم ابن عقیل ہوں۔ یہ سنتا تھا کہ طوعا نے اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ جبکہ اس کا بیٹا تلاش مسلم میں دولت کی لالچ میں صحرا بہ صحرا چکر کاٹتا ہوا گھر میں آیا۔ طوعا نے پوچھا تو کہاں گیا تھا؟ کہا مسلم کی تلاش میں گیا تھا۔ ابن زیاد (لعین) نے دینار مقرر کیے ہیں کہ مسلم کو تلاش کر کے لاؤ۔ بس سمجھ گئی ماں۔ کہا، کیوں آل محمد کی دشمنی مول لیتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ اسے خبر لگ گئی کہ مسلم گھر میں مقیم ہیں۔ اس نے ابن زیاد (لعین) کو خبر دے دی۔ نماز صبح پڑھی مسلم بن عقیل نے کہ لشکر نے آکے طوعا کا گھر گھیر لیا۔ آپ نے کمر میں پنکا باندھا، تلوار لگائی، کہا اے مومنہ میں تجھے یہاں کوئی جزا نہیں دے سکتا لیکن قیامت میں اپنے رسول سے تجھے جزا دلاؤں گا، اپنے چچا سے تجھے جزا دلاؤں گا، اپنے بھائیوں سے تجھے جزا دلاؤں گا۔ یہ کہہ کر باہر نکلے۔ صبح سے لیکر عصر تک تنہا مسلم بن عقیل نے جہاد فرمایا۔ پانچ پانچ سو کے تین رسالے بلائے گئے۔ ابن زیاد (لعین) نے شاکری سے پوچھا۔ کتنے آدمی تجھے چاہیے ہیں؟ اس نے جواب دیا۔ کیا دینے کے کسی بقال سے لڑنے کے لیے بھیجا ہے۔ ارے یہ بنی ہاشم ہیں۔ تو ایک گڑھا کھودا گیا۔ خس و خاشاک سے پانا گیا۔ جناب مسلم کو جنگ کرتے ہوئے ادھر لایا گیا۔ آپ جب اس گڑھے میں گر گئے تو اوپر سے پھر چلنے لگے، تیر چلنے لگے۔ آپ کو اسیر کر کے ابن زیاد (لعین) کے دربار میں لایا گیا۔ کسی نے کہا کہ آپ نے اسیر کو سلام نہیں کیا؟ تو فرمایا میرا کون امیر ہے سوائے حسین ابی علی کے۔ اللہ وہ

تیسری مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل لا اسئلكم عليه اجرا" الا المودة فى القربى

برادران ملت!

قرآن مجید میں ارشاد ہو رہا ہے کہ ”میرے حبیب! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقرباء ہیں ان سے مودت رکھو۔“

یعنی جو ہمارے قربت دار ہیں ان سے محبت رکھو ان سے مودت رکھو۔ میں نے کل عرض کیا تھا کہ محبت کے درجے ہوتے ہیں۔ جس میں کے آخری ڈگری اور آخری درجہ جو ہے وہ مودت ہے۔ مودت محبت کی وہ قسم ہے کہ جہاں چاہنے والے کو سدا سوتے جاگتے یہ خیال رہتا ہے کہ ہم وہ کریں جو ہمارا محبوب چاہتا ہے اور اس کی مرضی کے خلاف ہم کوئی عمل نہ کریں۔ جو اس کی مرضی ہو جو وہ چاہتا ہو جو اس کی خواہش ہم سے ہو، جو اس کی مشیت ہو ہم اسی پر عمل کریں۔ اہل بیتؑ کی محبت اجر رسالت میں قرار دے کہ اللہ نے یہ چاہا ہے کہ احکام اسلامی جو ہمارا رسولؐ تمہارے سامنے پیش کر جائے گا اس کا کیا حشر ہوگا۔ یہ ہم جانتے ہیں لہذا کم سے کم ایک درجہ، کچھ مسلمان تو

ایسے رہیں۔ جو کلمہ پڑھیں، عبادت کریں، تو مستحق جنت بھی بن جائیں۔ ورنہ دیکھنے میں تو یہ آئے گا کہ قیامت کے دن لوگ حیرت میں پڑ جائیں گے کہ کلمہ بھی پڑھا، نماز بھی پڑھی، روزہ بھی رکھا، حج کو بھی گئے، زکوٰۃ بھی دی، ایک مسلمان بن کے زندگی بسر کی اور پھر بھی جنت کے مستحق نہیں ہوئے۔

سُح کے اوپر دیکھنے سے ہر آدمی سمجھ نہیں پائے گا کہ بھی کافر جنم میں جا رہا ہے، مشرک جنم میں جا رہا ہے تو بات سمجھ میں آرہی ہے۔ یہ آخر مسلم کیوں جنم میں جا رہا ہے؟ لہذا کلمہ پڑھنے والے، کلمہ پڑھنے کے بعد دین پر باقی بھی رہیں۔ اس لیے کسی ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے، جو ان کو دین کے دائرے کے اندر کھینچے رہے۔ جو ان کو دین کے دائرے کے اندر باقی رکھے۔ اور وہ چیز جو اطاعت پر باقی رکھتی ہے وہ دنیا میں اور کائنات میں (تمام فلاسفر نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے) سوائے محبت کے اور کوئی چیز نہیں ہے محبت ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جو اطاعت پر مجبور کر دیتی ہے۔ محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے لیے اصلاح نفس کا سبب بن جاتی ہے۔ محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر باقی رکھتی ہے۔

چنانچہ میں ایک مثال آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں۔ کہ ہماری مثال اللہ کے سامنے کیا ہے؟ خدا کیا چاہتا ہے؟ خدا کی کیا مرضی ہے؟ اور اللہ کا رسولؐ کیا چاہتا ہے؟ اسلام سے اور اسلام کے قبول کرنے سے ہمارا مفاد ہمارا فائدہ کیا ہے؟ ہمارا انٹرسٹ کیا ہے؟ تو وہ بات سامنے کی ہے کہ جو کچھ ہے وہ دوسری دنیا پر منحصر ہے یعنی مرنے کے بعد جو حیات ملے گی وہ دو ہی جگہ بسر ہوگی۔ یعنی یا جنت میں یا جہنم میں۔ تو جنت وہ جگہ ہوگی جہاں آرام ہی آرام ہوگا۔ جہنم وہ جگہ ہوگی جہاں تکلیف ہی تکلیف ہوگی۔ اللہ کیا چاہتا ہے؟ اللہ یہ نہیں چاہتا ہم میں کا انسان جہنم میں جائے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ ہم سب جنت جائیں۔ یہ خود ہم اپنے لیے غلط فیصلہ کر لیتے ہیں کہ بجائے جنت کے ہم جہنم کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اسی لیے بھیجے کہ وہ بندوں کو ایسی زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھلائیں کہ جس سے مرنے کے بعد وہ جنت کے مستحق قرار پائیں اور وہ ابدی حیات جس کے بعد موت نہیں ہے، وہ جنت میں گزرے گی۔ لیکن بعض طاغوتی طاقتیں، ”ابلیس“، مختلف دنیا کے خلائق، ایسے ہیں کہ جو ہمیں

رکھتے؟ اگر کوئی مستطیع ہے، دولت و مال رکھتا ہے، سال بھر کے اخراجات مکمل ہیں اور حج کو نہیں گیا ہے، تو اس سے تو پوچھا جاسکتا ہے کہ بھی تم حج کو کیوں نہیں جاتے ہو؟ کسی پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اس سے پوچھا جاسکتا ہے تم زکوٰۃ کیوں نہیں دیتے؟ جس پر فحش ہے اس سے پوچھا جاسکتا ہے تم نے فحش کیوں نہیں ادا کیا؟ اگر جہاد کی منزل آگئی تو مسلمان سے پوچھا جاتا ہے تم میدان جہاد میں کیوں نہیں نکلتے؟ میدان جہاد میں کیوں نہیں جاتے؟ لیکن کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی مسلمان سے پوچھے تم نماز کیوں نہیں پڑھتے ہو؟ تم روزہ کیوں نہیں رکھتے ہو؟ کوئی غیر پوچھے تو پوچھے، مسلمان کو زیب نہیں دیتا پوچھے کہ تم زکوٰۃ کیوں نکالتے ہو؟ تم فحش کیوں ادا کرتے ہو؟ تم حج کر کے کیوں آئے؟ یعنی الٹی بات ہے جو حج نہ کرے اس سے نہ پوچھا جائے کہ حج کیوں نہیں کیا، جو حج کر کے آئے اس سے پوچھا جائے آپ کیوں حج کو گئے تھے؟ اللہ نے ہم پر واجب قرار دیا ہے اس لیے ہم ادا کرنے گئے تھے۔ جی نہیں آپ اس لیے حج کرنے گئے تھے کہ ہم نے حج نہیں کیا۔ سبحان اللہ ہم ہزاروں روپے اس پر برباد کریں گے کہ آپ سے وقتی فوقیت حاصل ہو جائے۔

آپ انصاف سے بتائیے آپ صرف اس لیے نماز پڑھتے ہیں کہ ہم نہیں پڑھتے۔ آپ اس لیے روزہ رکھتے ہیں کہ ہم نہیں روزہ رکھتے۔ تو پھر یہ کہ ہم پڑھتے ہیں تو آپ کا خیال کر کے نماز چھوڑ دیں۔ کیا آپ اللہ کا خیال کر کے نماز پڑھنا شروع کریں۔ حل کیا ہے؟ تو کہا صاحب پڑھنے والے سے چھڑوائی نہیں جائے گی۔ نہ پڑھنے والے سے پڑھوائی جائے گی۔ روزہ رکھنے والے سے روزہ چھڑوایا نہیں جائے گا۔ روزہ نہ رکھنے والے سے روزہ دکھوایا جائے گا۔ زکوٰۃ دینے والے سے زکوٰۃ چھڑوائی نہیں جائے گی۔ زکوٰۃ نہ دینے والے کو سمجھا کے زکوٰۃ نکلوائی جائے گی۔ فحش ادا کرنے والے کو فحش سے روکا نہیں جائے گا، فحش نہ دینے والے کو سمجھا کے فحش نکوانا پڑے گا۔ حج نہ کرنے والے کو حج پر تیار کرنا پڑے گا، یہی تو طریقہ کار ہے، تو جب ”محبت اہل بیت“ اجر رسالت ہے تو محبت کرنے والوں سے نہ پوچھے کہ تم محبت کیوں کرتے ہو۔ جو محبت نہیں کرتے انہیں سمجھائیے کہ محبت کریں۔ محبت کرنے والا سمجھا سکتا ہے کہ محبت کرو۔ محبت نہ کرنے والا محبت کرنے والے پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ احکام اسلام میں شامل

اس راستے سے بھٹکا دیتے ہیں۔ اب راستے پر باقی رکھنے کے لیے، راستے پر قائم رکھنے کے لیے، ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہے، ایک ایسی کشش کی ضرورت ہے کہ ہم کو جس راستے پر قائم کیا گیا ہے ہم اس راستے پر باقی رہیں۔ صلوٰۃ بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہم جو ”محبت اہل بیت“ پر زور دیتے ہیں اور محرم میں مجلسوں میں اپنے بیانات میں، مسلمانوں کے سامنے زیادہ زور دیتے ہیں اہل بیت کی محبت پر، ایک گمان لوگوں پر گزرتا ہے کہ ہم اہل بیت کے موافق ہیں اور کیوں کہ اہل بیت کی طرفداری کرتے ہیں، اہل بیت کے ماننے والے ہیں، اہل بیت کے طرفدار ہیں، اہل بیت کی پارٹی میں ہیں، اہل بیت ہمارے پسندیدہ ہیں۔ لہذا ہم زور دیتے ہیں، ہم تعریف کرتے ہیں، ہم اہل بیت کا ذکر بہت کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ہماری تعریف سے اہل بیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ہماری تعریف سے ان کو کوئی فیض نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ ہماری تعریف سے ان کو جب فائدہ پہنچے جب ہم سے بہتر کوئی ان کی تعریف نہ کر چکا ہو۔ جن کی تعریف رسول اللہ نے کی، ہمارا کیا منہ ہے کہ ہم اس کی تعریف کریں جس کی تعریف رسول اللہ کرتے تھے۔ جس کی تعریف میں قرآن مجید میں ساڑھے تین سو آیتیں نازل ہوئی ہوں، تو اگر ہم زندگی بھر تعریف بھی کریں تو اس علی کا کیا درجہ بڑھا سکتے ہیں اور ساری دنیا اس علی کی تعریف کرنا چھوڑ دے تو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ جب تک قرآن رہے گا علی کی مدح ہوتی رہے گی۔ صلوٰۃ

یعنی وجہ اور مقصد ہمارا یہ نہیں ہے کہ جیسے دنیا میں ہوتا ہے کہ کوئی کسی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے، کوئی کسی لیڈر سے تعلق رکھتا ہے، کوئی کسی لیڈر کو پسند کرتا ہے، کوئی کسی رہنما کو پسند کرتا ہے، کوئی کسی عالم دین کو پسند کرتا ہے، لہذا اس کی تعریف کر کر کے، ترویج کر کے، اس کے ماننے والوں کا جزمہ بڑھاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے ہم مدح اہل بیت جو کرتے ہیں وہ پارٹی بندی کے جذبے سے نہیں کرتے۔ ہم اہل بیت کی جو تعریف کرتے ہیں، کسی کو نیچا گرانے کے لیے نہیں کرتے۔ ہم اہل بیت کی جو تعریف کرتے ہیں، کسی گروہ بندی کی نیت سے نہیں کرتے۔ ہم اپنا اجر رسالت ادا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر مسلمان پوچھ سکتا ہے کہ بھائی تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ اگر کوئی روزہ نہیں رکھتا تو محبت میں ایک مسلمان پوچھ سکتا ہے کہ بھی تم روزہ کیوں نہیں

کے معنی ہیں پالنے والا، دیکھ بھال کرنے والا، توجہ کائنات کو برقرار رکھ کر اپنی تعریف چاہے۔ توجہ دین دنیا میں بھیجے گا۔ کیا اس کو برقرار رکھنا نہیں چاہے؟ تو اگر خالی خالقیت کی بات ہے تو رسولؐ پر دین تمام ہے پھر کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جو اللہ کے آخری رسولؐ نے پہنچا دیا قیامت تک وہی دین ہے۔ یہ ہے خالقیت کی منزل۔ لیکن جو دین پہنچا دیا ہے وہ قیامت تک باقی بھی رہے۔ یہ ہے ربوبیت کی منزل۔ اسی لیے اس نے خالقیت کی منزل کے لیے اپنے رسولؐ کو ذریعہ بنایا اور ربوبیت کی منزل کے لیے اہل بیتؑ کو خلق فرمایا۔ صلوٰۃ

اب کائنات کو اس نے کیسے باقی رکھا؟ یہ آپ آجکل کے سائنسٹس سے پوچھئے کہ یہ دنیا کیسے باقی ہے! یہ کون و مکاں کیسے باقی ہے؟ یہ ستارے کیسے باقی ہیں؟ یہ شمس و قمر کی گردشیں کیسے باقی ہیں؟ یہ چاند اور جو زمین کے گرد گھوم رہا ہے یہ چاند و زمین مل کے جو سورج کے گرد گھوم رہی ہے یہ سورج جو اپنے محور پر گھوم رہا ہے یہ زمین جو اپنی مدار پر گھوم رہی ہے یہ ستارے جو اپنی جگہ سے دوسری جگہ سفر کر رہے ہیں وہ ستارے جو اپنی جگہ سے ہٹتے ہی نہیں ہیں یہ پورا نظام کائنات کیسے باقی ہے؟ سائنس دانوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ یہ نظام کائنات جو ہے یہ رشتے کے اوپر باقی ہے۔ ایک کا دوسرے سے رشتہ ہے۔ تم جھٹکا ہوا دیکھ رہے ہو مگر یہ جھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے ہیں۔ ان کے بٹلے کی دو چیزیں ہیں ایک کا نام کشش ثقل دوسرے کا نام ہے (Electric magnetism) مقناطیسی برق۔ یعنی ایک دوسرے کی کشش پر قائم ہیں۔ سارا نظام کائنات کشش پر قائم ہے۔ کشش ہی کا دوسرا نام محبت ہے۔

آئنس ٹائنؒ کہتا ہے کہ اگر کشش ہٹالی جائے اگر Magnetism ہٹا لیا جائے تو سب ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں اور دنیا فنا ہو جائے۔ تو سب بقاء کشش ہے۔ کشش ہے تو سب اپنی جگہ ہیں اور کشش ہی تو ایک کا سر دوسرے سے ٹکرا جائے گا۔ توجہ نظام اس نے نظام کائنات میں رکھا ہے وہی نظام اپنے دین میں رکھا ہے کہ اگر اہل بیتؑ کی محبت ہے تو سب اپنی جگہ پر قائم رہیں گے اور جہاں سے محبت ہٹالی جائے گی۔ کفر، شرک سے ٹکرا جائے گا، شرک کفر سے ٹکرا جائے گا۔ کوئی ایمان سے ٹکرا جائے گا اور پھر ہمارے عقیدے اپنی جگہ پر باقی نہیں رہیں گے۔ یعنی ”محبت اہل بیتؑ“ سے اہل

ہے ان کی محبت۔ اب سوال یہ ہے کہ محبت کیا چیز ہے؟ صلوٰۃ
اسلام کے دو مرحلے ہیں، دین کے دو مرحلے ہیں، شریعت کے دو مرحلے ہیں۔ ایک مرحلہ ہے اللہ کا دین بندوں تک پہنچانا اور دوسرا مرحلہ ہے دین کو باقی رکھنا۔ یہ آپ یاد رکھیے گا۔ ایک مرحلہ یہ تھا کہ محفل مرتضیٰ کے ارکان نے یہ بلڈنگ بنائی، حسینہ بنایا، عزاء خانہ بنایا، محفل بنائی، یہ مسجد تعمیر کی۔ تو جب یہ لوگ مسجد تعمیر کر رہے تھے اور امام بارگاہ بنا رہے تھے تو ان کے پیش نظر خالی بنا دینا نہیں تھا بلکہ اس کی بقاء بھی تھی۔ اگر بنا دینا کافی ہوتا تو پھر مرمت کے لیے کوئی بجٹ نہ رکھا جاتا۔ لیکن جو بھی کوئی تعمیرات کرتا ہے تو ایک تو یہ سوچ کر تعمیرات کرتا ہے کہ اتنا مضبوط بنائیں کہ برسوں چلے۔ دوسرے یہ بھی انتظام کرتا ہے کہ ایسا بندوبست کر دو کہ بنا دیا ہے تو باقی بھی رہے تو ایک چیز ہے تخلیق اور دوسری چیز ہے بقاء۔ تو جب ہم بندوں کے نزدیک خالی تخلیق کافی نہیں ہوتی ہمیں بقاء کی فکر ہوتی ہے۔ تو پھر جو خالق کائنات ہے۔ وہ خالی تخلیق پر کیسے مطمئن ہو جائے گا جب تک بقاء کا انتظام نہ کرے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں، آپ نے دیکھا کہ ایک مسجد بنا دی ٹرسٹ نہیں بنائی۔ کوئی پراپرٹی ٹرسٹ نہیں کی۔ تو لوگ کہتے ہیں مسجد تو بنا دی اب اس کی دیکھ بھال کیسے ہوگی؟ یہ باقی کیسے رہے گی؟ اس کی مرمت کیسے ہوگی؟ اس کا کوئی انتظام نہیں کیا؟ اس آدمی کو عقلمند نہیں سمجھا جاتا جو تخلیق کر دے اور بقاء کا خیال نہ کرے۔ تو وہ خالق کیا خالق ہوگا جو خلق کر دے اور بقاء کا خیال نہ کرے۔ اب خود خدا سے پوچھئے وہ اپنی مدد کس بات کی چاہتا ہے تو آپ روز نماز میں کیا پڑھتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○ الحمد للہ رب العالمین ○

”تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو عالمین کا پالنے والا ہے۔“

رب کے معنی خالق کے نہیں ہیں۔ رب کے معنی پالنے والے کے ہیں دیکھ بھال کرنے والے کے ہیں۔ خدا اپنی خالقیت کی مدد نہیں کروا رہا ہے۔ خدا اپنی ربوبیت کی مدد کر رہا ہے! جس نے سورج بنایا اس کی تعریف نہیں چاہتا ہے جیسا بنایا ویسا ہی ہے، اس کی تعریف چاہتا ہے۔ اس نے زمین بنائی اس کی تعریف نہیں چاہتا ہے اس زمین کو اپنی گردش پر روکے ہوئے ہے اس کی تعریف چاہتا ہے۔ اس نے ستارے بنائے اس کی تعریف نہیں چاہتا۔ جس کو جہاں بنا دیا وہیں قائم رکھا، اس کی تعریف چاہتا ہے۔ رب

بیت کا فائدہ نہیں ہے۔ جن کو چاہا جا رہا ہے ان کا فائدہ نہیں ہے۔ جو چاہ رہے ہیں انہیں کا فائدہ ہے۔ صلوٰۃ

تو یہ کش جو دائرہ ہے۔ دائرے کے اندر جب تک چیز باقی رہتی ہے، کش باقی رہتی ہے اور جب دائرے سے نکل جاتی ہے تو کش سے باہر ہو جاتی ہے۔ جیسے زمین ہے، ہم کو، آپ کو اللہ نے زمین پر خلق کیا۔ ہماری آپ کی کش زمین سے رکھی۔ یہ جو آپ بیٹھے ہیں یہ کش کی وجہ سے بیٹھے ہیں۔ یہ جو آپ راستہ چلتے ہیں، یہ کش کی وجہ سے راستہ چلتے ہیں۔ یہ جو آپ لیتے ہیں، تو کش کی وجہ سے لیتے ہیں۔ یہ جو آپ اچھلتے ہیں اور پھر زمین پر آجاتے ہیں یہ کش کی وجہ سے آپ آجاتے ہیں۔ اگر ہماری آپ کی کش ختم ہو جائے تو ہم پتا نہیں کہاں چلے جائیں۔ باقی نہیں رہ جائیں۔ تو یہ کش ہم کو کھینچ رہی ہے۔ نہ اتنا کھینچتی ہے کہ جما دے اور نہ اتنا ڈھیل چھوڑتی ہے کہ دائرے کے باہر ہو جائیں۔ بس اسی ”محبت اہل بیت“ کو سوچئے نہ اتنا کھینچتی ہے کہ امت منجمد ہو جائے۔ نہ اتنا آزادی دیتی ہے کہ دائرے کے باہر نکل جائے۔ کش کو جو اللہ نے خلق کیا ہے تو نہ ٹوٹنے والی (Non-Breakable) نہیں بنایا۔ ایسا نہیں بنایا کہ کش ٹوٹ نہیں سکے۔ کش ٹوٹ سکتی ہے جب طاقت لگائی جائے۔ تو جتنی طاقت لگائی جائے گی، کش اتنی دیر کے لیے ٹوٹ جائے گی۔

ایک پتھر کا ڈھیلا زمین سے اٹھا کے جب آپ آسمان کی طرف پھینکیں گے تو وہ چلا جائے گا۔ یہ کیوں جا رہا ہے، کش کو کیا ہو گیا ہے؟ تو کہا، چونکہ طاقت استعمال کی لہذا پتھر چلا گیا۔ کتنی دور گیا؟ جتنی طاقت استعمال ہوئی اتنی دور گیا۔ اور جہاں سے طاقت ختم ہوئی پتھر زمین پر آگیا۔ اب زمین پر کیسے آیا؟ یہ کش ہے زمین پر لانے والی۔ اگر کش نہ ہوتی تو پتھر زمین پر واپس نہ آتا۔ تو چلا گیا مگر پلٹ کے آیا۔ جب پلٹ آیا پھر زمین کا جز بنا رہا۔ اسی طرح سے آپ سمجھ لیں کہ ”محبت اہل بیت“ دین کی کش ہے، قرآن کی کش ہے، سیرت کی کش ہے، احکام شریعت کی کش ہے، اور ابلیس (لعین) وہ طاقت ہے جو دین سے ہٹاتا ہے۔ جو اس کش سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو جتنا ابلیس کا زور ہم پڑھتا ہے اتنا ہم دور جو جاتے ہیں زمین سے، شریعت کی زمین سے، دین کی زمین سے، عقیدے کی زمین سے، مگر اگر کش باقی ہے تو جیسے ہی وہ زور ختم ہوتا ہے

پلٹ کے پھر چلے آتے ہیں یہ پلٹ کر آجانا دلیل ہے کہ کش باقی ہے لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ سال بھر تو عمل خیر کرتے نہیں دکھائی دیتے مگر جب محرم آتا ہے تو جسے دیکھو دوڑا چلا آ رہا ہے تو وہ قوت جب تک چلتی رہتی ہے نہیں دکھائی دیتے اور جب وہ زور تمام ہوتا ہے کش کھینچ لیتی ہے تو یہ تو مانو کہ اہل بیت کی طاقت کو اگر کوئی چیز توڑ سکتی ہے تو وہ حسین ابن علی کی محبت ہے۔ صلوٰۃ

اب کبھی کبھی قوت ایسی بھی ہوتی ہے جو دائرے کے باہر نکال دیتی ہے جب دائرے کے باہر کوئی چیز چلی جائے گی اور کش کے اثر سے نکل جائے گی پھر اس کے پلٹ کے آنے کا سوال باقی نہیں رہے گا۔ خلا میں جا کے بے وزنی کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی پھر جہاں سے چاند کی کش شروع ہو رہی ہے وہ اس کی طرف کھینچنا شروع ہو جائے گا۔ تو یہ جو لائن ہوتی ہے کش کی اس میں سے گزرتا آسمان نہیں ہے اس لائن کے ادھر ہی رہنا بہتر ہے تاکہ اگر کوئی وقتی قوت ہمیں دین سے ہٹا بھی دے تو کش پھر ہم کو دین کی طرف بلا لے۔ لیکن اگر ہم اس دائرے کو توڑ کر نکل گئے۔ یعنی محبت ہی ختم ہو گئی تو اب قوت استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے جس کا جہاں جی چاہے ہم کو لے جاسکتا ہے۔ تو اللہ کیونکہ جانتا تھا کہ تقدس کی قوت، شریعت کی قوت، رسول کی عصمت کی قوت، رسول کی طہارت کی قوت، ہمارے احکام کی قوت، ہمارے بندوں کو مطیع بنائے رکھے گی۔ مگر ابلیس (لعین) کی قوت اسے عبادت سے ہٹانے کی کوشش کرے گی۔ تو اس کی قوت کو توڑنے کے لیے جب تک کوئی کش نہ رکھی جائے جب تک کوئی محبت نہ رکھی جائے اس وقت تک بندہ دین کے دائرے میں باقی نہیں رہ سکتا۔ تو نبی کا کام تھا دین لانا، اہل بیت کا کام ہے دین بچانا۔ نبی کا کام ہے کلمہ پڑھوانا، اہل بیت کا کام ہے کلمہ پڑھواتے رہنا۔ صلوٰۃ

میں آپ کے سامنے ایسی بین مثال پیش کر رہا ہوں کہ جس سے کوئی بھی دنیا کا مورخ، تاریخ دان انکار نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ کی وفات کے ۵۰ برس کے اندر جہاں شریعت آتی تھی جہاں آیتیں نازل ہوئی تھیں جہاں سے کلمہ کا آغاز ہوا تھا۔ آپ علمائے اسلام سے پوچھیں، میری بات پر یقین نہ کریں کہ اس وقت مدینے کی کیا حالت تھی؟ مکہ کی کیا حالت تھی؟ شام کی کیا حالت تھی؟ کوفہ کی کیا حالت تھی؟ یمن کی کیا حالت

اور پچاس برس والے نہیں جانتے تھے اسلام کیا ہے؟ تو کہا، خوب جانتے تھے۔ تو جانتے تھے تو سوچ سمجھ کر بیعت کی ہوگی۔ جانتے تھے تو سمجھ کر بیعت کی ہوگی۔ تو آپ نے کہا نہیں اسلام جانتے بھی تھے مگر بیعت بھی سمجھ کر نہیں کی تھی۔ تو ان کی نا سمجھی اور چودہ سو برس کے بعد آپ کی سمجھداری۔ تو آپ اسلام کیسے سمجھتے ہیں اپنی سمجھداری کو سمجھ کے، اور پچھلوں کی نا سمجھی پر غور کر کے۔ جیسی تو اسلام سمجھ میں آتا ہے۔ یا آپ بتائیے اگر میں آپ کو چیلنج کروں کہ اگر یزید (لعین) کا کردار خراب ہوتا، یزید (لعین) کا کردار اسلامی نہ ہوتا، اگر یزید (لعین) کا کردار مطابق سیرت رسولؐ نہیں ہوتا تو کروڑوں آدمی بیعت کیوں کرتے؟ آج آپ چودہ سو برس کے بعد کیا حق رکھتے ہیں یزید (لعین) کو برا کہنے کا۔ یزید (لعین) برا ہوتا تو کوئی رہبر مانتا۔ یزید (لعین) برا ہوتا تو کوئی اپنا رہنما مانتا؟ وہ کروڑوں نہیں جانتے تھے، آپ جانتے ہیں۔ تو کہا، کروڑوں کے ماننے سے کیا ہوتا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ وہ شہادت ہے کروڑوں کی بیعت بین ہے کہ یزید (لعین) کا کردار اچھا تھا۔ اگر اچھا نہ ہوتا تو کروڑوں اچھے کردار کے لوگ کیوں بیعت کیے ہوتے؟ کہا، عجیب آپ کی دل۔ ہے۔ نہیں، میں پوچھ رہا ہوں کہ آپ کو یہ کس نے بتایا؟ کسی نے آکے آپ کے کان میں کہا، آپ کے اوپر جبرئیلؑ وحی لے کر نازل ہوئے۔ آپ کیسے کہتے ہیں؟ تو ہر مسلمان کو کہنا پڑتا ہے کہ یہ بات ہمیں ۱۴۰۰ عہد سے معلوم ہوئی۔ اگر یزید (لعین) کا کردار درست ہوتا تو نبیؐ کا نواسہ اپنی جان کیوں دیتا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیعت سے اسلام سمجھ میں نہیں آیا۔ حسینؑ کے جان دینے سے اسلام سمجھ میں آیا۔ حسینؑ کی جان کیوں گئی؟ انکار بیعت سے۔ اب میری دلیل یہ ہے کہ اقرار کرنے والوں نے اسلام نہیں بچایا ہے، انکار کرنے والوں نے اسلام بچایا ہے۔ صلوٰۃ

اگر ۷۲ انکار بیعت نہ کرتے تو آج آپ کو تاریخ میں ڈھونڈنے گواہی نہیں ملتی کہ یزید (لعین) کا کردار کیسا تھا۔ لیکن ۷۲ کی شہادت نے بتایا کہ شہادت کیا ہے۔ مرجائیں گے، قتل ہو جائیں گے، بھوکے رہیں گے، پیاسے رہیں گے، مگر تیرا کردار واضح کر کے رہیں گے۔ قتل شدائے کربلا کا سبب کیا تھا؟ اگر بیعت کر لیتے تو کوئی قتل ہوتا؟ نہیں قتل ہوتا۔ جان دینا پسند کی اور یزید (لعین) کے کردار پر ”ص“ بنانا پسند نہیں کیا۔ تو آج جہاں جہاں بھی اسلام ہے، وہ ۷۲ کی گواہی پر ہے۔ ان ۷۲ گواہوں کا اشد ان لا الد

تھی؟ اسپین میں یورپ میں جہاں جہاں اسلام تھا کیا حالت تھی؟ افریقہ میں جہاں جہاں تک اسلام تھا کیا حالت تھی؟ ایسی کیفیت تھی کہ لوگ یزید (لعین) کو اپنا رہبر مان رہے تھے، اپنا رہنما مان رہے تھے اور جو کردار یزید (لعین) تاریخ میں دنیا کے سامنے موجود ہے، اس کردار کو کوئی بھی طاقت {یزید (لعین)} کے اس کردار کو اسلامی کردار نہیں ثابت کر سکتی۔ میں نہ ایمان کی بات کر رہا ہوں نہ میں عقیدے کی بات کر رہا ہوں۔ میں کردار کی بات کر رہا ہوں کہ کیا یزید (لعین) کا کردار جو ۷۰ ہجری میں تھا جس وقت وہ بحیثیت جانشین رسولؐ اسلامی حکومت کو چلا رہا تھا اور لوگ اسے کے ہاتھ پر بیعت کیے ہوئے تھے۔ بحیثیت جانشین رسولؐ کے، بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے۔ تو کیا اس کا کردار وہی تھا جو کردار ایک مسلمان کا رسول اللہؐ نے بتایا تھا؟ آپ کہیں گے نہیں یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے، یہ بالکل آئینہ بات ہے، یہ بالکل مظہرات ہے کہ وہ یزید (لعین) اور اس کا کردار غیر اسلامی تھا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کیسے غیر اسلامی تھا...؟

آپ بتائیں کیا اذان نہیں ہو رہی تھی؟ کیا نمازیں نہیں ہو رہی تھیں؟ کیا قاریان قرآن نہیں تھے؟ کیا حافظان قرآن نہیں تھے؟ کیا عاملان قرآن نہیں تھے؟ کہا تھے، پھر آپ نے کیسے کہہ دیا کہ یزید (لعین) کا کردار اسلامی کردار نہیں تھا۔ ارے کردار نہیں تھا، کلمہ تو تھا۔ تو کہا کلمے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اوپر اوپر اسلام تھا، دل کی گمراہی میں اسلام نہیں تھا۔ تو یہ اوپر اور گمراہی کا کیا فرق ہے؟ کہا اوپر کا فرق یہ ہے کہ اوپر کا اسلام مکاری ہوتا ہے اور دل کی گمراہی میں جو اتر جاتا ہے وہ کچے کردار کا مسلمان بنا دیتا ہے۔ اب مجھے آپ یہ بتا دیجئے کہ جب بحث کردار کی ہے تو آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یزید (لعین) کا کردار خراب تھا کس نے آپ کو یہ خبر دی۔ کس نے آپ کو بتایا کہ یزید (لعین) کا کردار اسلامی کردار نہیں تھا...؟

میں اس پر بحث کروں گا چاہے کل سے آپ مجھ سے مجلس نہ پڑھوائیں۔ جس آدمی کے ہاتھ پر کروڑوں آدمی بیعت کریں تو کیا بیعت کرنے والے نابینا تھے، اندھے تھے؟ کیا بیعت کرنے والوں کو اللہ کا خوف نہیں تھا؟ کیا بیعت کرنے والے رسولؐ کی سیرت سے واقف نہیں تھے؟ کیا بیعت کرنے والے قاریان قرآن نہیں تھے؟ کیا بیعت کرنے والے قرآن کے معنی نہیں سمجھتے تھے؟ بھی آپ چودہ سو برس کے بعد جانتے ہیں اسلام کیا ہے

یزید (لعین) ہمارے فقہ کا رہبر تھا یزید (لعین)۔ کوئی یزیدی فقہ ہے؟ کہا نہیں ہے۔ یہاں تو کوئی نہیں ملتا۔ تو جب نہیں تھا، آیا کیسے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ننانوے فیصد جس کو بیعت حاصل ہو اور ایک فیصد نے جس کی بیعت کا انکار کیا ہو، آج سب اس کا انکار کر رہے ہیں۔ تو یہ معاملہ کیا ہے۔

ایک مرتبہ میں لکھنؤ سے بمبئی جا رہا تھا تو یہ بات مجھ پر واضح ہوئی۔ لکھنؤ سے بذریعہ ٹرین میں بمبئی جا رہا تھا۔ لکھنؤ سے بمبئی جاتے میں بیچ میں ایک اسٹیشن آتا ہے جہاں سی، یوپی کا بارڈر۔ یہاں پر ایکسائز والے تلاشی لینے آتے ہیں اور ڈھونڈتے ہیں کہ افیم تو نہیں ہے کسی کے پاس۔ ہیروئن تو نہیں ہے کسی کے پاس۔ اسمگلنگ کا سامان تو نہیں ہے کسی کے پاس۔ وہ تلاش کرتے ہیں۔ چیک پوسٹ ہے۔ میں بھی کپارٹمنٹ میں بیٹھا تھا۔ ایک سوٹ کیس اوپر برتھ پر رکھا ہوا تھا۔ ایکسائز والے آئے، پوچھا یہ بکس آپ کا ہے؟ میں نے کہا میرا نہیں ہے۔ دو چار آدمی اور جو پیچھے تھے، ان سے پوچھا آپ کا ہے؟ انہوں نے کہا میرا نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا آپ کا ہے؟ میرا نہیں ہے۔ ارے حیرت کی بات تھی۔ یہ بکس موجود ہے اور مالک کوئی نہیں! انہوں نے کہا صاحب جب آپ میں سے کسی کا نہیں ہے تو ہے کس کا؟ انہوں نے کہا دیکھئے کوئی نیچے نسل رہا ہے۔ اس کا ہو، کسی کا ہو۔ اب پوچھ رہے ہیں کس کا ہے۔ کوئی نہیں کہتا ہمارا ہے۔ اب جو انہوں نے اس بکس کے لاک کو توڑا تو اس میں افیم نکلی۔ تو بات سمجھ میں آگئی کہ جب مال پکڑ لیا جاتا ہے تو کوئی نہیں کہتا ہمارا ہے۔ صلوٰۃ

جب مال پکڑ لیا جاتا ہے تو کوئی نہیں کہتا ہمارا ہے۔ کربلا والوں نے یزید (لعین) کو پکڑ لیا۔ تو اب کوئی نہیں کہتا کہ ہمارا ہے۔ تو اب یہ چیز ہماری سمجھ میں کیسے آئی؟ محبت کی وجہ سے۔ جس کے دل میں حسین کی محبت ہوگی، وہ اسلام سمجھ جائے گا۔ اور جس کے دل میں حسین کی عداوت ہوگی، وہ کئے گا یزید (لعین) کو ضد میں کہتا رہا ہے۔ ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ ضد الگ بات ہے۔ تو وہی صحیح فیصلہ کر سکتا ہے۔ جس کے دل میں محبت ہوگی اور محبت کی طاقت بیان کر رہا ہوں۔ محبت میں اتنی قوت ہے کہ عاشور کے دن حرم کو کھینچ لائی محبت، دلیل محبت پیش کر رہا ہوں۔ حرم یزید (لعین) کے لشکر میں ہے۔ حرم نمک خوار یزید (لعین)۔ حرم سپاہ سالار لشکر یزید (لعین)۔

الا للہ کہتا آج کلمہ ہے۔ ان ۷۲ شہیدوں کا اشهد ان محمد و رسول اللہ کہتا آج کلمہ ہے۔ ۷۲ کی شہادت کی وجہ سے۔ اب یہ ۷۲ جو شہید ہوئے، کس لیے شہید ہوئے؟ بیعت کس سے طلب کی تھی؟ حبیب سے طلب کی تھی، زہیر سے طلب کی تھی، مسلم ابن عوجہ سے طلب کی تھی، حبیب شاکری سے طلب کی تھی، جون سے طلب کی تھی، کس سے طلب کی تھی؟ بیعت حسین سے طلب کی تھی۔ انکار بیعت حسین نے کیا تھا۔ لہذا قتل حسین کا جواز تھا۔ حبیب کیوں مارے گئے، زہیر کیوں مارے گئے، مسلم کیوں مارے گئے، ان کا کیا کام تھا کرلا میں؟ یزید (لعین) حسین سے بیعت مانگ رہا تھا۔ حسین نے انکار بیعت کیا تھا۔ ان سے تو مانگی بھی نہیں تھی بیعت۔ ان کے تو بیعت نہ کرنے کی خبر اسے نہ تھی۔ ان کے نام کہاں سے ملتے ہیں کرلا میں۔ حبیب کا نام، مسلم کا نام، زہیر کا نام، ہلال ابن نافع کا نام اور وہ جو عاشور کے دن یزید (لعین) کا لشکر چھوڑ کر گیا، اس کا نام کہاں سے ملتا ہے؟ کس بنیاد پر یہ لوگ جمع تھے؟ ماننا پڑے گا کہ یزید (لعین) طالب بیعت تھا حسین سے۔ حسین انکار بیعت کر رہے تھے۔ یہ سب حسین کی محبت میں آئے تھے۔ تو ۷۲ جو بیعت گئے محبت حسین میں بیچ گئے۔

اب سمجھئے کہ کیوں کہا تھا کہ ان کی محبت اجر رسالت ہے؟ یعنی جو ان سے محبت رکھے گا وہ بیچ جائے گا اور جو ان سے محبت نہیں رکھے گا وہ اس اہل منٹ طاقت سے نہیں بیچ سکتا جو دین کو بدلنے پر آمادہ ہے۔ آج ساری دنیا میں کسی سے بھی پوچھئے تو کوئی یزید (لعین) کا کردار اسلام کو دار نہیں بتاتا اور جو بھی ہے وہ یزید (لعین) کو Disown کر رہا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ہر شخص منکر یزید (لعین) ہے۔ کوئی نہیں کہتا ہے کہ ہم یزید (لعین) کے ماننے والے ہیں۔ کوئی نہیں کہے گا۔ کوئی پڑھا لکھا آدمی، کوئی سمجھدار آدمی کبھی کہتا ہی نہیں کہ یزید (لعین) کس کا ہے۔ میں فرقوں کے نام لے کے پوچھ لوں تاکہ مسلمانوں کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ اے شیعہ بھائیو! کیا یزید (لعین) آپ کا ہے؟ تو کہیں گے صاحب ہم سے کیا مطلب۔ اے برادران اہلسنت! کیا یزید (لعین) آپ کا ہے؟ ہم سے کیا مطلب۔ جس سے پوچھو وہ کہتا ہے ہم سے مطلب نہیں۔ بھی جب کسی سے مطلب نہیں تو وہ اتنے بڑے عمدے پر پہنچا کیسے؟ آج سب یزید (لعین) اور یزیدیت کو Disown کر رہے ہیں۔ کوئی نہیں ملتا ڈھونڈے سے جو کہے کہ ہمارے فرقے کا تھا

بات کوئی بھی مجھ سے کہتا تو میں پلٹ کے انہی لفظوں میں جواب دیتا مگر کیا کروں۔ آپ کی ماں پر سوائے درود و سلام کے کچھ نہیں کہا جاتا۔ حُر کے یہ کلمے تاریخ میں موجود ہیں۔ یہ کلمے موجود ہیں کہ ”نبیؐ کے نواسے کوئی بھی مجھ سے کہتا تو پلٹ کر میں بھی یہی کہتا۔ مگر آپ سے نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے کہ آپ ماں پر درود و سلام کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ لشکر یزید (لعین) میں ہے، ملازم ہے، سپہ سالار ہے، مگر رسولؐ کی بیٹی کی عظمت سے واقف ہے یعنی کردار بگڑا ہوا ہے مگر دل میں عظمت ہے۔ اب اس کا فائدہ دیکھیے حُر کو کیا ملتا ہے۔ کہا آپ کو کچھ نہیں کہا جاتا۔ یہ کہہ کے قافلہ آگے بڑھا۔

جب شب عاشور آئی تو وہی حُر تھا جو اپنے خیمے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ حسینؑ سے محبت نہیں تھی۔ حسینؑ کو گرفتار کرنے گیا تھا۔ مگر رسولؐ کی بیٹی کی عظمت اتنی تھی کہ زبان سے گستاخی نہیں کر سکا۔ اب رات میں ٹہل رہا ہے۔ کبھی ادھر آتا ہے، کبھی ادھر جاتا ہے۔ کبھی آگے بڑھتا ہے، کبھی پیچھے ہٹتا ہے۔ بیٹے نے بڑھ کر کہا بابا کیا بات ہے؟ میں نے بڑی بڑی لڑائیوں میں آپ کو دیکھا ہے مگر بابا اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا، اتنا مضطرب کبھی نہیں دیکھا۔ بابا ہمارے ساتھ لاکھوں کا لشکر ہے۔ بابا ادھر تو مٹی بھر لوگ ہیں۔ یہ بیٹا کہہ رہا ہے۔ تو حُر نے کیا جواب دیا۔ کیا کہہ رہا ہے میں جنگ کے خوف سے نہیں ٹہل رہا ہوں۔ میں تو جنت اور جہنم کے بیچ میں ٹہل رہا ہوں۔ ایک طرف جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہیں اور ایک طرف جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ کہا بابا پھر کیا فیصلہ کیا؟ کہا جنت۔ کہا مرحبا، میرا فیصلہ بھی آپ کی اطاعت میں ہے۔ بتا دیا حُر نے کہ ادھر جہنم ہی جہنم ہے اور ادھر جنت ہی جنت ہے۔ میں نے ایسی چیز آپ کے سامنے لاکے رکھ دی ہے کہ اس سے کوئی یزیدی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ لاکھوں کا لشکر۔ اس لاکھوں کے لشکر میں ایک شخص یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یزید (لعین) کی طرف جہنم ہی جہنم ہے اور حسینؑ کی طرف جنت ہی جنت ہے۔ آج علماء کی بحثوں میں آپ نہ جائیں۔ یہ حُر کا پرانا فیصلہ اٹھا کر پڑھیں۔ اس کا فیصلہ دیکھیں۔ جو اس نے فیصلہ اپنے لیے کیا۔ اور آپ سے میں پوچھنا چاہتا ہوں، آج حُر کہاں ہے؟ آپ کہیں گے جنت میں ہے۔ تو جب تجربہ بھی ہو گیا فیصلے پر تو اب آپ کو پریشانی کی کیا بات ہے۔ جو حُر نے فیصلہ کیا اس کی تقلید آپ کر لیجئے کہ ادھر جہنم ہی جہنم، اس طرف جنت ہی جنت۔

نے ایک ہزار کا رسالا دے کر حُر کو بھیجا کہ جاؤ اور جا کے حسینؑ کو گرفتار کر کے ہمارے سامنے لے آؤ۔ چنانچہ حُر چلا۔ یہ خبر تھی کہ حسینؑ آ رہے ہیں۔ اور ایک منزل پر جب حُر کا رسالا پہنچا تو کیا عالم تھا کہ عراق کی گرمی اور گرمی کا سفر۔ عالم یہ تھا کہ سارے سپاہی حُر کے لشکر کے پیاسے ہو گئے تھے۔ اتنے پیاسے کہ بدحواس ہو رہے تھے پیاس سے۔ گھوڑوں کی زبانیں نکلی ہوئی تھیں۔ ناقوں کی زبانیں نکلی ہوئی تھیں۔ اور جب یہ لشکر وہاں پہنچا جہاں حسینؑ ابن علیؑ کے خیمے تھے۔ تو حسینؑ نے کہا بھیا عباسؑ یہ لشکر بڑا پیاسا ہے لہذا اسے پانی پلا دو۔ چنانچہ لشکر حُر کو حسینؑ کے ساتھیوں نے پانی پلایا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کو پانی پلایا، ناقوں کو پانی پلایا۔ کراچی میں نہیں مسند کے کنارے نہیں، دریا کے کنارے نہیں، صحرا میں۔ جہاں مشکیزوں میں پانی بھر کے قافلے چلتے تھے۔ حد یہ کہ حسینؑ کے پاس سارا پانی ختم ہو گیا مگر یہاں نہ دیکھا گیا اور پانی سارا لشکر حُر کو پلا دیا گیا۔

ایک سواریہ کہتا ہے کہ میں آخر میں رہ گیا تھا۔ جب میں پہنچا ہوں تو کوئی شخص مجھ سے کہہ رہا تھا۔ نائق کو بٹھالے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اتنا میں پیاس سے بدحواس تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھواں اٹھ رہا تھا۔ تو اس نے مہار نائق پکڑ کے نائق کو بٹھایا اور میرے منہ سے کاسہ آب لگا دیا۔ جب میں نے پانی پیا اور میری آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا فرزند رسولؐ حسینؑ ابن علیؑ اپنے ہاتھوں سے پانی پلا رہے ہیں۔ یہ منزل تھی اور اس کے بعد جب حسینؑ چلنے لگے تو حُر نے کیا کہا۔ لشکر یزید (لعین) میں ہے، سپہ سالار لشکر یزید (لعین) ہے، مقرر ہوا ہے گرفتار کر کے لانے کے لیے۔ چنانچہ جب امامؑ نے قصد سفر کیا تو اس نے لگام فرس پر ہاتھ ڈال دیا۔ آپ آگے نہیں جاسکتے جہاں ہم کہیں گے وہاں آپ کو چلنا ہے۔ ہم آپ کے گھوڑے کو آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ یہ بہت بڑی گستاخی تھی۔ یہ بہت بڑی بدتمیزی تھی۔ میں کیسے سمجھاؤں اپنے نوجوانوں کو۔ جیسے میں آپ کے گریبان میں ہاتھ ڈال دوں۔ تو آپ کی کتنی بڑی اہانت ہے۔ یہ عرب کا طریقہ تھا، گھوڑے کی لگام پر ہاتھ ڈال دیتا۔ جب حُر نے ہاتھ ڈالا، حسینؑ ابن علیؑ نے عجب جملہ فرمایا ”حُر تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے۔“ یہ عرب کا بہت بڑا کلمہ تھا جس کو سن کر حُر تڑپ گیا۔ مگر جواب کیا دیا۔ فرزند رسولؐ اس ملک میں یہ

نقطہ ہے کہ جہاں پر آپ کو سوچنا پڑے گا کہ اتنا بڑا عالم اپنے وقت کا عمر سعد (لعین) اور سپہ سالار لشکر یزید (لعین) کی طرفداری میں دو ہی دلیلیں دے سکا۔ ایک دنیا کی دولت کی لالچ، دوسرے دنیا کی تباہی کا خوف۔ یعنی عمر سعد (لعین) یہ بھی نہ کہہ سکا کہ یزید (لعین) کا ساتھ چھوڑے گا تو جنت کیسے جائے گا؟ عمر سعد (لعین) یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ اگر یزید (لعین) کا ساتھ چھوڑے گا تو جہنم میں چلا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو یزید (لعین) کا ساتھ دے رہے تھے انہیں بھی معلوم تھا کہ ہم جنت نہیں جائیں گے۔ ہم جہنم جائیں گے۔ تو اتنا بڑا بے وقوف کون انسان ہو سکتا ہے جو جنت کو چھوڑ کے جہنم کا سودا کر لے؟ ملک ”رے“ نہیں لے گا یعنی دنیا کی دولت کو جنت پر ترجیح دے رہا تھا۔ جہنم جانے کو تیار ہے مگر دنیا کا اقتدار چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔ تو جو لشکر یزید (لعین) کا سب سے بڑا عالم تھا اس کے یہ کلمے حقائق بتاتے ہیں کہ یزید (لعین) بھی جانتے تھے کہ دولت کی لالچ میں اور جان کے خوف میں ہم کو یزید (لعین) کا ساتھ دینا ہے۔ یزید (لعین) کا ساتھ دینے سے جنت نہیں ملے گی۔ اور جو حسینؑ کی محبت میں جا رہا تھا وہ کہہ رہا تھا میں جنت جا رہا ہوں۔ حرم کو یقین جنت، عمر سعد (لعین) کو یقین دوزخ۔ اب عقل کی بات ہے۔ کوئی آخرت کو دنیا پر ترجیح دے رہا ہے، کوئی دنیا کو آخرت پر ترجیح دے رہا ہے۔

بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بعض آدمی آج کے دور میں بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتے کہ حق جان کے، حق کی طرفداری کیوں نہیں کرتے؟ وہی حق کا ساتھ نہیں دیتا جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے۔ اور وہ کبھی حق سے الگ نہیں رہ سکتا جو آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔ تو ایک مرتبہ عمر سعد (لعین) نے کہا تو کیا تو ساتھ چھوڑ دے گا؟ کہا میں جا رہا ہوں۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کے لیے جا رہا ہوں۔ میں اپنے گناہ کو بخشوانے کے لیے جا رہا ہوں۔ لاکھوں کا لشکر حرم کو روک نہ سکا۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے حق تو سمجھ میں آیا کہ حسینؑ کے ساتھ ہے مگر اگر ہم اپنا مسلک چھوڑ کر حق کی طرف آئیں گے، تو نہ جانے ہمارا کیا کر دیا جائے گا؟ حرم نے بتایا جو حق کی طرف قدم بڑھائے گا اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ جب یزید (لعین) کا لشکر نہ روک سکا تو دنیا میں کون روک لے گا؟ اور جب حرمؑ کو روک نہ سکا تو دنیا میں کون روک لے گا؟

دیر کیا ہے؟ کہا کوئی دیر نہیں۔ میرے لال، صبح ہو جائے رات کی تاریکی میں نہیں جاؤں گا۔ حالانکہ رات کو حرمؑ آسکا تھا خدمت حسینؑ میں۔ مگر اس کا یہ کہنا کہ میں رات میں نہیں جاؤں گا، روز روشن ہونے دے، صبح کا اجالا ہونے دے، کیا مطلب تھا؟ حرمؑ نے یہ بھی مسلمان کو سبق دیا کہ جب باطل کی طرف سے حق کی طرف آنا تو چھپ کے نہ آنا، کھل کے آنا، روز روشن میں آنا، تاکہ دوسرے دیکھیں کہ تم نے باطل چھوڑ دیا اور تم حق کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔

ادھر صبح کا وقت آیا اور شہزادہ علی اکبرؑ نے اذان دی، صف جماعت ادھر مکمل ہو رہی تھی۔ ادھر حرمؑ نے بیٹے کو دیکھا، بھائی کو دیکھا، غلام کو دیکھا، کہا بابا ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ بھائی نے کہا میں بھی ساتھ چلوں گا۔ غلام نے کہا میں بھی ساتھ چلوں گا۔ کہا میرے لال، جا کے عمر سعد (لعین) سے کہہ دے کہ میں حسینؑ کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ دیکھیے آپ جرات حق کے کتے ہیں؟ جب انسان حق سے وابستہ ہو جاتا ہے تو چھپ کے نہیں جاتا، کھل کے جاتا ہے اور کھل ہی کے نہیں دوسرے کو جتا کے جاتا ہے۔ جیسے ہی عمر سعد (لعین) کو یہ اطلاع ملی، دوڑا ہوا آیا۔ شمر (لعین) ساتھ آیا، خولی (لعین) آیا۔ کہا حرمؑ کہاں جا رہا ہے؟ کہانی کے نواسے کے پاس جا رہا ہوں۔ عمر سعد (لعین) اپنے دور کا بہت بڑا عالم تھا۔ تاریخ لکھتی ہے، اس نے کیا فیصلہ دیا ہے۔ عمر سعد (لعین) نے کہا، اے حرمؑ تو یزید کا ساتھ چھوڑ کے حسینؑ کی طرف جا رہا ہے۔ کیا تو ملک ”رے“ نہیں لے گا؟ ملک ”رے“ کیا؟ ”رے“ ایک حکومت تھی ایران میں۔ آج کے تہران سے پہلے اس کا نام ”رے“ تھا۔ اس حکومت کا وعدہ کیا تھا یزید (لعین) نے کہ جو حسینؑ کو قتل کرے گا اسے میں حاکم بنا دوں گا۔ چنانچہ جب یہ کہا تو حرمؑ نے جواب دیا میں جنت جا رہا ہوں۔ ملک ”رے“ کیا چیز ہے۔ اس کے بعد عمر سعد (لعین) نے کہا اگر تو یزید کا ساتھ چھوڑ کے حسینؑ کے ساتھ چلا جائے گا تو تجھے خبر ہے یزید تیرے بچوں کو قتل کر دے گا، تیرا گھر سمار کر دے گا، تیری جائیداد ضبط کر لے گا۔ حرمؑ نے جواب دیا عمر سعد، جب نبیؐ کا گھر لٹ رہا ہے، جب نبیؐ کے بچے قتل ہو رہے ہیں، تو میرے گھر کی کیا اہمیت ہے، میرے بچوں کی کیا اہمیت ہے۔

میں آپ کو اس لیے یہاں تک لایا کہ اے برادرانِ اسلامی! یہ نقطہ فکر ہے۔ یہ وہ

اسی کو معاف کرے گا جس کو حسینؑ معاف کرے گا۔ کہا آقا پھر مرنے کی اجازت دے دیجئے۔ کہا حُرّ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تو ہمارا مہمان ہے۔ بس یہ سننا تھا کہ حُرّ رونے لگا۔ نبیؐ زادے میں مہمان ہوں کہ آپ مہمان ہیں؟ کہا حُرّ تجھے معلوم ہے کہ میرے خیموں میں کھانا نہیں ہے، پانی نہیں ہے۔ مگر چل کے تھوڑی دیر سائے میں بیٹھ جا۔ تو حُرّ نے کیا جواب دیا۔ اے نبیؐ کے نواسے مجھے خیمہ گاہ تک نہ لے جائیں۔ اس لیے کہ مجھے بچوں سے شرم آ رہی ہے۔ بیبیوں سے حجاب آ رہا ہے۔ بچے پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ حُرّ نے منت کی، حاجت کی، اجازت مانگی۔ جب حُرّ کو اجازت مل گئی تو بیٹے سے کہا میرے لال آگے بڑھ جا۔

لکھا ہے کہ ولیر باپ کا ولیر بیٹا، بہادر باپ کا بہادر بیٹا، میدان کر بلا میں آیا۔ باپ سے داد شجاعت لے رہا تھا۔ عمر سعد (لعین) نے بڑھ کے کہا ارے یہ حُرّ کا بیٹا ہے۔ اسے گھیر کے قتل کرو۔ تیر چلنے لگے، نیزے چلنے لگے، بیٹے سے جب گھوڑے پر نہ سنبھلا گیا تو گرتے ہوئے دو آوازیں دیں۔ ایک تو آواز یہ تھی، آقا میرا آخری سلام قبول ہو۔ دوسری آواز یہ تھی بابا ذرا میرے پاس آئیے بابا۔ اب خیمہ گاہ سے حسینؑ بھی چلے۔ حُرّ بھی چلا۔ مقاتل لکھتے ہیں کہ حُرّ آواز دے رہا تھا اے لشکر شام و کوفہ مجھے بتاؤ کہ میرا بیٹا کدھر ہے؟ مثل شیر غضبناک حملہ کر رہا تھا اور اشتیاق بھاگ رہے تھے۔ مگر کوئی نہیں بتاتا تھا کہ حُرّ کا بیٹا کدھر ہے۔ تو ایک مرتبہ آواز آئی حُرّ ادھر آ جا، تیرا بیٹا ادھر ہے۔ تو اس آواز پر حُرّ دوڑا ہوا پہنچا۔ اب کیا دیکھتا ہے کہ حسینؑ بیٹھے ہوئے ہیں۔ حُرّ کے بیٹے کا سر زانو پر رکھا ہوا ہے۔ بیٹے کا غم بھول گیا۔ کہا مولا آپ نے کیوں تکلیف کی؟ حسینؑ نے کہا حُرّ میں نہ آتا تو کیا تجھے جوان کا جنازہ اٹھانے کو بھیجتا۔ بس یہ سننا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں کہوں آقا، ارے حُرّ کو نہ بھیجا جوان کا لاشہ اٹھانے کے لیے۔ لیکن جب علی اکبرؑ نے میدان سے سلام کیا تو کون ہے جو آپ کے جوان کا جنازہ اٹھائے۔ آپ کو خود ہی قتل میں جانا ہے۔



قدم روک لیے تو بیٹے نے کہا بابا حق کی طرف بڑھے ہوئے قدم رکا نہیں کرتے۔ کہا میں ہلک نہیں رہا ہوں، میں سوچ رہا ہوں کیسے جاؤں حسینؑ کے سامنے؟ میں نے یہ ہاتھ لگام فرس پر ڈالا تھا۔ بیٹا میرے دونوں ہاتھ رومال سے باندھ دے۔ حُرّ کے بیٹے نے حُرّ کے ہاتھوں کو باندھا۔ حُرّ نے دونوں ہاتھ رومال سے بندھوائے تاکہ دور سے دنیا دیکھ لے کہ اب معافی مانگنے جا رہا ہے۔ جب آگے بڑھ کے رک گیا۔ تو کہا بابا اب آپ کیوں رک گئے؟ کہا میرے لال آوازیں سن رہا ہے خیمہ حسینی سے کیا صدا سنیں آ رہی ہیں؟ کہا بابا بچوں کی آوازیں ہیں۔ العطش العطش۔ ارے پیاسے ہیں۔ کہا میرے لال یہ کس کے بچے پیاسے ہیں۔ جس نے ہمارے پورے لشکر کو سیراب کیا تھا۔ یہ سانی کوثر کی اولاد پیاسی ہے۔ لہذا میری عبا کو میرے چہرے پر کھینچ دے۔ بیٹے نے عبا سے باپ کا چہرہ ڈھک دیا۔ اب حُرّ اس شان سے جا رہا ہے کہ چہرہ عبا میں چھپا ہوا ہے، دونوں ہاتھ رومال میں بندھے ہوئے ہیں۔ جب تھوڑی دور اور آگے بڑھا تو بیٹے نے آواز دی ”اللہ اکبر“۔ کہا کیوں تکبیر کسی؟ کہا بابا عجیب منظر دیکھ رہا ہوں۔ کہا کیا دیکھ رہا ہے؟ کہا انصاران حسینؑ اصحاب حسینؑ مرحبا مرحبا کہتے ہوئے بڑھ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو لینے کے لیے آقاؐ نے اصحاب کو بھیجا ہے۔ یہ سننا تھا کہ حُرّ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ تھوڑی دور اور آگے بڑھا بیٹے نے کہا ”اللہ اکبر“۔ کہا میرے لال اب کیا دیکھا؟ کہا بابا قربی ہاشم ابو الفضل العباسؑ آ رہے ہیں۔ شبیہ پیغمبر علی اکبرؑ آ رہے ہیں۔ قاسمؑ ابن حسنؑ آ رہے ہیں۔ بابا شہزادے آ رہے ہیں۔ اب آپ نہ پوچھیں حُرّ کے دل کا کیا حال تھا یعنی حسینؑ نے یہ بھی بتا دیا کہ جو باطل چھوڑ کے حق کی طرف آئے گا، اس کے استقبال کو ہم آگے بڑھیں گے۔ ایک مرتبہ بیٹے نے کہا ”اللہ اکبر“۔ کہا کیا دیکھا؟ کہا بابا اب تو مولا خود تشریف لا رہے ہیں۔ بس یہ سننا تھا کہ حُرّ گھوڑے سے زمین پر کود پڑا۔ بیٹے سے کہا مجھے سارا دے۔ جب مولا قریب آئیں تو مجھے بتانا۔ بیٹے نے کہا بابا منزل سامنے ہے۔ جبکہ کے قدموں پر سر رکھا۔ کیا کہتا ہے حُرّ؟ سوچنے کی بات ہے۔ یہ نہیں کہا معاف کر دیجئے۔ ذرا اپنی غلطی کا احساس دیکھئے۔ حُرّ نے کہا نبیؐ کے نواسے کیا میری غلطی معاف ہو سکتی ہے؟ ایک مرتبہ حسینؑ جھکے، بازو پکڑ کے اٹھایا، سینے سے لگایا۔ فرماتے ہیں حُرّ میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔ یہ حسینؑ کا کلمہ بتاتا ہے کہ خدا صرف

نہیں کر سکتا کہ ہم کو تیرا دین نہیں پہنچا، ہم کو تیرے احکام نہیں پہنچے، ہم کو تیری مرضی نہیں معلوم ہوئی، ہم کو کسی نے یہ نہیں بتایا کہ پیدا کر کے تو ہم سے کیا چاہتا ہے، ہمیں نہیں معلوم تھا کہ نجات کا راستہ کیا تھا، ہم کو کسی نے نہیں بتایا کہ ہم کیا کرتے جو جنت جاتے، ہمیں کسی نے نہیں بتایا کہ تم یہ نہ کرو جو کر کے ہم جہنم جا رہے ہیں۔ تو اسی لیے اللہ نے رسولوں کو بھیج کر، انبیاء کو بھیج کر اور ختی مرتبت کے ذریعے دین کو مکمل کر دیا۔

یہ تو ہوئی معاملے کی بات۔ لیکن چونکہ وہ رحمن ہے، رحیم ہے اور اس کا لطف و کرم اپنے بندوں کے اوپر ہے۔ جیسے قانون کی بات ہے کہ حکومتوں کا یہ کام ہے کہ قانون کو شائع کر دیں۔ قانون بنا کے قانون کو مشہور کر دیں اور پھر اس کے بعد جو قانون پر عمل نہ کرے، تو عمل نہ کرنے والے کو سزا دے یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ ہمیں قانون نہیں معلوم تو یہ اس کی معافی کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہر شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کا قانون معلوم کرے اور پھر اس قانون پر عمل کرے۔ اس طریقے سے ہر بندے کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اللہ کا دین معلوم کرے، اس کی مرضی معلوم کرے اور اس کی مرضی پر عمل کرے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہمیں مرضی معلوم نہیں ہے، ہمیں اللہ کا دین نہیں معلوم ہے لہذا ہم قابل معافی ہیں تو یہ قابل معافی نہیں ہے۔ قانون سے عدم واقفیت کبھی ہمارا نہیں بنتی۔ تو یہ تو معاملے کی بات ہے۔ ہم نے یہ قانون بتایا۔ ہم نے یہ قانون اخبار کے ذریعے، ریڈیو کے ذریعے، ٹی وی کے ذریعے تم تک پہنچا دیا۔ تم نے عمل نہیں کیا لہذا تمہیں سزا دیں گے۔ یہ اللہ کا کتنا بڑا رحم و کرم ہے۔ اگر ایک مسلمان تجزیہ کرے کہ وہ خالی قانون بنا کے، قانون پر عمل نہ کرنے والوں کو سزا نہیں دیتا چاہتا بلکہ چاہتا ہے کہ بندے اس کے قانون پر عمل بھی کریں اور عمل کرنے کے لیے کشش پیدا ہو جائے، کھنچاؤ پیدا ہو جائے، ایک کشش پیدا ہو جائے کہ جس کا دل ان کی طرف راغب ہو جائے اور راغب ہو کر وہ عمل کر لیں اور ہم سے جزا میں جنت حاصل کر لیں۔ یہ کتنا بڑا رحم ہے اور اس کو کون کر سکتا ہے۔ وہی جس کے دل میں محبت ہو۔ اللہ بھی بندوں سے محبت کرتا ہے اور بندے سے بھی یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے اللہ سے محبت رکھے۔

چوتھی مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل لا استلکم علیہ اجرا الا المودة فی القربی
برادران ملت!

خداوند کریم قرآن مجید میں ارشاد فرما رہا ہے کہ ”میرے حبیب! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقرباء ہیں ان سے محبت رکھو مروت رکھو۔“

اس آیت کے ذیل میں محفل مرتضیٰ کے عشرہ اول میں جو گفتگو ”محبت اہل بیت“ کے موضوع پر جاری ہوئی وہ کل اس منزل تک پہنچی تھی کہ محبت کشش کا نام ہے اور کشش ہی پر نظام کائنات اللہ نے معین فرمایا ہے۔ آج کی سائنس، آج کی تحقیقات اس کائنات کی بقاء اور اس کائنات کے وجود کے لیے جس چیز کے قائل ہیں وہ ہے کشش۔ وہ لگاؤ ہے، ایک ستارے کا دوسرے ستارے سے اور اسی پر نظام افلاک اور نظام شمسی چل رہے ہیں۔ دین میں بھی اللہ نے اس بات کی ضرورت سمجھی کہ جہاں ہم نے اپنے بندوں کو عبادات کا حکم دیا ہے، جہاں ہم نے اپنے بندوں کے سامنے اپنے رسول کے ذریعے اپنے دین کو پیش کیا تو ہمارا فرض تو ادا ہو گیا ہے کہ کوئی بندہ قیامت میں یہ شکایت

کو ضائع کریں، پھیلیں، کودیں، نہیں، بولیں اور جب ماں باپ ان کو پڑھنے کو کہتے ہیں، اسکول بھیجنے کو کہتے ہیں، ٹیوٹر رکھ کر ٹیوشن کرنے کو کہتے ہیں تو انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ماں باپ بڑے ظالم ہیں، بہت ظلم کر رہے ہیں ہمارے اوپر اور ہمارے اوپر یہ بہت تشدد ہے۔ دیکھیے صبح ہی صبح اٹھا دیتے ہیں، پھر منٹا دیتے ہیں، پھر پکڑے بدلا دیتے ہیں، ناشتہ کرا کے فوراً اسکول یا کالج بھیج دیتے ہیں۔ وہاں سے مرے کچے آتے ہیں تو پھر کچھ کھلا پلا کر ٹیوٹر آجاتا ہے اور وہ پڑھانے لگتا ہے۔ ہر بچہ بچپن میں یہ محسوس کرتا ہے کہ ہمارے ماں باپ ہم پر حد سے زیادہ ظلم کیے ہوئے ہیں۔ لیکن جب اسی کے نتیجے میں وہ کسی اچھی کرسی پر بیٹھتا ہے، اچھے عہدے پر بیٹھتا ہے، ہزاروں کی پگڑاس کی ہوتی ہے، کار ملتی ہے، بنگلہ ملتا ہے، چوکیدار ملتا ہے، تو اسے یاد آتا ہے کہ اگر ماں باپ نے وہ محنت ہمارے ساتھ نہ کی ہوتی تو آج یہ عہدہ ہمیں نصیب نہ ہوا ہوتا۔ تو جس طریقے سے بچے کی سمجھ میں ملازمت ملنے کے بعد آتا ہے، انسانوں کی بھی سمجھ میں جنت میں آئے گا کہ اللہ نے ہم پر ظلم نہیں کیا تھا، پانچ وقت کی نماز پڑھو، مینے بھر کا فائدہ دلا، ہم پر ظلم نہیں کیا تھا اور ہم کو دیندار اور ایماندار بنانے کے ہمارے ساتھ ظلم نہیں کیا تھا۔ اگر ہم دین اسلام پر عمل نہ کیے ہوتے تو آج جنت کا چین نہ اٹھا رہے ہوتے۔ صلوٰۃ

آپ کو معلوم ہے ہر انسان کی زندگی تین زمانوں سے گزرتی ہے۔ ایک کا نام ہے ماضی، ایک کا نام ہے حال، ایک کا نام ہے مستقبل۔ تو انسان پڑھا لکھا، تعلیم یافتہ، سمجھدار وہی سمجھا جاتا ہے جو حال پر انحصار نہ کرے بلکہ اپنے حال کو صرف کرے، اپنے مستقبل کو بنانے کے لیے اور اپنے سامنے اپنے ماضی کو پیش نظر رکھے۔ وہی لوگ دنیا میں ترقی کرتے ہیں۔ تو جب فلسفہ حیات یہ ہے کہ جو ماضی کو بھول جائے گا وہ بھی ترقی نہ کر پائے گا، جو حال کو صرف نہیں کر پائے گا وہ بھی ترقی نہ کر پائے گا، جس کے سامنے مستقبل کی پلاننگ نہیں ہوگی وہ بھی ترقی نہیں کر پائے گا۔ اسی طریقے سے جنت کو سمجھ لیجئے۔ انتہائی ترقی نجات پانا ہے۔ مذہب کی انتہائی ترقی جنت میں چلا جانا ہے۔ تو اس میں ماضی بھی ضروری ہے، حال بھی ضروری ہے اور مستقبل بھی ضروری ہے۔ ہم جو یہ مجلسیں کرتے ہیں، یہ مذہبی اجتماع ہوتے ہیں، یہ محرم آتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں آپ ماضی کا اتنا کیوں ذکر کرتے ہیں؟ بغیر ماضی کا ذکر کیے ہوئے حال کا تعین ہو ہی نہیں سکتا۔ مستقبل

آپ دیکھیں کہ پرورش میں، انسان بننے میں اور انسانیت کے صحیح جاووں پر، صحیح راستوں پر چلنے میں کتنی محبت کی کارفرمائی ہے یعنی خداوند عالم نے جو انسانوں کو خلق کیا تو آسمان سے نہیں انسان آگئے، آسمان سے نہیں ٹپک پڑے انسان بلکہ اس نے ایک سسٹم رکھا، ایک میٹھ رکھا، ایک ذریعہ رکھا، جس سے نسل بعد نسل ہم اور آپ اس دنیا میں آتے جاتے ہیں۔ تو اس نے ذریعہ بنایا ماں باپ کو۔ ماں باپ کو اللہ نے انسان کے عالم وجود میں آنے کا ذریعہ بنایا۔ تو جب ماں باپ کو اس نے ذریعہ قرار دیا، وسیلہ قرار دیا، نسل بشری کے لیے، تو اس نے کتنے حقوق ماں باپ کے اولاد پر معین کر دیئے اور اولاد کے دل میں ماں باپ کی محبت ڈال دی اور ماں باپ کے دل میں اولاد کی محبت ڈال دی۔ آج جو یہ مجمع ہمارے سامنے ہے یا کائنات میں جو بھی انسان، انسانیت سے ہکتا رہے، اس کا کیریکٹر ہے یا ترقی یافتہ ہے یا اس نے ترقی کی ہے، یہ دین ہے ماں باپ کی تربیت کی، یہ دین ہے ماں باپ کے سمجھانے کی، لکھانے پڑھانے کی۔ اگر ماں باپ توجہ نہیں کرتے ہیں، اولاد کبھی صحیح نہیں نکلتی ہے اور اگر ماں باپ پوری توجہ کرتے ہیں، پلاننگ کرتے ہیں اپنی اولاد کے لیے۔ کون سی فیملی ایسی ہے، کون سے ماں باپ ایسے ہیں جو اولاد کے لیے پلان نہیں رکھتے۔ پہلی فکر ہر ماں باپ کو یہی ہوتی ہے کہ ہم اپنے لڑکے کو کیا پڑھائیں، کس لائن میں بھیجیں، کون سی تعلیم اس کو دیں۔ اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہیں، اس کے مزاج کو دیکھتے ہیں، اس کے رجحانات کو دیکھتے ہیں اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرتے ہیں، طے کرتے ہیں۔ نہیں طے کر پاتے تو لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ ذرا میرے بچے سے بات کر کے دیکھیے۔ اس کو ہم میڈیکل سائنس پڑھوائیں، اس کو کیا بنائیں؟ وکیل بنائیں، ڈاکٹر بنائیں، انجینئر بنائیں۔ تو آپ ماں باپ ہو کے ایک اولاد کے لیے اتنی فکر رکھتے ہیں تو جو خالق کائنات ہے، کیا اسے اپنے انسانوں کے لیے فکر نہیں ہوگی، کہ ہم نے جن کو پیدا کیا ہے۔ تو یہ پیدا ہو کے کیا بنیں گے۔ ماں باپ کو فکر ہے اور ماں باپ ہی کی تعلیم اور ماں باپ ہی کی تربیت کا اثر ہوتا ہے جو انسان دنیا میں ترقی کرتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں پلاننگ۔ جب یہ پلاننگ ہوتی ہے تو ماں باپ بچپن سے سمجھاتے رہتے ہیں۔ بچپن کا کسے کہتے ہیں؟ جو Unmature (غیر پختہ) ہے، شعور جس کا بلند نہیں ہوتا، شعور اس کا پختہ نہیں ہوتا۔ تو بچے کا کیا جی چاہتا ہے۔ زیادہ تر بچوں کا جی چاہتا ہے وقت

کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترقی کے کتے ہیں، بلندی کے کتے ہیں؟ مادیات کا قانون یہ ہے کہ اگر انسان نے ترقی کی ہے، دولت اس کے پاس موجود ہے، مال اس کے پاس موجود ہے اور گھر میں کھانے کو اس کے پاس موجود ہے۔ تو پھر اسے دنیا میں کچھ نہیں چاہیے۔ مگر یہ ایک عجیب و غریب بات ہم نے دیکھی کہ مطمئن کیس سے نہیں ہوتا۔ میں غریب آدمی ہوں، مزدور آدمی ہوں، دولت میرے پاس نہیں ہے۔ جب میرے پاس دولت نہیں ہے، پریشان ہوں۔ تو چوبیس گھنٹے میرے دماغ میں یہ بات گھومتی رہتی ہے۔ آپ کے یہاں کھانا کھانے گیا۔ آپ کی کوٹھی دیکھی، جی چاہا میری بھی کوٹھی ایسی ہوتی۔ آپ کے یہاں کاش دیکھا، جی چاہا کاش میرے یہاں کا بھی فرنیچر ایسا ہوتا۔ آپ کے یہاں ڈزینیل پر طرح طرح کے کھانے دیکھے، جی چاہا ہمارے گھر بھی ایسا خانسامہ مل جائے جو ایسے ہی لذیذ کھانے پکائے۔ کراکری دیکھی، یہ کراکری آپ کہاں سے لائے؟ جاپان سے لائے۔ اب فکر لگ گئی کہ جاپان جانیں، ایسی کراکری لے کے آئیں۔ اور نہیں ہے تو بھیک مانگنے لگے۔ بھیا آپ جارہے ہیں جاپان، ہمارے لیے لیتے آئیے گا۔ اتنا شوق بڑھا باہر کی اشیاء کا کہ اگر حاجی بھی چلا تو دوا کی دعا نہ کی۔ یہ کیا چیز ہے؟ ایک دوسرے کو دیکھ کر لالچ پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ نہیں؟ تو جب ہم دنیا میں ترقی یافتہ انسانوں کو دیکھ کے وہی سب کچھ اپنے لیے چاہتے ہیں، تو اگر دنیا میں دولت ہی کے نمونے ہوتے اور جنت کے نمونے نہ ہوتے، تو ہم خدا سے کہتے کہ ٹی وی تو ہم نے اس لیے خریدا کہ جس گھر میں گئے ٹی وی دیکھا۔ ہم نے فرنیچر تو اس لیے خریدا کہ جس گھر میں گئے فرنیچر دیکھا۔ ہم نے تو دولت اس لیے جمع کی کہ جس گھر میں گئے دولت جمع ہوتے دیکھی۔ تیرے جنتی تو ہمیں دکھائی نہ دیئے کہیں۔ تو اس لیے اس نے اہل بیتؑ کو زمین پر بھیج دیا۔ انہیں بھی دیکھ لو۔ بجائے فانی دولت کی لالچ کرنے کے، ذرا ان کی عظمت کو بھی دیکھ لو۔ ان کے گھر میں ایئر کنڈیشن نہیں ہے مگر جدھر سے گزر جاتے ہیں، ہوا سرد ہو جاتی ہے۔ ان کے پاس سولر سسٹم کے لیے کوئی سامان نہیں ہے مگر انہیں اس کی پروا بھی نہیں ہے۔ یہ ہمارے وہ بندے ہیں جو جنتی نہیں ہیں، مالکان جنت ہیں۔ اور ہم نے ان کو جب بھیجا ہے تو تم دیکھ لو گے کہ کروڑ پتی بھی ہو گا تو ان کی ڈیوڑھی پر سر

کا پلان بن ہی نہیں سکتا۔ یہ جو اہل بیتؑ کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ جو کرلا کا المیہ سنایا جاتا ہے۔ یہ کوئی کسٹم نہیں ہے۔ یہ اپنے تابدہ ماضی کا تذکرہ ہے، یہ اپنے اس دور کا تذکرہ ہے جس کو سن کر نوجوان سوچتا ہے، اللہ اللہ ایسے بھی اللہ کی بندے گزرے جو پیاس میں بھی نماز پڑھتے رہے، بھوک میں بھی نماز پڑھتے رہے، شمشیر کے نیچے بھی نماز پڑھتے رہے۔ ہم کیسے بندے ہیں کہ ایئر کنڈیشن میں بھی رہ کر نماز نہیں پڑھ پاتے۔

میں نے عرض کیا جس کی زندگی اچھی ہوتی ہے، جو اچھے گھر کے بچے ہوتے ہیں، وہ سوچتے ہیں ہم میں کمی کیا ہے، ہمارے والد سیٹ ہیں، ہمارے والد لکھ پتی ہیں، ہمارے والد کے پاس بنگلہ ہے، ہر کمرہ ایئر کنڈیشن ہے، ہمارے لیے کار ہے، ڈرائیور ہے، ہمارا اسکول بھی ایئر کنڈیشن ہے، ہر سہولت ہمیں حاصل ہے۔ اور ہمیں دنیا میں کرنا ہی کیا ہے؟ سوچتا ہے۔ بچے کی نفسیات ہے کہ نہیں! ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کو تو سب کچھ حاصل ہے۔ اب جو حاصل ہے، اس سے زیادہ ہم کو اور چاہیے کیا ہے۔ تو میں یہ کہتا ہوں، یہ کتنے دن ہے؟ گھر ایئر کنڈیشن ہے، کار ایئر کنڈیشن ہے، ساری چیزیں حاصل ہیں۔ لیکن کسی کی قبر تو ایئر کنڈیشن نہیں ہوتی؟ کروڑ پتی اٹھ گئے دنیا سے، ہم نے نہیں سنا کسی نے قبر میں ایئر کنڈیشن لگوا یا ہو۔ قبر تو وہی تاریک ہوتی ہے۔ ایک غریب مزدور مرتا ہے تو وہی ہی قبر یا تا ہے اور کروڑ پتی مرتا ہے تو وہی ہی قبر یا تا ہے۔ محشر کے میدان میں تو ایئر کنڈیشن کار نہیں ہوگی۔ محشر کے میدان میں تو کوئی ایئر کنڈیشن میسر نہیں ہو گا کہ یہ بڑی کیونٹی کے پیسے والے لوگ ہیں۔ ان کو اللہ نے کما ایئر کنڈیشن میں رکھو۔ میں ایک جملہ کہتا ہوں۔ ہم سڑک پر رہنے والے، ہم فٹ پاتھ پر سونے والے، ہم دن بھر مزدوری کر کے پتھر توڑنے والے، تو کچھ دیر محشر کی گرمی برداشت بھی کر لیں گے کیونکہ دھوپ کی عادت ہے۔ لیکن سدا جن کی زندگی ایئر کنڈیشن میں گزرتی ہے، میدان محشر میں پیر کیسے رکھا جائے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ماضی اور حال کو دیکھ کے ہمیں اپنے مستقبل کا تحفظ ضروری ہے۔ یعنی مذہب کو اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔ مذہب کو اس طرح نہیں سمجھا چاہیے کہ کوئی پابندی ہے، کوئی دباؤ ہے۔ اللہ کو کوئی دباؤ چاہیے، اللہ کو اپنی تعریف چاہیے؟ اسلام میں جو کچھ ہے وہ ہمارے فائدے کے لیے ہے۔ اور جو کچھ حرام ہے وہ ہم کو نقصان سے بچانے کے لیے ہے۔ خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہے، خدا

رسولؐ کا فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر ہم بچپن پاک کی اطاعت کریں گے اور ان کی زندگی کو نمونہ حیات بنائیں گے۔ تو ہزاروں چیزیں ایسی ہیں اور ہزاروں شکوک اور ہزاروں شبہات ایسے ہیں جو ہم تک آنے ہی نہ پائیں گے۔ اور ہم کو حصول نجات ہو جائے گا۔ اس لیے اہل بیتؑ کی محبت کو واجب قرار دیا۔ اجر رسالتؐ کے طور پر بنا کے واجب قرار دیا تاکہ ہر مسلمان ان سے جب محبت کرے گا، ان سے عشق کرے گا، ان سے شغف رکھے گا، ان سے انس رکھے گا، ان سے مودت رکھے گا، تو خود بخود اس راستے پر چلنے لگے گا جسے صراط مستقیم کہتے ہیں۔ صلوٰۃ

ماں باپ کو تعلیم و تربیت کے لیے اللہ نے متعین کیا اولاد پر بیس سے تو میں نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم کا انتظام کریں، اپنی اولاد کی تربیت کا انتظام کریں۔ تو جب ہم تعلیم و تربیت دیتے ہیں تو اس میں کیا سوچتے ہیں؟ (اور یہ میں نے ہمیشہ عرض کیا کہ آپ کے یہاں کے حالات کا اندازہ نہیں۔ میں تو ہندوستان سے آتا ہوں۔ میں اپنے ہندوستان کے حالات پڑھتا ہوں۔ اس میں سیفی یہ ہے کہ آپ میں کسی کو شبہ نہ ہوگا کہ ہم پر پڑھا اور جن پر پڑھا وہ یہاں ہیں ہی نہیں۔ انہوں نے سنا نہیں۔ تو لہذا مثال کی منزل میں احتیاط لازمی ہے۔) وہ مستقبل کی پلاننگ کیا ہوتی ہے؟ اگر مجھے ہندوستان میں اپنے لڑکے کو ہندوستان ہی میں رکھنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مستقبل ہندوستان ہی سے وابستہ رہے، تو میں اس تعلیم پر زور دوں گا جو ہندوستان کی آب و ہوا اور فضا میں اس کی ترقی کا سبب بنے گی۔ مثلاً زبان ہی کا مسئلہ لے لیجئے۔ میں اگر چاہوں گا کہ میرا بچہ ہندوستان میں کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچے تو میں اس پر زور دوں گا، بیٹا ہندی پڑھنا اور ہندی میں ماسٹری پیدا کرنا۔ خوب اچھے طریقے سے سنسکرت، ہندی پڑھنا۔ جتنی ہندی میں قابلیت ہوگی، اتنی ہی ترقی کرو گے۔ لیکن اگر میرے دماغ میں یہ پلان ہو کہ میں آئندہ اس بچے کو پاکستان بھیج دوں گا (جیسے زیادہ تر باپ سوچا کرتے ہیں) تو میں اس کو پاکستان بھیجوں گا تو میری رائے بدل جائے گی۔ تو میں کہوں گا بیٹا اردو بھی پڑھ لو اور اردو میں ماسٹری پیدا کر لو کیونکہ پاکستان جارہے ہو، وہاں یہ ہندی و ہندی نہیں چلے گی۔ وہاں اچھی اردو ہوگی، جب ترقی کر سکو گے۔ وہاں جا کے ہندی بو گے تو کسی انٹرویو میں لیے بھی نہیں جاؤ گے۔ بدل گئی

جھکانے میں فخر محسوس کرے گا۔ فقیر بھی ہوگا تو ان کے ہاتھ سے پانے میں فخر محسوس کرے گا۔ حد یہ ہے کہ ہر ایک مانگتا ہے اس چیز کو جس کی اسے خواہش ہوتی ہے مگر یہ وہ دروازہ ہے، یہ وہ ڈیوڑھی ہے کہ جن کو میں نے بھوک نہیں دی، جن کو میں نے پیٹ نہیں دیا، جن کو میں نے روٹی کی حاجت نہیں دی مگر انہیں بھی تمنا رہی کہ اس در سے کچھ مانگ لیں۔ چنانچہ فرشتے روٹیاں مانگتے گئے اس ڈیوڑھی پر۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس لیے چونکہ محبت ایک ذریعہ ہے۔ محبت پیدا ہوتی ہے ایک دوسرے کو دیکھ کے، ایک دوسرے کی زندگی کو دیکھ کے، ایک دوسرے کے حالات کو دیکھ کے، انسان نقل کرنا چاہتا ہے۔ لہذا جنت کے نمونے بھی دنیا میں بھیج دیئے اللہ نے۔ یہ ہیں مالکان جنت۔ دیکھو یہ ہیں جنت کے لوگ۔ ان کی زندگی دیکھو، ان کا عمل دیکھو، ان کا طریقہ دیکھو، ان کا انداز گفتگو دیکھو، ان کا رہن سہن دیکھو، ان کا کھانا پانی دیکھو۔ جب یہ ہم نے کہا، تو لوگ کہتے ہیں بات صحیح ہے، ہاں فقہد درست ہے مگر کہاں وہ کہاں ہم۔ دیکھیے ایک نعرہ ہے، ٹھیک ہے رسول اللہؐ کا کیا کہنا مگر جناب کہاں رسول اللہؐ کہاں ہم! بہت صحیح، آپ نے بیان کیا حضرت علیؑ مولائے کائنات تھے اور کیا کہنا ان کا اور کیا ان کی زندگی تھی۔ سبحان اللہ ہمارے جان قربان۔ لیکن کہاں ہم اور کہاں وہ۔ حسنینؑ کیا شہزادے تھے، جنت کے مالک تھے، سردارانِ جوانانِ جنت تھے، نبیؐ کے نواسے تھے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ لیکن جناب کہاں وہ اور کہاں ہم۔ توجہ کیجئے گا ہماری مائیں اور بہنیں کتنی ہیں۔ بی بی، شہزادی کوئین، معصومہ عالم، رسولؐ کی اکلوتی بیٹی۔ کیا کہنا بی بی فاطمہؑ کا۔ مگر ہم کیسے پیروی کریں؟ کہاں وہ کہاں ہم۔ اور اس کے بعد جب قیامت میں پہنچے معبود جنت میں بھیج دے۔ جانتے ہو جنت میں کون ہے؟ میرا رسولؐ ہے، میرا ولی علیؑ ہے، سردارانِ جوانانِ جنت حسنینؑ، ان کی مادر گرامی فاطمہ الزہراؑ ہیں۔ ہاں ہاں ہمیں معلوم ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہے ہیں ہمیں بھی وہیں بھیجے۔ تو خدا کے گا کہاں وہ کہاں تم۔ صلوٰۃ

یہ فکر کرنے کی بات ہے۔ محبت کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کی پیروی کرنے کی کوشش کریں۔ ان کے راستے پر چلنے کی کوشش کریں۔ یہ نہیں کہ دس ہزار آدمی رسولؐ کی پیروی کریں مگر تباہی از رسالت میں کچھ اضافہ ہو جائے گا۔ یہ دس ہزار کا فائدہ ہوگا۔

ہیں، بھی 'نالج'، 'نالج' ہے۔ چاہے آپ آرٹس حاصل کریں، چاہے سائنس حاصل کریں۔ انجینئرز کی کی ہوئی، جس کو دیکھو انجینئر ہوا جا رہا ہے۔ ڈاکٹروں کی کی ہوئی، جس کو دیکھو وہ ڈاکٹر ہوا جا رہا ہے۔ یعنی علم برائے علم نہیں حاصل کیا جاتا۔ علم برائے مستقبل حاصل کیا جاتا ہے کہ کس بات میں مستقبل روشن ہے۔ تو جب ہر ماں باپ کو اپنے نوجوان بیٹے کے لیے فکر ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا تو اللہ کو بھی یہ فکر ہے کہ میرے بندوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ تو آپ بتائیں آج ہندوستان میں جگہ جگہ اور خصوصاً مسلم کالجز میں، عربک کے، عربی کے، انٹینیوٹ کھلے ہوئے ہیں، کلاسز کھلی ہوئی ہیں۔ آپ سڑک پر سے گزریں تو بورڈ لگے ہیں کہ یہاں عربی کی کوچنگ ہوتی ہے، عربی بولنا سکھایا جاتا ہے یعنی آج گلف میں پیسہ ہوا، نوکریاں ملیں، تو مسلمان عربی پڑھنے لگا۔ تو مستقبل دوہنی تک ہے، مستقبل ابوظہبی تک ہے، مستقبل سعودیہ تک ہے کیونکہ اللہ کو جنت کا مستقبل منظور تھا، اسی لیے عربی میں قرآن نازل کیا کہ عربی پڑھو۔ جہاں جانا ہے وہاں کی زبان یہ ہے۔ تو نوجوان بحث کرتا تھا ہم صاحب پاکستان میں رہتے ہیں، عربی کیوں پڑھیں؟ ہم انڈیا میں رہتے ہیں، عربی کیوں پڑھیں؟ قرآن عربی میں کیوں ہے؟ ہم نماز کا ترجمہ کر کے کیوں نہ پڑھیں؟ یہ بھی تو لوگ بحث اٹھاتے ہیں کہ ہم عربی میں نماز کیوں پڑھیں؟ انگلش میں کیوں نہ پڑھیں؟ ٹھیک ہے بھی ملک ملک کی زبان ہے۔ آپ ترجمہ سے اپنی نوکری نہیں چلا سکتے تو خدا کی عبادت کما چلا سکتے ہیں۔ یعنی میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ جہاں مفاد دنیا ہے وہاں کوئی بحث نہیں ہے۔ جہاں مفاد آخرت ہے وہاں ہزار طرح کی بحثیں ہیں۔ اب آپ اس چیز کو دیکھیں کہ چونکہ ماں باپ پلاننگ کرتے ہیں، ماں باپ مشقت کرتے ہیں، ماں باپ اولاد پر پیسہ صرف کرتے ہیں، تو اللہ نے کتنا حق ماں باپ کا رکھا، یہاں تک کہ دیا کہ دیکھو تمہاری ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ یہ آپ نے سنا ہوگا۔ مرزا دہیر نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔

زیہ قدم مادر فردوس بریں ہے

کوئی بندہ میرا لنتا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، لیکن اگر اس نے اپنے ماں باپ کی اطاعت کی ہے تو مجھے شرم آئے گی کہ میں اسے جہنم میں ڈال دوں۔ اور اگر کسی بندے نے میری لیے اتنا عبادت و اطاعت کی ہو اور اپنے ماں باپ کی اطاعت کی ہو تو میری

نارائے۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندی اردو کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کہاں بھیجتا ہے، اس لیے وہ زبان سکھائیں جو اس ملک کی زبان ہے۔ اور اگر اسے مجھے یورپ بھیجتا ہے تو ہندی نہ اردو، فائدہ کیا وقت ضائع کرنے سے۔ کہاں ہندی پر زور دے رہے ہو۔ کوئی ہندوستان میں تمہیں رہنا ہے۔ کہا کیوں اردو پڑھ رہے ہو۔ کوئی تم کو پاکستان جانا ہے۔ تم کو تو یورپ میں نوکری کرنا ہے، یورپ میں رہنا ہے، اپنی انگلش ٹھیک کرو۔ 'نالج' نالج ہے، میں زبان کی بات کر رہا ہوں۔ تو کوشش یہ ہوگی کہ یہ انگریزی جان جائے۔ اچھی انگریزی بولے، ایکشن بھی انگلش ہوں اور اس کی گرامر بھی ٹھیک ہو اور انگلش بھی ماڈرن بولو۔ اور ان سے جا کے پڑھو، ان سے جا کے سیکھو کیونکہ یورپ میں رہنا ہے اور اگر میری پلاننگ ہو اپنے لڑکے کو عرب میں رکھنے کی تو میں کہوں گا بیٹا نہ انگلش نہ ہندی نہ اردو، عربی سیکھو۔ تو اگر تمہیں دوہنی جانا ہے، بحرین جانا ہے۔ کس کے دماغ میں ہوا نہیں وہاں جانے کی۔ میں نے علامات ظہور میں ایک بات پڑھی تھی اور حیرت کرتا تھا۔ ایمان ہے جو مولانا نے کہا ہے، صحیح کہا ہے مگر حیرت تھی۔ علامات ظہور میں یہ تھا کہ جب قیامت کا زمانہ قریب ہوگا، اس کی جو علامتیں چھٹے امامؑ نے بتائی ہیں، اس میں ایک یہ بھی بتائی ہے کہ بیٹے باپ سے دور ہوں گے اور باپ کو اس بات پر مسرت ہوگی کہ ہمارا بیٹا ہم سے چھٹ گیا۔ تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ باپوں کو کیا ہو جائے گا۔ لیکن جب سے گلف کی نوکریاں شروع ہوئیں تو ہم نے ہندوستان میں دیکھا، ہر باپ خوش ہو کے کتا ہے ہمارا لڑکا سعودیہ میں ہے۔ ماشاء اللہ سے ہمارا لڑکا کویت میں ہے یعنی بیٹا باپ سے جدا ہو گیا۔ وہ خوش ہو رہے ہیں۔ کیوں خوش ہو رہے ہیں؟ پکار زیادہ ہے، تنخواہ زیادہ ہے۔ وہاں سے بھیج رہا ہے۔ ہم بھی مزے میں ہیں، وہ بھی مزے میں ہے۔ تو یہ علامت ہے کہ نہیں ہے؟ تو پلاننگ کیا ہوتی ہے کہ جہاں بھیجتا ہے وہاں کی زبان سیکھے۔

آج آپ دیکھیں کہ نالج کو لوگ کہتے ہیں۔ نالج، نالج۔ ہم نے تو کہیں نہیں دیکھا عرصے سے کہ کوئی نالج حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔ یونیورسٹیوں میں کبھی انکناکس میں جگہ نہیں مل رہی ہے، کبھی کامرس میں جگہ نہیں مل رہی ہے، کبھی سائنس میں جگہ نہیں مل رہی ہے۔ جس چیز کی ڈگری لینے پر جلدی نوکری ملتی ہے، بس وہی پڑھنے لگتے

آئی۔ تو علم اس کو نہیں کہتے ہیں کہ جب اپنے اوپر پڑے تب سمجھ میں آئے۔ علم اس کو کہتے ہیں کہ دوسرے پر پڑے اور اپنا راستہ خود سمجھ لے۔ ضروری نہیں کہ خود بنکے تو صراطِ مستقیم حاصل کر کے، دوسرے بنکے ہوؤں کا انجام دیکھ کر صراطِ مستقیم کو حاصل کر لے۔ تو جو ماں باپ کے حقوق اسلام نے عین کیے ہیں اور لوگ فراموش کرتے ہیں کہ حقوق والدین بیان کیجئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مجالس میں، محافل میں، تقریروں میں، سیرت کے جلسوں میں ماں باپ کا حق بیان کیا جائے گا تو اس میں بچت ہے مستقبل کی، نئی نسل کی۔ بس یہی میرا تجزیہ ہے۔ کیا کہنا رسول اللہ کا۔ وصال سے پہلے کہہ گئے ”میں اور علی امت کے باپ ہیں۔“ توجہ چاہ رہا ہوں۔ حدیث موجود ہے فرمایا کہ ”میں اور علی امت کے باپ ہیں۔“ تو جب فرمایا کہ میں اور علی امت کے باپ ہیں تو اب سوچئے۔ جب آپ باپ بنے تو آپ کو فکر ہوئی کہ آپ کا حق بیان کیا جائے۔ تو حق نئی کیوں نہ بیان کیا جائے۔ حق علی کیوں نہ بیان کیا جائے۔ وہ تو پوری امت کے باپ ہیں۔ یا رسول اللہ اپنے کو باپ کہئے، علی کو کیوں کہہ رہے ہیں؟ اگر علی کو ساتھ باپ نہ بنا گئے ہوتے تو نبی کے مرنے کے بعد امت یتیم ہو گئی ہوتی۔ صلوٰۃ

کیا مطلب ہے کہ میں اور علی امت کے باپ ہیں؟ یعنی دو انسی ٹوئس بنائے ہیں، نبوت اور امامت۔ جیسے باپ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھتا ہے۔ اسی طرح سے نبوت و امامت انسان کی انسانیت اور اس کی تربیت و تعلیم کا خیال رکھنے والی ہے۔ اور یہ یاد رکھنا کہ جب باپ کا درجہ کسی کو حاصل ہوگا، تو محبت لازمی شے ہو جائے گی۔ اسی لیے جن کو باپ بنایا ان کی محبت کو اجر رسالت میں طلب کر لیا تاکہ اس محبت کی وجہ سے کیونکہ اطاعت کا درجہ محبت ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اولاد کے دل میں باپ کی محبت نہ ہو تو باپ سے کچھ نہیں سیکھ سکتی اولاد۔ اس لیے کہ خالی سزا کبھی اصلاح نہیں کرتی بلکہ سزا سے زیادہ محبت۔ آپ کو معلوم ہے وہ پرانا طریقہ تھا۔ جب اسکول میں نیچر داخل ہوتا تھا ہمارے بچے میں، تو اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا ضرور ہوتا تھا، ایک چھڑی ضرور ہوتی تھی یعنی مار مار کے پڑھاتا تھا، مار مار کے پڑھایا کرتا تھا۔ نوجوان کو خبر نہیں ہے۔ ہمارے سن کے لوگ جانتے ہیں اور بعض استاد تو ایسے تھے کہ نہ خطا پوچھی، نہ کچھ پوچھا، آتے ہی پہلے کلاس میں جڑ دیا ایک ایک سب کو۔ پوچھا صاحب کیوں مارا؟ کہا مرعوب

اسے جنت میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔ لوگ کہتے ہیں، حجت کی بات ہے ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ باپ کو نہیں مانتے، تو جنت کیوں رک گئی؟ سیدھی سی بات ہے۔ باپ ذریعہ ہے قریب ترین خلقت کا۔ خدا بھی سبب ہے۔ سبب وہی ہے، خالق وہی ہے۔ سبب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ دور کا سبب اور قریب ترین سبب۔ خدا کہہ رہا ہے جب تم قریب ترین سبب کو نہیں جانتے تو تم دور کے سبب کو کہاں پہچانتے ہو گے۔ ارے جس باپ کو دیکھا اور قدر نہ کی، تو جس خدا کو نہیں دیکھا اس کی کہاں قدر کرتے ہو گے۔ یہ تو تمہارا دھوکہ ہی دھوکہ ہے، فریب ہی فریب ہے۔ تو ماں باپ کا حق دیا۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیں۔ میں ایک حدیث آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ آج حقوق والدین کی کتنی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے نہیں ملتا کوئی عشرہ پڑھنے کو، نہیں ملتی کوئی مجلس پڑھنے کو، نہیں کوئی ملک دیکھا، نہیں میں نے کوئی شر دیکھا کہ جہاں جاؤں اور ایک نہ ایک بزرگ مجھ سے یہ نہ کہئے کہ حضور ذرا حقوق والدین پر بھی پڑھئے گا۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ اولادیں آجکل ماں باپ کو لفٹ نہیں دے رہی ہیں۔ اس لیے پریشان ہیں مگر ایک بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اولاد نے باپ کو نہ مانا تو باپ کو تکلیف ہوئی اور اگر بندے خدا کو نہ مانیں گے تو خدا کے لیے کتنا سبب تکلیف ہوگا۔

اگر ہم دنیاوی فلسفے کو بچنے سے بچوں کو سمجھادیں تو نہ وہ خدا کے خلاف ہوں، نہ وہ باپ کے خلاف ہوں۔ اصل میں مستقبل کی پلاننگ کی بات ہے۔ تو باپ کی عظمت ہے، باپ کا احترام ہے اسلام میں۔ باپ کی اطاعت واجب ہے، ماں کی اطاعت واجب ہے۔ کسی کو شک ہے؟ کسی کو شک نہیں ہے۔ اس لیے کہ بات سمجھنے کا ٹائم ہوتا ہے۔ جب میں بچہ تھا اور مجھ سے کہا جاتا تھا کہ باپ بڑی چیز ہے۔ باپ کی اطاعت کرو بیٹا، باپ کا یہ حق ہے۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں آپ کو نہیں، اپنے کو کہہ رہا ہوں کہ ہر وقت باپ کی بات ماننا۔ ارے وہ بھی اللہ کے بندے، میں بھی اللہ کا بندہ۔ جو ان کا جی چاہتا ہے، وہ کرتے ہیں۔ جو ہمارا جی چاہے گا، ہم کریں گے۔ لیکن جب ٹائم گزر گیا اور باپ مر گئے اور میں خود باپ بن گیا تو وہی جی میرا چاہنے لگا۔ یعنی جب میں بیٹا تھا تو سمجھ میں نہیں آتی تھی بات۔ جب باپ بنا تو سمجھ میں آنے لگی۔ ۱۰۰ فیصد جس فلسفہ سے

کل سے نہ آئے گا۔ تو میں کبھی قدم نہیں رکھوں گا لیکن مجلس حسینؑ کا یہ عالم ہے کہ کوئے روکے بھی تو کوئی رکنے والا نہیں ہے۔ تو یہ کیا چیز ہے؟ یہ کشش ہے، یہ جاذبیت ہے، یہ وہ کھینچنے کی طاقت ہے جو کربلا کے میدان میں موجود تھی۔ ارے جس نے حر کو کھینچ لیا، اسے کائنات کو کھینچنے کتنی دیر لگتی ہے لیکن ہم میں صلاحیت باقی رہنا چاہیے۔

تو حقوق ہیں، تو جہاں ماں باپ کا حق ہے، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ احکام میت کیا ہیں؟ احکام غسل کیا ہیں؟ احکام کفن کیا ہیں؟ احکام دفن کیا ہیں؟ سوال ہے میرا، اسلام کی دامن میں تو ہر چیز موجود ہے۔ کما احکام ہیں، غسل کے بھی ہیں، کفن کے بھی ہیں۔ غسل دینا کس پر واجب ہے؟ کفن پستانا کس پر واجب ہے؟ دفن کرنا کس پر واجب ہے؟ کما یہ واجب کفائی ہے۔ واجب کفائی کسے کہتے ہیں؟ کہا جب تک میت پڑی ہے، سب پر واجب ہے۔ اور ایک نے غسل دینا شروع کیا، دوسروں پر واجب نہیں رہا۔ کفن دینا سب مسلمانوں پر واجب ہے۔ ایک کا بھی انتقال ہو جائے تو اس کو کفن دینا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ لیکن ایک آدمی کھڑا ہو گیا کفن دینے کے لیے، اب کسی پر واجب نہیں رہا۔ اس کا نام ہے واجب کفائی۔ اسی طریقے سے قبر کھودنا، میت کو دفن کرنا، کسی ایک پر واجب نہیں ہے، سب پر واجب ہے۔ لیکن اگر ایک آدمی کھڑا ہو گیا تو اب دوسروں پر واجب نہیں رہا۔ کیا مطلب ہے؟ اسلام کا مقصد ہے کہ ایک کام ہونا ضروری ہے، وہ ہو جائے۔ اگر کسی ایک پر واجب قرار دے دیا گیا تو دوسرے کہیں گے ہم سے کیا مطلب ہے۔ یعنی ایسا بھی واجب ہوتا ہے جو سب پر ہو۔ لیکن نماز؟ تو کما ہمارے ابا تو پڑھتے ہی ہیں۔ گھر بھر کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو کما ارے صاحب نماز تو واجب کفائی نہیں ہے، واجب عینی ہے۔ واجب عینی کا کیا مطلب ہے؟ گھر میں جتنے بالغ ہیں سب کو پڑھنا پڑے گی۔ تو واجب واجب میں فرق ہوتا ہے۔ کیوں؟ وہ واجب کفائی اس لیے ہے کہ میت پڑی نہ رہ جائے اور یہ واجب عینی اس لیے ہے کہ اطاعت الہی کا اظہار ہو جائے۔ تو اب ان دو کے فرق کو سمجھے بغیر اگر کوئی بحث کرے گا تو کبھی اسلام پر بحث نہیں کر سکتا۔ اب آپ اسی طریقے سے ملاحظہ فرمائیں کہ میت پڑی نہ رہ جائے۔ سب پر واجب ہے۔ اور ایک نے غسل دیا تو دوسروں پر واجب نہیں رہا۔ تو اسی طریقے سے گریہ و بکا، مرنے والے کی آخری رسوم ادا کرنا تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔

ہو جائیں تاکہ ٹھیک سے پڑھیں۔ تو یہ پرانا طریقہ تھا کہ ڈنڈے سے ٹھیک کیا جائے۔ نیا طریقہ یہ نہیں ہے۔ آج تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ یار سے ہاتھ، محبت سے ہاتھ، اور اپنے طالب علم کی توجہ اپنی طرف مبذول کراؤ۔ ایسی باتیں کرو کہ اس کو تم سے محبت پیدا ہو اور وہ تمہاری بات سنے اور تمہاری بات یاد رکھے۔ تو دو طریقے ہیں ڈنڈے سے پڑھانا اور محبت سے پڑھانا۔ وہ پرانا ہو گیا، نفل ہو گیا۔ آج پیار اور محبت ذریعہ رکھا گیا۔ اسلام میں بھی دو طریقے ہیں اسلام سمجھانے کے۔ ایک تلوار لے کے نکل پڑو، ڈنڈے مار مار کر لوگوں کو اسلام سمجھاؤ۔ ایک اہل بیتؑ کی محبت مانگ کے اسلام سمجھاؤ۔ صلوٰۃ

وہ پرانا طریقہ ہے، طریقہ نیا کیوں ہے، اس لیے کہ شعور پیدا ہوا ہے۔ دنیا میں نالچ بڑھی ہے۔ نالچ کی سطح بڑھی ہے۔ تو آج علم سے بلندی اس نتیجے پہنچی کہ محبت ذریعہ تعلیم و تربیت ہے۔ شقاوت ذریعہ تعلیم و تربیت نہیں ہے۔ تو جب علم یہ بتاتا ہے کہ محبت ذریعہ تعلیم و تربیت ہے، شقاوت نہیں۔ تو شقاوت جہل تھا، محبت علم بن گئی۔ تو چونکہ اللہ مسلمان کو علم والا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے کہا کہ اجر رسالت میں کچھ نہیں چاہیے سوائے محبت اہل بیتؑ کے۔ صلوٰۃ

اور اس کا ہلکا سا فرق میں آپ کو دکھاؤں گا اگر آپ میرے الفاظ کے معنی غلط نہ نکال دیں۔ اس لیے کہ ہر سامع سے یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ نیت کے اوپر شبہ نہ کرے یعنی جب بھی کوئی کام طاقت کے ذریعے کیا جاتا ہے تو شکایت یہی رہتی ہے کہ طاقت کے ذریعے بھی کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی بات محبت سے کسی جاتی ہے تو تجربہ یہ ہے کہ محبت کی بات زیادہ اثر رکھتی ہے۔ آپ دیکھیں کیا وجہ ہے کہ زیر لب جو یہ شکایت چلی آ رہی ہے کہ اسلام اور دین کے ارکان کی بجا آوری کے سلسلے میں مجمع نظر نہیں آتا، نوجوان نظر نہیں آتے اور اسی کے ساتھ یہ شکایت بھی ہے کہ محرم میں دیکھو، ٹوٹے پڑے ہیں، مجمعے لگے جا رہے ہیں، دفتر بند کر دیا، کام چھوڑ دیا، کالج چھوڑ دیا، جس کو دیکھو دوڑا چلا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے؟ کوئی بات نہیں ہے۔ وہی ڈنڈے اور محبت کا فرق ہے۔ جہاں طاقت کے ذریعے سے Application ہے وہاں طبیعت میں انقلابی جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جہاں کسی کی محبت کھینچتی ہے وہاں بلانے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ دیکھیں کہ کیا وجہ ہے کہ اگر میں آپ کے گھر جاؤں اور آپ کہیں

کو بغیر کچھ کے بتا دیتی ہے۔ یہ پانی بند کرنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے نام پر پیاسوں کو پانی پلانے والے ہیں۔ سبیلیں کون چیز رکھواتی ہے؟ محبت۔ تعزیئے کون چیز اٹھواتی ہے؟ محبت۔ ضرر کون چیز ہنواتی ہے؟ محبت۔ تم پوچھتے ہو یہ اسلام میں کہاں ہے؟ اسلام میں اہل بیت کی محبت اجر رسالت ہے۔ یہ اظہار محبت ہے۔ اب آپ کیسے محبت ہم کو بھی ہے مگر ہم اظہار نہیں کرتے۔ تو محبت تو اظہار چاہتی ہے۔ جب اطاعت اظہار چاہتی ہے، جب عبادت اظہار چاہتی ہے، تو محبت تو اظہار چاہتی ہی ہے۔ حضور عبادت تو چھپ کے بھی ہو سکتی ہے، اطاعت تو چھپ کے بھی ہو سکتی ہے۔ مثل تو یہ مشہور ہے کہ مکہ نہیں چھپتا اور محبت نہیں چھپتی۔ یعنی جن محبتوں کو لوگ چھپانا بھی چاہتے ہیں، ان کو چھپ نہیں پاتے۔ تو محبت چھپانے کی چیز نہیں ہے۔ محبت اعلان کرنے کی چیز ہے۔ یہ ہمارا محرم، اعلان محبت اہل بیت ہے۔ اس کا مقصد اس مجمعے کا آنا خود دلیل ہے۔ آپ کو کون کھینچ لایا؟ اللہ اللہ ہم تو آئے ہیں صرف حسینؑ پر دو آنسو بہانے کے لیے۔ کھینچ کر آنے والے کیسے کیسے تھے۔ جن کو بچنے سے محبت تھی۔ رسول اللہ مدینے کی گلیوں میں جارہے ہیں۔ ایک بچے کو گود میں بٹھا لیا۔ جب سے خرے نکال کر دیئے۔ بوسہ دیا۔ اصحاب نے کہا یا رسول اللہ یہ پیار و محبت کا انداز تو ہم نے صرف حسینؑ کے ساتھ دیکھا ہے۔ کسی بچے سے آپ کی ایسی محبت نہیں دیکھی۔ اس بچے میں کیا خصوصیت ہے۔ یہ کون بچہ ہے جس سے آپ ایسا پیار کر رہے ہیں جیسا حسینؑ سے کرتے ہیں؟ تو فرمایا ”تم نے نہیں دیکھا۔ میرا حسینؑ جارہا تھا۔ یہ حسینؑ کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ حسینؑ کی خاک قدم اٹھا کر اپنے سر پر رکھ رہا تھا۔ حسینؑ سے محبت دیکھ کر مجھے پیار آگیا۔“ اس کا مطلب یہ ہے مسلمانوں آج بھی رسول اللہ حاضر و ناظر ہیں، جب آپ کو دیکھتے ہیں محرم میں روتے ہوئے، تو انہیں پیار آتا ہے کہ یہ میرے حسینؑ کے چاہنے والے ہیں، یہ میرے حسینؑ سے محبت رکھنے والے ہیں۔

ہاں آپ ملاحظہ فرمائیں۔ وہ بچہ کون تھا؟ اسی کا نام حبیب ابن مظاہر ہے۔ جو کوفہ میں تھے۔ جن کے پاس نامہ پہنچا تھا۔ اور جب نامہ بر نامہ لے کر پہنچا تو روایات میں ہے کہ حبیبؑ کھانا کھانے بیٹھے تھے، لقمہ حلق میں اٹکا۔ عرب کا دستور تھا، زوجہ سے کما کوئی مہمان آنے والا ہے۔ یا کوئی نامہ آنے والا ہے۔ ایک لمحہ گنہگار تھا کہ کسی نے

واجب ادا بھی نہیں کرتے اور اگر ہم ادا بھی کر دیتے ہیں تو اس پر ناراض بھی ہوتے ہیں۔ اس بات پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔

باپ کی خدمت، باپ کی عظمت، باپ کا یاد رکھنا، باپ کے لیے ایصال ثواب، ہر ایک کا فرض ہے کہ نہیں؟ جب سب کا فرض ہے، تو پھر امت پر فرض ہے۔ جب رسولؐ و علیؑ امت کے باپ ہیں۔ جب نبوت و امامت باپ کا درجہ رکھتی ہے۔ تو جو بھی کلمہ گو ہے اس پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ وہ آخری رسم میں شریک ہو جائے۔ تو کما صاحب یہ بات آپ کی صحیح نہیں ہے، یہ تو جب ہم کربلا میں ہوتے تب آپ ہم سے یہ بات کہتے۔ آپ نہیں تھے، مسلمان تو تھے کربلا میں، تھے کہ نہیں؟ کہا تھے۔ بیٹیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اپنے کشتہائے نجس کو دفن کیا۔ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے جنازے چھوڑ کر چلے گئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر غسل و کفن و دفن کا مسئلہ معلوم نہیں تھا تو اپنے لشکر کو دفن کیوں کیا؟ اور معلوم تھا تو حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو چھوڑ کیوں دیا؟ آپ کیسے گے وہ انہوں نے اس لیے چھوڑ دیا کہ انہوں نے انکار بیعت کیا تھا۔ تو انکار بیعت زندگی میں کیا تھا، مرنے کے بعد تو انکار کا سوال نہیں ہے۔ حبیبؑ مسلمان تو تھے، مسلم مسلمان تو تھے، زہیرؑ مسلمان تو تھے، کم سے کم مسلمان ہی سمجھ کر دفن کرتے۔ کہا، نہیں دفن کیا۔ نہ دفن کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بعض دشمنیاں ایسی ہوتی ہیں جو مرنے کے بعد تک باقی رہتی ہیں۔

ہم جو یہ رسوم عزا کرتے ہیں، تعزیئے اٹھاتے ہیں، دفن کرتے ہیں۔ اس سے ان دفن ہونے والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ صرف اس بات کا اعلان ہے کہ ہم ویسے مسلمان نہیں ہیں۔ یہ صرف ہم اپنا مسلک ظاہر کرتے ہیں کہ ہم وہ مسلمان ہیں کہ آج تعزیہ دفن کر دیتے ہیں۔ تو کل کربلا میں ہوتے تو حسینؑ کا جنازہ بھی دفن کر دیتے۔ یعنی اپنے مسلک کا اظہار ہے۔ سبیل کیا چیز ہے؟ سبیل اس لیے نہیں رکھی جاتی ہے کہ کسی کو پانی نصیب نہیں ہوگا۔ یہ بتانا ہے کہ دیکھو ہم کسی کو پیاسا نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ اب مسلمانوں کی دو کھینکریز ہو گئی ہیں۔ ایک جو پیاسے شہید ہو گئے اور دوسرے جو فرات سے پانی پیتے تھے۔ تو اگر ایک ہندو پوچھے تم کون سے مسلم ہو؟ وہ جنہوں نے حسینؑ پر پانی بند کیا تھا۔ یا وہ جو حسینؑ کے ساتھ پیاسے شہید ہوئے تھے؟ تو ہماری یہ سبیل ان

سے کہا یوں راہوار لے جانا کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ جانے میں دیر ہوئی تو دیکھا گھوڑا رو رہا ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ حبیبؑ نے کہا کیوں رو رہا ہے؟ کہا اگر امام کو آنے میں دیر ہوئی تو غلام کہہ رہا تھا میں تجھ پر بیٹھ کر چلوں گا۔ تو گریہ نہ کر۔ غلام سے کہا میں نے تجھے آزاد کیا۔ کہا سبحان اللہ آپ نبیؐ کے نواسے کی نصرت کو جائیں اور میں محروم شہادت رہ جاؤں۔ حبیبؑ ابن مظاہر چلے۔ ادھر ایک منزل پر امامؑ فروکش تھے۔ کرسی سے بلند ہوئے۔ اصحاب کی طرف دیکھا، آل محمدؐ کی طرف دیکھا، خاندان بنی ہاشمؑ کے افراد کو دیکھا، کہا اٹھو۔ کہا آقا کیا بات ہے؟ کہا میرا دوست آرہا ہے۔ اس کے استقبال کو چلتا ہے۔ خیمہ گاہ سے اٹھے۔ تھوڑی دور بڑھے تھے۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ کوئی نظر نہیں آرہا ہے کہ ایک مرتبہ کوفے کی طرف گردن موڑا رہوئی۔ جب دامن گرد چاک ہوا تو دیکھا ایک ضعیف جس کی داڑھی سفید ہے، جس کے سر کے بال سفید ہیں، جس کی کمر جھکی ہوئی ہے، جس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے ہیں، گھوڑے پر بیٹھا چلا آرہا ہے۔ کسی نے بڑھ کر آواز دی، اے گھوڑے سوار! گھوڑے کو روک لے۔ امامؑ تیرے استقبال کو آئے ہیں۔ حبیبؑ نے جو دیکھا نبیؐ کے نواسے کو، گھوڑے سے کود پڑے۔ آقاؐ آپ نے کیوں زحمت کی۔ کہا تم کوفے سے میری نصرت کے لیے آئے ہو۔ میں تمہارے استقبال کو نہ آتا۔ یہ حسین کا طریقہ مدام ہے۔

لکھا ہے اب بھی کوئی زائر جب زیارت کے لیے چلتا ہے تو کہتے ہیں بھیا عباسؑ استقبال کے لیے جاؤ۔ میرا زائر گھر سے چل رہا ہے۔ جزاء کم دیکھ۔ خدا آپ کو کسی غم میں نہ رلائے سوائے غم اہل بیتؑ کے۔ حبیبؑ پریشان ہو گئے۔ قدموں پر سر رکھا۔ آقاؐ آپ کیوں آئے؟ کہا، میرا فرض تھا کہ تمہیں لینے کے لیے آتا۔ میں عرض کروں گا حبیبؑ ابھی کہاں بے چین ہوئے ہو، ذرا خیمہ گاہ کے قریب جاؤ۔ یہ اس لیے عرض کر رہا ہوں اے حسینؑ پر رونے والوں، اے عزادار مسلمانوں، تمہیں خبر بھی ہے کہ حسینؑ کتنا احترام کرتے ہیں رونے والوں کا۔ ایک مرتبہ حبیبؑ آگے بڑھے، خیمہ گاہ کے قریب پہنچے۔ جب درود کے نعروں کی آواز خیموں میں پہنچی۔ جناب زینبؑ نے کہا فضہؑ جا، جا کہ پوچھ کون آیا، جو انصار درود پڑھ رہے ہیں؟ فضہؑ نے آگے پوچھا کون آیا ہے؟ بی بی پوچھ رہی ہیں۔ علیؑ کی بڑی بیٹی پوچھ رہی ہے۔ لوگوں نے کہا، کہہ دو بچنے کے

زنجیر در ہلائی۔ پوچھا کون؟ کہا انا ہمد العسین۔ میں حسینؑ کا نامہ برہوں۔ لقمہ رکھ دیا۔ اٹھے، آئے، نامہ لیا، آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا اور سر پر رکھا، لفافے کو چاک کیا، تو لکھا تھا امامؑ نے "اے رجل فقیہ" یعنی اے مرد فقیہ! تمہیں معلوم ہے مجھے نانا رسول اللہؐ سے کیا قرابت ہے۔ اس وقت لوگ میری دشمنی اور عناد پر آمادہ ہیں۔ میں مظلوم اور یکس ہوں۔ میری نصرت کے لیے آؤ، میری مدد کے لیے آؤ۔ غلط پڑھا، عمامے میں رکھا، آگے زوجہ کے پاس بیٹھے۔ زوجہ نے پوچھا کیا لکھا ہے آقاؐ نے؟ کہا یزید (لعین) لشکر کشی کر رہا ہے امامؑ پر، نصرت کے لیے بلایا ہے۔ کہا پھر آپ کا کیا خیال ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حبیبؑ ابن مظاہر کی زوجہ مومنہ نہیں تھیں۔ ایسا نہیں ہے۔ زمانہ اتنا خراب تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے احتیاط کرتے تھے۔ تو حبیبؑ نے امتحان لیا۔ کہا بلایا تو ہے مگر میں کیوں جاؤں گا۔ میرا کیا تعلق، دو شہزادوں کی لڑائی ہے، میں کیوں دخل دوں۔ بس اتنا کہا تھا کہ زوجہ حبیبؑ کھڑی ہو گئیں۔ وائے ہو حبیبؑ تم پر۔ نبیؐ کا نواسہ نصرت کے لیے بلائے اور تم کو ہم سے کیا مطلب۔ دیکھیے زوجہ حبیبؑ نے بتایا ہے کہ ہر مسئلے میں آپ نیوٹرل ہو سکتے ہیں لیکن حسینؑ کے معاملے میں نیوٹرل نہیں ہو سکتے۔ کہا میری عبا اوڑھ کے بیٹھو، میری چادر اوڑھ کے بیٹھو، اپنا عمامہ مجھے دو، میں نصرت امامؑ کو جاؤں گی۔ حبیبؑ کھڑے ہو گئے، سبحان اللہ۔ میں اور نہ جاؤں، میں تو تیرا امتحان لے رہا تھا۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں چلا جاؤں گا تو، تو کیا کرے گی؟ کہا میں خاک پھاٹک کے زندگی بسر کروں گی مگر نصرت امامؑ سے آپ گریز نہ کیجئے۔

آپ دیکھیں کہ عورتوں کا بھی کتنا حصہ ہے واقعات کر بلا میں۔ آج محرم میں عورتیں بھی شریک ہیں، مرد بھی شریک ہیں، بوڑھے بھی ہیں، جوان بھی ہیں، بچے بھی ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ کر بلا میں بھی سب شریک تھے۔ ظاہر ہے دل پر اثر ہوتا ہے۔ جس سے جو ہو سکے وہ امامؑ کی خدمت کر دو۔ آپ ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا، تجربہ ہوگا کہ ہر زوجہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر کم سے کم خرچ کرے لیکن کبھی کوئی مومنہ اپنے شوہر سے عزائے حسینؑ کے خرچ میں کمی کی فرمائش نہیں کرتی۔ بلکہ عورتوں کا جی چاہتا ہے کہ جو کچھ ہو سکے مولا پر قربان کر دیں۔ یہ جذبہ کہاں سے آیا؟ یہ جذبہ ان بیبیوں نے پیدا کیا جنہوں نے کر بلا میں گود کے پالوں کو بھیجا تھا۔ چلے حبیبؑ ابن مظاہر۔ غلام

پانچویں مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل لا اسئلكم عليه اجرا" الا المودة فى القربى

برادران ملت!

محفل مرتضیٰ کے اس عشرہ مجالس میں مسلسل آپ کی خدمت میں "موت اہل بیت" کے عنوان پر یہ گفتگو جاری تھی۔ قرآن مجید کی اس آیت کے ذیل میں ارشاد ہو رہا ہے کہ "میرے حبیب! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقرباء ہیں ان سے مودت رکھو اور محبت رکھو۔"

اس ذیل میں کل گفتگو یہاں تک پہنچی تھی آپ کے سامنے کہ "محبت اہل بیت" و "محبت آل محمد" کو جو اجر رسالت قرار دیا تو اس اجر رسالت کا فیض اور "محبت اہل بیت" کا فیض خود محبت کرنے والے کو ملے گا۔ محبوب کو کوئی فیض نہیں ہے، چاہئے والے کو فیض ہے۔ اور اب یہ تصور کہ کچھ لوگ ہیں اسلام میں یا کوئی مخصوص فرقہ ہے عالم اسلام میں جس نے اپنا یہ طریقہ بنا رکھا ہے کہ وہ اہل بیت سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اہل بیت سے محبت کر کے وہ اجر رسالت ادا کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ حکم

دوست حبیب! ابن مظاہر آئے ہیں۔ بس حضور فضلہ پھر واپس آئیں۔ حبیب! کون ہے؟ لوگوں نے حبیب! کو آگے بڑھایا۔ کہا، حبیب! تمہیں علی کی بڑی بیٹی نے سلام کہا ہے۔ یہ سنتا تھا کہ حبیب! نے منہ پر لمبا لٹکائے اور کہا علی کی بیٹی اور مجھے سلام کہلا بھیجے۔ میں عرض کروں گا حبیب! تم نے سلام زینب کی بڑی قدر کی۔ ایک تم مسلمان ہو جو منہ پر لمبا لٹکے رہے ہو، یہ سن کر کہ علی کی بیٹی نے سلام کہا۔ ایک وہ مسلمان تھے جو زینب کو لائق سلام نہیں سمجھتے تھے۔ بڑی قدر کی حبیب! نے۔ ارے سلام کہلوا یا تو حبیب! زارو قطار رونے لگے۔ لوگ پوچھتے ہیں آپ اتنا کیوں روتے ہیں؟ ہمیں بھی کسی نے سلام کہا ہے۔ بہن نے حبیب! کو سلام کہا۔ بھائی جب رخصت آخر کے لیے آیا۔ کہا سید سجاد! جب قید سے چھٹ کے مدینے جانا ہمارے شیعوں کو ہمارا سلام کہنا۔ کہنا جب حضرت پانی پنا میری پیاس کو یاد کر لیتا۔



العباد، بندوں کا حق، مستحقین کا حق، غریبوں کا حق، فقراء کا حق، مساکین کا حق، مسافر کا حق، یہ حقوق اگر تم نے نہیں ادا کیے جو ہم نے تم پر لازم قرار دیئے اپنی کتاب میں تو پھر خالی ہماری عبادت کر لینا تمہارے لیے کافی نہیں ہوگا۔ کیا آپ بتائیں جو اسلام ماں باپ کا حق ادا نہ کرنے پر نہ بخشے اور جو اللہ بھائی کا حق ادا نہ کرنے پر معاف نہ کرے، زوجہ کا حق ادا نہ کرنے پر معاف نہ کرے، شوہر کا حق ادا نہ کرنے پر معاف نہ کرے، اپنے رسولؐ کا حق ادا نہ کرنے پر کیوں معاف کرے؟ اور اس آیت سے رسولؐ کا حق ثابت ہے۔ حق کسے کہتے ہیں؟ اگر میں نے آپ کے دفتر میں دن بھر کام کیا اور شام کو آپ سے پیسے مانگے تو میں یہ کہتا ہوں کہ میں آپ سے کوئی بھیک تھوڑی مانگ رہا ہوں۔ میں نے دن بھر آپ کی خدمت کی ہے۔ میں اپنا حق مانگ رہا ہوں۔ ویسے دنیا کی بات چھوڑیے یہاں تو رشوت کو بھی حق کہتے ہیں۔ صلوٰۃ

یہاں ایک جملہ پھر عرض کروں گا کہ پاکستان دس بارہ روز کے لیے آتا ہوں۔ مجھے یہاں کے حالات نہیں معلوم، ہمارے ملک میں جو بابو ہے، کلرک ہے، وہ کہتا ہے ہمارا حق دیجئے۔ یعنی آج دنیا میں رشوت بھی حق ہے۔ تو رشوت جب حق بن جائے گی تو حق کا پتہ کیسے چلے گا؟ تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خیرات مانگنا اور ہے اور حق مانگنا اور ہے۔ اہل بیتؑ کی جو محبت مانگی ہے تو امت سے خیرات نہیں مانگی ہے، محنت کا محتانہ مانگا ہے۔ اور محنت کیا ہے؟ یہی نماز، یہی روزہ، یہی احکام، ہم تک پہنچانا، یہی تو محنت ہے رسولؐ کی۔ تو اجر رسالت میں ”محبت اہل بیتؑ“ جو مانگی اور ہم جو مجالس میں ”محبت اہل بیتؑ“ پر زور دیتے ہیں، تو امت سے کوئی بھیک نہیں مانگتے، ان کو ان کا حق سمجھاتے ہیں اور محبت کریں گے آپ تو مجھے کیا فیض ہوگا۔ فیض تو آپ ہی کو ہوگا کہ آپ کی محنت کی اجرت ملے گی۔ تو آپ کو حق سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ اہل بیتؑ کا بھی حق ہے، رسولؐ اللہ کا بھی حق ہے، اللہ کے حقوق ہیں، بے شک۔ اللہ کا حق کیا ہے؟ وہ پیدا کرنے والا ہے۔ تو ماں باپ کے حق کی کیا ضرورت ہے؟ کما نہیں اللہ نے چونکہ ماں باپ کے ذریعے پیدا کیا، تو ذریعے کا بھی حق ہوتا ہے۔ تو دین پہنچنے کا، ایمان پہنچنے کا، علم پہنچنے کا، روشنی پہنچنے کا، ذریعہ کون ہے؟ اللہ کا رسولؐ۔ تو اس کا بھی حق ہوا۔ اگر ہمارے عالم وجود میں آنے کا ذریعہ ماں باپ ہیں، ان کا حق ہے۔ تو ہمارے مسلمان ہونے کا ذریعہ

سارے مسلمانوں کے لیے ہے۔ اسے میں نے تمہید ہی میں آپ کے سامنے عرض کیا تھا۔ اس لیے کہ اسلام دین حقوق ہے۔ حقوق کا مذہب ہے اسلام۔ خالی اللہ اپنی ہی اطاعت نہیں چاہتا۔ حقوق الہی بھی ہیں، حقوق العباد بھی ہیں اور عام تصور یہ ہے کہ اگر ہم نے اللہ کو خوشامد کر کے راضی کر لیا، اس کی تعریف کی، اس کی تسبیح کی، اس کی تقدیس کی، خوب شب و روز نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، ہر سال حج کرنے چلے گئے، بڑے ہی اللہ والے بن گئے پھر اس کے بعد کسی کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا رسولؐ کیسے اہل بیتؑ اللہ ہے۔ جب اللہ ہی اپنا ہو گیا اور ہم اللہ والے ہو گئے۔ اب اس کے بعد رسولؐ تو خالی ایک ذریعہ تھا دین کو پہنچانے کا۔ دین پہنچایا، چلا گیا۔

ایک تصور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں یہ پیدا کیا جاتا ہے۔ یعنی رسولؐ کے آنے کا مطلب کیا تھا؟ کہ بندے اللہ کو پہچانیں۔ اللہ کو پہچان لیا۔ اب پیغمبرؐ کی اطاعت کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ کے رسولؐ کی تعریف کی کیا ضرورت ہے یا ان سے اظہار عقیدت کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طریقے سے اہل بیتؑ کے لیے مان لیا۔ بڑے اچھے تھے، آل رسولؐ تھے، انہوں نے دین کی خدمت کی، قربانیاں پیش کیں۔ امام حسینؑ نے بے شک بہت بڑی قربانی پیش کی اور دین کو بچایا۔ تو ٹھیک ہے۔ وہ ان کا فرض تھا۔ ان کی ڈیوٹی تھی۔ مقصد کیا تھا شہادت حسینؑ کا کہ ہم اللہ کو پہچانیں۔ ہم نے پہچان لیا۔ اب حسینؑ کا کون سا حق باقی ہے۔ ایک یہ تصور پایا جاتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں ایسا نہیں ہے۔ علماء اسلام سے پوچھئے کہ اگر کوئی مسلمان اپنے والدین کا حق ادا نہیں کرتا ہے۔ جیسے کل میں نے آپ کے سامنے حقوق والدین کے سلسلے میں عرض کیا تھا۔ کوئی زوجہ اپنے شوہر کا حق نہیں ادا کرتی یا کوئی شوہر اپنی زوجہ کا حق ادا نہیں کرتا تو اس کی کیا منزلت ہے اسلام میں۔ کوئی ماں باپ اپنی اولاد کا حق ادا نہیں کرتے۔ تو پھر نمازی ہیں، روزے دار ہیں، حاجی ہیں، بڑے ہی اللہ والے ہیں، اللہ اللہ۔ تو کما ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیوں نہیں ہو سکتا ہے؟ اس لیے کہ اللہ نے حقوق العباد رکھے ہیں۔ فرماتا ہے ”میرے بندے اگر تو نے میرا حق ادا نہیں کیا تو میں رحمن و الرحیم ہوں، معاف بھی کروں گا لیکن اگر ماں باپ کا حق نہیں ادا کیا تو معاف نہیں کروں گا۔ اگر تو نے اپنے بھائی کا حق ادا نہیں کیا تو میں معاف نہیں کروں گا۔ بہن کا حق ادا نہیں کیا تو معاف نہیں کروں گا۔ یعنی حقوق

دیا، لڑکی کو اکرا دیا۔ تو لڑکا تو اپنے گھر میں رہے گا، اپنے باپ کی جائیداد میں دوہرا حصہ پائے گی اور لڑکی اپنے باپ کے گھر سے دوسرے گھر جانے کی تو شوہر کی جائیداد میں بھی حصہ پائے گی۔ تو باپ کے گھر سے بھی لے کے جائے گی، سسرال میں بھی پائے گی۔ اگر یہاں سے سلام کرائی ملے گی تو وہاں منہ دکھائی ملے گی۔ تو ڈبل شیئر ہوگا کہ نہیں ہوگا۔ اور لڑکے کے اوپر بار رکھا ہے زوجہ کے نان و نفقے کا۔ لڑائی والی بات پڑھ رہا ہوں یعنی شریعت میں لفظ ہے ”نان“۔ ”نان“ یعنی روٹی۔ ہم بیوی سے روٹی پکوا کے کھاتے ہیں، جبکہ اللہ کا حکم ہے بیوی کو روٹی پکا کے دو یا لاکے دو۔ لفظ ”نان“ ہے، لفظ ”آنا“ تو نہیں ہے۔ میری تشریح ہے۔ تو شریعت نے یہ تو نہیں کہا زوجہ کو آنا دو، پانی دو کہ وہ گوندھے لکڑی دو جس پر وہ پکائے۔ تو نان کا مطلب تو روٹی ہے یعنی پکی پکائی۔ تو زیادہ تشریح نہیں کروں گا ورنہ آج سب بی بیائیں گھر میں کہیں گی، آپ روٹی پکائیے، تو آپ کی زندگی پریشان ہو جائے گی۔ لہذا شریعت کی بات شریعت کی ہے۔ یہ ہماری سوسائٹی اور ہمارا سماج اور ہمارا معاشرہ اور ہماری تہذیب جو سب کچھ دوسروں کی ہے۔ کلمہ اسلام کا ہے ہمارے پاس۔ کلمہ صرف اسلام کا ہے اور معاشرہ اور تہذیب دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی ہے۔ اس لیے ساری پریشانی ہوتی ہے۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ جب لڑکی لڑکے کے گھر جاتی ہے تو ہمارے یہاں دستور کیا ہے؟ شادی ملے ہو رہی ہے۔ اب جب شادی ملے ہو رہی ہے تو صاحب زادے ایٹھے ہوئے ہیں، اکڑے ہوئے ہیں۔ مجھے پاکستان کا حال نہیں معلوم لیکن ہمارے ہندوستان میں کہتے ہیں اسکوٹریس گے، کارلیس گے، ٹی وی لیس گے، یہ لیس گے، وہ لیس گے۔ کیوں؟ انجینئر ہیں، ایم بی بی ایس ہیں، پڑھا ہے۔ تو باپ نے لڑکے کی پڑھائی پر جو کچھ خرچ کیا ہے وہ سب سرے سے وصول کر لینا چاہتا ہے۔ یہ تو لڑکے کی سیل ہوئی۔ تو جب لڑکی اپنے گھر سے سارا جینز ٹرانسفر کرتی ہے اور دیکھتی ہے کہ شوہر کے گھر کی چار دیواری ہے۔ تحفہ ہمارے باپ کا دیا ہوا، ڈبل بیڈ ہمارے باپ کا دیا ہوا، ٹی وی ہمارے باپ کا دیا ہوا، کار ہمارے باپ کی دی ہوئی، تو وہ سمجھتی ہے کہ ہمارے باپ نے شوہر تھوڑی دیا ہے، ہم کو نوکر دیا ہے اور اس کی قیمت یہ ہے۔ اور جب آنکھ کھول کے وہ سب دیکھتی ہے کہ گھر کی دیواریں آپ کی ہیں اور سب سامان تو ہمارا ہے تو اس میں احساس برتری

اللہ کا رسول ہے۔ اس کا بھی حق ہوگا۔ اب حق کیا ہے؟ جو مانگ لے۔ تو کچھ بھی نہیں مانگا سوائے محبت کے۔ اور اجر رسالت میں کچھ بھی نہ طلب کیا سوائے اقربا کی محبت کے کہ یہ حق ہے۔

اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ انتہا یہ ہے کہ بھائی کا حق، بہن کا حق، شوہر کا حق، زوجہ کا حق اور سب قرآن میں ملیں گے۔ اسلام دین حقوق ہے۔ کیوں میراث لکھی۔ لڑکے کا دوہرا حصہ ہوگا، لڑکی کا اکرا حصہ ہوگا۔ ارے ہم نے کیا، ہم نے کاروبار کیا، ہم نے پیسہ جمع کیا، ہم مر گئے۔ اس میں بڑانے والا اللہ کون؟ تو کہا نہیں۔ ہمارے مسلمان ہو، کلمہ گو ہو، تو ہمیں اس طرح سے میراث کی تقسیم کرنا پڑے گی جو ہم نے تمہارا حق معین کیا ہے۔ لوگ کہہ دیتے ہیں صاحب اسلام میں توازن نہیں ہے۔ اسلام میں عورت کو کنزور سمجھا ہے اور مرد کی بڑی ویلو ہے۔ اس لیے مغرور ہو گیا مرد، دوہرا حق پائے۔ تو یہ اکرا حق بھی بہن کا دبا بیٹھا۔ صلوٰۃ

یعنی عام تصور یہ ہے کہ شوہر کا یہ حق ہے کہ جس کو وہ گھر میں بیاہ کے لائے ہیں اور جس کی لڑکی کو بیاہ کے لائے ہیں وہ گویا ان کی لونڈی بن کے آئی ہے، خدمت گزار بن کے آئی ہے اور ان پر کوئی اس کا حق نہیں ہے۔ اس کو ہر وقت اشارے پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ لکھا ہے زوجہ کو شوہر کی اطاعت کرنا چاہیے۔ تو زوجہ پر شوہر کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ تو کہا دیکھ لیجئے آپ اسلام کہاں برابر ہے؟ کہاں پر عورتوں کا حق؟ بیوی جو ہے وہ میاں کی محکوم ہے۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ خالی عورت کو آپ بیوی کی حیثیت سے کیوں دیکھتے ہیں۔ یہ عورت آپ کی بیوی ہے، کل پھر ماں بھی بنے گی۔ تو جب ماں بنے گی تو اس کے حقوق کتنے ہو جائیں گے۔ زوجہ کی حیثیت سے شوہر کی اطاعت کا حکم دیا اور بیٹے کو ماں کی اطاعت کا حکم دیا۔ تو اگر ایک مرد کی ماتحت بنایا تو ایک مرد کو ماتحت بنایا۔ جتنے بچے بھی اللہ نے دیئے سب کا حاکم بنادیا۔ تو یہ کہاں پر فرق ہوا؟ اب صے کی بات میں کہتے ہیں کہ لڑکی کا اکرا ہے۔ قرآن مجید میں ’اسلام میں‘ اللہ کہتا ہے لڑکی کا اکرا حق، لڑکے کا دوہرا حق۔ ایک باپ کے ایک لڑکی ہے، ایک لڑکا ہے۔ لڑکے کا دوہرا حق ہے۔ لڑکی کا اکرا حق ہے۔ لہذا برابر ہوا۔ بالکل برابر ہے۔ جناب، اس لیے برابر ہے کہ لڑکے کو دوہرا

کہا، بس یہی مر ہے۔ تو مہر کا تصور یہ ہے اسلام میں کہ لڑکے والا شادی سے پہلے مردے تاکہ لڑکی کا باپ اسی مہر میں سے چیز کا انتظام کرے۔ اور ہمارا نظام کیا ہے۔ جیزدے لڑکی کا باپ اور جب جناب نے قبلہ و کعبہ سے پوچھا آپ کا فلاں بنت فلاں کے ساتھ پچاس لاکھ دینار سرخ پر نکاح پڑھ دیا جائے؟ جی ہاں۔ دینار سرخ باپ نے بھی نہیں دیکھے اور جی ہاں کہنے کو تیار ہیں۔ کیونکہ اگر دینا ہو تو کان کھڑے ہوں۔ یہ تو دینے کی نیت ہے ہی نہیں۔ اور یہ علماء سے پوچھئے کہ اگر شوہر کی نیت مردہ کی نہ ہو تو نکاح بھی جائز ہوا کہ نہیں؟ تو اگر آپ مجھ سے قانونی بحث کرائیں گے تو میں کہوں گا کہ اگر مہر دینے کی نیت نہیں تو وہ آپ کی بیوی ہی نہیں۔ حقوق کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ پہلے مہر دیجئے، تو حق ثابت ہوگا۔ صلوٰۃ

اور دیکھئے۔ آج جنہوں نے مہر نہیں ادا کیا ہے ان کے گھر میں کیا قیامت ہوتی ہے۔ آج کی رات اسی لیے میں پڑھنے پر تیار نہیں تھا لیکن اصرار کیا گیا ہے۔ تو مہر پہلے ہے۔ پیغمبر اسلام نے اس مہر کی رقم کو اٹھا کر سلمان کو دے دیا۔ جاؤ اس سے کچھ سامان لے آؤ اور خود پیغمبرؐ نے اپنے پاس سے ایک جوڑا کپڑا دیا اپنی بیٹی کو اور باقی برتن، معمولی سا بستر، یہ سب اسی مہر سے آیا۔ تو اسلام میں مہر نفد ہے۔ بس جو دے دو وہی مر ہے۔ یہاں مہر کو ”لون“ بنا دیا۔ کل دیں گے انشاء اللہ اور اس کے بعد بیوی سے یہ بھی کہیں، بیوی معاف کر دو۔ تو وہ چیز بھی لے کر آئے، مہر بھی معاف کرے، پھر آپ کی باتیں بھی سنے، نفسیات کے خلاف ہے۔ وہ تو سوچے گی یہ غلام در غلام۔ صوفی پر میرے باپ کے بیٹھتا ہے، بستر پر میرے باپ کے بیٹھا ہے، ٹی وی میرے باپ کا دیکھ رہا ہے، سواری میرے باپ کی استعمال کر رہا ہے اور اس کو جو دینا بھی تھا مہر وہ بھی معاف کرا رہا ہے۔ یہ سمجھ لیجئے آپ کی بیویاں بالکل ہی معاف کر دیتی ہیں۔ میں کچھ کہہ گیا۔ اب نتیجہ یہ ہے کہ آپ کا کوئی حق ہی باقی نہیں رہتا۔

اگر ہمارے یہاں شادی اسلام کے مطابق ہو تو یہ ساری چیزیں خود بخود دور ہو جائیں۔ اچھا اب کمال کی بات یہ ہے کہ جہاں کی معاشرتی برائی ہے وہاں دور کرنے پر کوئی تیار نہیں۔ جب مولوی آیا مجلس پڑھنے، انہوں نے کہا ماں باپ کا حق بیان کیجئے۔ تو میں یہ پوچھ رہا تھا کل ایک دوست سے کہ جو آجکل کے لڑکے اپنے ماں باپ سے محبت

پیدا ہو جاتا ہے اور جب احساس برتری پیدا ہوتا ہے تو آپ کے جیسے نوجوان کہتے ہیں کہ آجکل کی لڑکیوں کے دماغ نہیں ملتے۔ نکاح پڑھنے سے پہلے آپ کے دماغ نہیں ملتے تھے۔ نکاح کے بعد ان کے دماغ نہیں ملتے۔ اس لیے کہ آپ نے شرائط ایسی رکھیں کہ خود اپنے کو فروخت کر دیا۔

چنانچہ ہمارے یہاں کا یہ رواج ہے کہ جس کے دو چار لڑکے ہوتے ہیں وہ کہتا ہے مکان بناؤ، فرنیچر کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو لڑکا جیز میں لے ہی آئے گا۔ اور جس کے یہاں لڑکی ہوتی ہے وہ سمجھتا ہے اس کے اوپر قرقی ہے۔ اور جس کے لڑکے ہوتے ہیں وہ سمجھتا ہے ہمارے پاس ڈگری ہے۔ ہم جس دن چاہیں گے دوسرے کے گھر کا سامان اٹھا لائیں گے۔ یہ سماج ہے جو اسلام نہیں ہے۔ اسلام میں کیا رشتہ ہے؟ جب علی مرتضیٰؑ پیغمبر اسلام کے سامنے بیٹھے، تو پیغمبرؐ نے فرمایا ”علیؑ میں جانتا ہوں تم کس لیے آئے ہو۔ تم فاطمہؑ کی خواستگاری لے کر آئے ہو۔ یہ بتاؤ مال دنیا میں سے تمہارے پاس کیا ہے؟“ لڑکی کا باپ لڑکے سے پوچھ رہا ہے کہ مال دنیا میں کیا ہے اور ہم مسلمانوں میں لڑکوں کا باپ لڑکی والوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے پاس مال دنیا میں کیا ہے؟ یہ تو سیرت نہیں ہے رسول اللہ کی، یہ تو اسلام نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے سماج کی خرابی ہے۔ اس سے اسلام کا کیا واسطہ ہے۔ تو مولائے کائناتؑ نے فرمایا ”یا رسول اللہ آپ جانتے ہیں میرے پاس مال دنیا میں سے کچھ نہیں ہے۔ ایک مکان ہے، ایک گھوڑا ہے، ایک زرہ ہے اور ایک تلوار ہے۔ کسی کو تپوں گا تو پیسے کچھ ہوں گے۔“ اب جواب سنئے اللہ کے رسولؐ کا۔ ”یا علیؑ گھر نہ بیچنا، گھر بیچو گے تو رہو گے کہاں؟“ آج کتنے لوگ گھر بیچ کر شادیاں کرتے ہیں۔ صلوٰۃ

کتنوں کے گھر بیک جاتے ہیں۔ یہ اسلام نہیں ہے۔ کہا گھر نہ بیچو، رہو گے کہاں؟ گھوڑا نہ بیچو، سفر کیسے کرو گے؟ تلوار نہ بیچو، جہاد کیسے کرو گے؟ زرہ تمہارے لیے بیکار ہے، بیچ ڈالو۔ کیا کہنا یہ پیغمبرؐ کا ارشاد بھی علیؑ کی شان میں قصیدہ ہے کہ تم ایسے بہادر ہو کہ تمہیں زرہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ صلوٰۃ

چنانچہ علیؑ ابن ابی طالبؑ نے زرہ بیچ دی۔ اس زمانے کے لیے کہا جاتا ہے کہ زرہ مکی تو ہے ۱۰۰ ہجری آئے۔ جب جناب سلیمانؑ زرہ بیچ کر رقم لائے تو کما حضورؐ یہ ملے ہیں۔

حقوق ہیں۔ یہ تو بڑی نا انصافی ہوگی کہ یکطرفہ حق بیان کیا جائے۔ ابھی لوگ کہہ رہے ہیں حقوق والدین بیان کیجئے۔ یہی سننے میں آتا ہے، صاحب ذرا بتائیے ماں باپ کا کیا حق ہے؟ بچے پیارے چھوٹے ہیں، جانتے نہیں ہیں۔ جس دن جان جائیں گے وہ مولوی سے کہیں گے اولاد کا حق بیان کیجئے، تو بڑی پریشانی ہو جائے گی۔ اسی طرح سے لوگ کہتے ہیں شوہر کا حق بیان کیجئے۔ جس دن عورتیں جان جائیں گی، کہیں گی، ذرا زوجہ کے حقوق بھی بیان کیجئے۔ تو ساری رات جاگ کر گزر جائے گی، ایک اپنا حق دوسرے سے مانگتا رہے گا۔ دوسرا اپنا حق مانگتا رہے گا۔ نتیجہ تو کوئی نکلنے والا نہیں ہے۔ نتیجہ تو صرف اس میں ہے کہ جب حقوق اللہ ادا کرنے کا صحیح جذبہ پیدا ہوگا اور خوف الہی دل میں بیٹھے گا اور پیروی رسولؐ اور آل محمدؐ کا جذبہ پیدا ہوگا۔ میاں بیوی کی لڑائی کا سوال ہی نہیں۔ لڑائی تو حقوق کی ہوتی ہے۔ ملکوں میں حقوق کی لڑائی، خاندانوں میں حقوق کی لڑائی، ماں باپ میں حقوق کی لڑائی، شوہر اور زوجہ میں حقوق کی لڑائی۔ تو حق کیا ہے؟ حق یہ ہے کہ اللہ نے عورت کو اور مرد کو دونوں ہی کو خلق کیا۔ ایک یہ مسئلہ آج کل بہت زوروں پر ہے۔ عورتوں کے حقوق، حقوق نسواں۔ جو مردوں نے عورتوں کے حق تلف کیے ہیں وہ عورتیں اپنے حقوق مانگیں لیکن ان کی سمجھ میں حق کیا آتا ہے۔ پریذیڈنٹ شپ، پرائم منسٹر شپ، چیف منسٹر شپ، کلکٹر ہونا، ڈپٹی کمشنر ہونا، ہائیکورٹ و سپریم کورٹ کا جج ہونا، اسمبلی کا ممبر ہونا۔ تصور یہ ہے کہ ہم کو برابر زندگی ملے۔ تو رائس نہیں ہے، برابر عمنہ ہے۔ اور دنیا کہتی ہے کہ ہم نے عورتوں کو برابر کا حق دیا۔ ہمارے ہندوستان میں تو برابر سے زیادہ دے دیا۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ تو یہ حکومت کا تصور اسلام کے حق سے وابستہ نہیں ہے۔ وہاں حقوق معین ہیں شوہر کے، زوجہ کے۔ کتنا عورتوں کو دھوکہ دیا ہے۔ جس دن عورتیں اسلام سمجھ لیں گی اور اپنے حقوق پہچان لیں گی بڑے بڑے مسلمانوں کے دانتوں کے نیچے پھیندے آجائے گا۔ صلوٰۃ

ایک یہ سوال ہے کہ برابری نہیں ہے۔ عورتوں کو اسلام نے برابری نہیں دی ہے۔ عورتوں کو اسلام نے گھر میں بٹھا دیا، پردے میں بٹھا دیا۔ اسلام نے کچلا؟ اسلام نے کچلا نہیں ہے۔ اسلام نے کچلنے سے بچایا ہے۔ اور طرح طرح کے اعتراض۔ پردے میں رہنے سے دم گھٹتا ہے۔ ذرا کھلی ہوا اور جب کھلی ہوا میں کھلی ہوا لگتی ہے تب غصہ

نہیں رکھتے، یہ عمل ہے یا رد عمل؟ میری نظر میں یہ عمل نہیں ہے نوجوانوں کا، رد عمل ہے۔ جب ماں کو دودھ پلانے کی چھٹی نہیں تھی یا فیشن کے خلاف تھا، تو شیر مادر دہن میں گیا ہی نہیں، محبت آئے کہاں سے؟ جب گود کی گرمی بچے نے محسوس ہی نہیں کی، آیا نے پالا، تو آیا کی محبت آئے یا اماں جان کی محبت آئے۔ جب ابا نے اولاد کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ اتنا مصروف تھے تو بیٹا پہچانے کیسے کہ آپ باپ ہیں۔ یہی شکر کیجئے کہ وہ باپ کتا ہے۔ جب آپ کا بچہ پیدا ہوا تو آپ نے نرسنگ ہوم میں دے دیا۔ جب آپ بڑھے ہوئے تو اس نے آپ کو اولڈ سکول میں داخل کر دیا۔ پریشانی کی کیا بات ہے۔ جب وہ آپ کا محتاج تھا تو آپ نے بھی اسپتال کا سہارا لیا۔ جب آپ اس کے محتاج ہو گئے تو اس نے بھی اسپتال کا سہارا لیا۔ اس طریقے سے آجکل کی لڑکیاں سنتی نہیں، شوہروں کی بات نہیں مانتیں۔ اسلام کتا ہے شوہر کا حق زیادہ ہے۔ ارے حق تو زیادہ ہے مگر حق ادا تو کرو۔

اب جب جناب سیدہ نبیاء کے گئیں اور پیغمبرؐ اسلام اپنی بیٹی سے ملنے گئے تو دیکھا بیٹی پرانا لباس پہنے ہے۔ کہا جان پدر، راحت پدر، اے میری پیاری بیٹی، میں نے تمہیں ایک جوڑا کپڑا دیا تھا خوشنودی شوہر کے لیے اور تم پرانا کپڑا پہنے بیٹھی ہو۔ نیا کیوں نہیں پہنا تم نے؟ کہا بابا رات کو ایک سالہ نے دروازے پر سوال کیا کہ رسولؐ کی بیٹی میں برہنہ ہوں، مجھے لباس دیجئے۔ بابا مجھے شرم آئی کہ میں نیا لباس پہنے رہوں اور پرانا دے دوں۔ بیس پردیکھ لیجئے، ہمارا فرض کیا ہے کہ خیرات بھی ہم پرانے مال سے کرتے ہیں۔ یہ شیروانی ہماری پرانی ہو گئی، کسی غریب کو دے دو۔ یہ کورٹ ہمارا فیشن سے اتر گیا ہے لہذا کسی غریب کو دے دیں۔ یہ اسلام نہیں ہے۔ شہزادی نے کہا میں نے نیا دے دیا، پرانا پہن لیا۔ بابا، وہ کپڑے آپ نے مجھے شوہر کی خوشنودی کے لیے دیئے تھے۔ اللہ نے مجھے شوہر بھی ایسا دیا جو اس عمل سے خوش ہو گیا۔ صلوٰۃ

تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اسی لیے ”محبت اہل بیت“ کو واجب قرار دیا گیا کہ جب اہل بیت سے تمہیں محبت رہے گی تو ان کے قصے سنو گے، ان کے واقعات سنو گے اور کتنی تمہاری اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔ اب حقوق کی منزل میں آپ ملاحظہ فرمائیں کہ انہوں نے کہا صاحب اسلام میں شوہروں کے کیا حقوق ہیں؟ تو اب زوجہ کے بھی

ہے، گیس کے گولے پھینکنا سکھائے جاتے ہیں، مگر فار کرنا سکھایا جاتا ہے۔ ان کو سیدھا گولی چلانا سکھایا جاتا ہے۔ کیوں؟ ان کو دشمن سے لڑنا ہے۔ ان کو اپنوں سے لڑنا ہے۔ تو قوانین میں بھی فرق ہے کہ نہیں؟ اب اگر ملٹری گھر میں آجائے اور پولیس بارڈر پر چلی جائے تو آپ دیکھتے کیا حال ہوتا ہے۔ مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ کہیں بات پولیٹیکل نہ ہو جائے۔ ہم صرف اسلام کی مثال دے رہے ہیں آپ کے سامنے۔ ہم کو کسی قاعدے قانون سے آپ کے یہاں کے 'اپنے یہاں کے' سے مطلب نہیں ہے۔ لیکن آپ اتنا ہم کو بتا دیجئے کہ گھر بھی ہے آپ کے اور آفس بھی ہے؟ یہی مثال لے لیجئے، گھر بھی ہے اور آفس بھی ہے۔ ہم نے اکثر لوگوں سے کہا گھر پر چلیں، آپ سے یہ بات کرنی ہے۔ نہیں آپ آفس آئیے گا، آفیشل بات آفس میں ہوتی ہے۔ یہ گھر ہے میں آرام کر رہا ہوں۔ ارے گھر اور آفس کا کیا فرق ہے، آپ تو یہی ہیں؟ کہا نہیں وہ منزل الگ ہے، یہ منزل الگ ہے۔ تو جیسے آپ کے یہاں گھر اور آفس کا ڈویژن ہے۔ اللہ کے یہاں بھی مرد اور عورت کا ڈویژن ہے۔ آپ کو بتایا ہے انتظام کے لیے اور عورت کو بتایا ہے گھر کا انتظام سنبھالنے کے لیے۔ تو جیسے زندگی کی تقسیم آپ نے کی ہے، ویسے ہی اللہ نے کی۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماڈرن کلچر اور ماڈرن سوسائٹی کے تصادم سے ہم اسلام سے اختلاف کرتے ہیں جبکہ اگر اسلام پر چلتے تو اختلاف کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس لیے کہ اللہ نے مساوی حقوق دیئے۔ لوگ کہتے ہیں اللہ نے مرد اور عورت کو برابر کا حق نہیں دیا ہے؟ ہم کہتے ہیں ایک انچ اور آدھا انچ بھی غیر برابر نہیں ہے۔ یہ عورت پر ہے کہ وہ اپنی عزت حاصل کرے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو اسلام نے کم تر سمجھا، تو ایک مرد کا نام بتائیے جس کے لیے رسول اسلام تعظیم کو اٹھتا ہو۔ تاریخ بتائے گی تو ایک عورت ہی کو بتائے گی۔ تو جب فاطمہؓ آتی تھیں تو تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت اگر سیرت فاطمہؓ پر عمل کرے تو نبوت بھی تعظیماً کھڑی ہو جاتی ہے، شوہر کیا چیز ہے۔ صلوٰۃ

یہ حقوق کی منزل ہے۔ کبھی سب پردے میں تھے اور آپ دیکھیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی دادی، نانی بے پردہ تھیں اور اگر نانی، دادی سے ماڈرن سوسائٹی چلی آ رہی ہے تو کم سے کم لکڑ دادی، لکڑ نانی۔ تو کہا ہاں اماں اور نانی بیان کرتی تھیں کہ وہ بڑا مردہ

آنے لگتا ہے۔ بہت ادب سے پڑھنے کی چیز ہے۔ مغلند انہ اشارہ کافی ہے۔ تو یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ ہم میں جذبہ یہ ہے کہ کوئی ہماری پیروی کی طرف نہ دیکھے، کوئی ہماری بہن کی طرف نظر اٹھا کے نہ دیکھے، کوئی ہماری لڑکی کی طرف نہ دیکھے۔ جذبہ یہ کہ ہماری عورت کی طرف نہ دیکھو۔ تمہاری دیکھنا ہمارے لیے جائز ہی ہے۔ یہ کون سی حقوق کی بحث ہوئی۔ جناب اسلام نے جو پردہ رکھا تھا وہ عورت کو دبانے کے لیے نہیں، بچانے کے لیے۔ دو باتوں میں فرق ہے۔ میں ہمیشہ پڑھتا ہوں، آپ بڑے ماڈرن ہیں، آپ بڑے تہذیب یافتہ ہیں، آپ بڑے تعلیم یافتہ ہیں، آپ بڑے لکھ بقی کوڑ پتی ہیں۔ آپ کے گھر میں ہم غریب مولوی بھی تو جاتے ہیں۔ جب گئے کسی کے یہاں۔ مولانا دیکھتے یہ صوفہ ہم نے کینڈا سے منگایا ہے، یہ سینٹ ہم نے سوئزرلینڈ سے منگایا ہے، یہ ہم نے جاپان سے گڑیا منگائی ہے۔ سب دیکھا۔ کہا کتنے کی ہے؟ کہا لاکھ کی، دس لاکھ کی، بیس لاکھ کی۔ کیا کہنا لاکھوں کی باتیں۔ میں نے کہا آپ کے گھر میں زیور نہیں ہے؟ کہا ہے۔ کہا ڈرائنگ روم میں نہیں ٹانگا آپ نے؟ کہا نہیں نہیں۔ وہ سیف وارڈ میں رکھا ہے۔ وہ پانچ ہزار کا زیور سیف وارڈ میں رکھا ہے اور دس ہزار کا صوفہ بچھا ہوا ہے؟ تو کہا آپ سمجھ نہیں۔ صوفہ کون لے جائے گا۔ یہ پینتیس ہزار کی میز رکھی ہوئی ہے، انگلیٹڈ سے منگائی ہے اور دو ہزار کے پیوی کے بندے پینک لاکر میں رکھے ہوئے ہیں۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا، ہمیں ٹانگہ دینے۔ کہا اگر کوئی لے گیا تو کیا ہوگا؟ تو معلوم ہوا جس کی چوری کا ڈر ہوتا ہے وہ سیف وارڈ میں رکھا جاتا ہے۔ پردہ نہیں، عورتوں کو اللہ نے سیف وارڈ میں رکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نظریں ڈائمنڈ اور سونے کی قدر پیوی سے زیادہ ہے۔ صلوٰۃ

پردے کی مخالفت ہے اور ڈائمنڈ رکھے ہوئے ہیں سیف وارڈ میں۔ تو کہا کہ برابر کی زندگی ہے۔ دیکھتے زندگی کے دو فرٹ ہیں۔ آپ ہر ملک کو دیکھ لیجئے۔ ملٹری کیوں ہوتی ہے؟ پاکستان میں ملٹری ہے کہ نہیں؟ کس لیے ہے؟ پاکستان میں ملٹری ہے بارڈر کی حفاظت کے لیے کہ دوسرا ملک حملہ نہ کرے۔ حملہ کرے تو اپنے ملک کی زمین کو بچائے۔ پولیس کس لیے ہے؟ کہا شہر کے اندر امن قائم رکھنے کے لیے۔ تو بارڈر فورس الگ اور اندرونی فورس الگ ہے۔ دونوں کی ٹریننگ بھی الگ ہے۔ ان کو لاشی چلانا سکھائی جاتی

اوڑھا کے برقعہ پہنا کے لے جائیں؟ تو اس کا مطلب یہ کوئی فلاسفی نہیں ہے پردہ کرنے کی۔ تو بھائی صاحب سوسائٹی، سوسائٹی ہے۔ جیسے انگریزی نیشن میں، جیسے تقریب میں، جیسے بڑے ہوٹل میں برقعہ نہیں اچھا لگتا۔ مذہبی اجتماع میں بے پردگی اچھی نہیں لگتی۔ تو کم سے کم اتنی ایمانداری تو ہونی ہی چاہیے ”لفظی لفظی فیصد“۔ ادھر گئے تو فیشن میں، ادھر آئے تو سر ڈھانک کے۔ معلوم تو ہو کہ

رات کو خوب سی پی صبح کو توبہ کرلی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

سوسائٹی الگ الگ ہے۔ جو اسلامک سوسائٹی ہے۔ وہاں پردہ اچھا لگتا ہے۔ جو غیر اسلامک سوسائٹی ہے وہاں پردہ اچھا نہیں لگتا۔ تو جہاں فیشن کے ہزار کپڑے بننے ہیں تو وہاں فیشن میں ایک ایک چادر بھی بن سکتی ہے۔ جو بیٹی میں بند رہے۔ خالی رمضان شریف اور محرم شریف میں نکلے۔ بھی مجلس میں جارہے ہیں، ماتم میں جارہے ہیں، جلوس عزاء میں جارہے ہیں، وہاں بے پردہ جانا اچھا نہیں لگتا۔ جیسے انگریزی نیشن میں پردہ میں جانا اچھا نہیں لگتا، ویسے ہی میاں بے پردہ جانا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ کما وہاں صاحب بڑے ماڈرن سوسائٹی کے لوگ ہوں گے۔ وہ دیکھیں گے ان کی بیوی پردے میں آئیں تو جو پردے کو پسند نہیں کرتے ان کے سامنے پردے میں لے جانا اچھا نہیں لگتا۔ تو جس مجلس میں رسول اللہ آتے ہوں، جس مجلس میں علی مرتضیٰ آتے ہوں، جس مجلس میں حسین آتے ہوں، جس مجلس میں بی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا آتی ہوں، جس مجلس میں بی بی زینب آتی ہوں۔ اب یہ آج رات کو سوچنے کا کہ ان کو بے پردگی اچھی لگتی ہے کہ نہیں؟ تو آپ کہیں گے نہیں انہیں تو اچھا نہیں لگے گا۔ تو جب دوسروں کے اچھا لگنے کا سوال ہے تو کچھ اپنے بھی ہیں جن کے ہاتھ میں نجات ہے۔ تو کم سے کم اتنا ہو جائے اور ہوتا ہے۔ میں نے جہاں جہاں گزارش کی وہاں تبدیلی آئی ہے اور ایسی تبدیلی آئی ہے کہ جس نے دو مہینے آٹھ دن پردہ کر لیا اس نے کما پردہ چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔

جناب صرف حقوق کی بات یہ ہے۔ سب سے پہلا درجہ کا حق شوہر پر یہ ہے کہ شوہر اس کے نان و نفقے کا اتنا انتظام کر دے کہ اسے گھر سے نکلنے کی ضرورت ہی باقی نہ

کرتی تھیں۔ تو کیوں مٹ گیا پردہ؟ کبھی غور کیا آپ نے؟ یہ تو آپ پوچھتے ہیں کہ اسلام نے پردہ کیوں واجب قرار دیا ہے۔ جانے دیجئے اسلام کو، یہ بتائیے کہ پردہ ہٹا کیوں؟ ایک چیز موجود تھی جو ایک دم اٹھ گئی۔ کیوں اٹھ گئی؟ جب انگریز آئے حکومت کرتے ہوئے ہندوستان پر تو ان کے میاں بے پردگی تھی۔ وائسرائے آیا، گورنر آیا، کلکٹر آیا، کمشنر آیا، کسٹرن پولیس آیا، تو ہم ہندوستانی بھی کیوں کر ہوئے۔ گذارنگ سر، دیل تمہارا میم کہاں ہے؟ میم تو پردے میں بیٹھا ہے۔ ویل تم بہت Backward ہے۔ تمہارا میم پردہ کرتا ہے، ہم سے پردہ کرے گا۔ اب نوکری کے لالچ میں بیوی سے کما، نکلو، اس زمانے کی گفتگو سنا رہا ہوں، پچھلے دنوں کی۔ جب انہوں نے کما ہوگا بیگم کل چلنا ہے صاحب کے پاس۔ جھاڑو پھرے تمہارے صاحب پر، میں تو نہیں جاؤں گی۔ فوراً گھر میں لڑائی شروع ہو گئی۔ چلنا ہوگا، نہیں تو ہماری نوکری جائے گی۔ تو رزق کے لیے نکالا، روٹی کے لیے نکالا اور اللہ چلا کے کتا رہا رزق کا میں زے دار ہوں۔ صلوٰۃ

تو بھروسے کی بات ہے، اس میں کیا فلسفی لوگ بحث کریں گے۔ یہ بات تو بھروسے کی ہے۔ جس کو رزق کا بھروسہ اللہ پر ہے، وہ جانتا ہے ہماری بیوی نکلے نہ نکلے، لڑکی نکلے نہ نکلے، اللہ رزق دے گا۔ جن کو رزق کا ڈر ہے وہ نکاتے ہیں۔ فلسفہ کی باتیں بہت بناتے ہیں۔ اب لائے میم صاحب کو۔ پھر وہ ویسٹرن سوسائٹی کا ملاپ ہوتے۔ ہوتے۔ ہوتے۔ اب وہ نوبت آئی کہ جو بے پردہ ہے اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ جو بیچاری پردہ کر رہی ہے، اے بن آپ ابھی تک پردہ کرتی ہیں۔ بڑی دقیا نوی ہیں آپ۔ ہم کہتے ہیں، آپ ابھی تک نماز پڑھتے ہیں۔ بڑے Backward ہیں۔ ارے نماز تو واجب ہے۔ تو پردہ بھی واجب ہے۔ بھی واجب واجب برابر ہے۔ وہاں ڈگریاں نہیں ہیں۔ تو کما نہیں صاحب یہ بات نہیں ہے۔ تو خیر وہ علماء کا کام ہے، میرا کام نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا عرض کروں گا آپ کے سامنے کہ کیوں آپ گارڈن پارٹیز میں، کیوں آپ تقاریب میں، کیوں آپ انگریزی نیشن میں، اپنی عورتوں کو بے پردہ لے جاتے ہیں۔ برقعہ پہنا کر کیوں نہیں لے جاتے؟ کما مولانا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اس سوسائٹی میں عورت چادر اوڑھ کر جائے، کیسا لگے گا۔ اچھا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو پردے سے اختلاف نہیں ہے۔ صرف اچھا نہیں لگے گا۔ یعنی ماڈرن سوسائٹی میں ہم اپنے گھر کی عورتوں کو دقیا نوی چادر

یہ غم حسینؑ یہ محرمؑ یہ دس دن کی مجلسیںؑ یہ رونا پیناؑ یہ ماتم کرناؑ یہ ہماری ماؤں بہنوں کا سیاہ لباس پہنناؑ یہ سر میں کٹھنی نہ کرناؑ یہ دس دن تک زینت نہ کرناؑ یہ ہاتھوں کی چوڑیوں کا توڑ دینا۔ یہ کوئی معمولی چیزیں ہیں۔ یہ اعمال کے وزن کو بوجھاتی ہیں کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہمارا ہے۔ نہیں اچھا ہےؑ نہیں اچھا ہےؑ مگر ہمارا ہے۔ یہ بڑی منزل کی بات میں آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں۔ یعنی آل محمدؑ سے لگاؤ کا امتحان ہے محرم۔ کیونکہ غم ہی کے موقع پر پتہ چلتا ہے کہ کون ہمارا ہے۔ رہ گیا آنسوؤں کا وزن۔ جتنے اعمال ہیں وہ سب کاندھے پر بیٹھے فرشتے لکھ کر لے جا رہے ہیں۔ دائیں کاندھے والا نیکیاں لکھ رہا ہےؑ بائیں کاندھے والا گناہ لکھ رہا ہے۔ ہمارا ہر سفید فرشتے نے لکھاؑ ہمارا ہر سیاہ فرشتے نے لکھا اور دونوں کو لے جا کر میزان پر رکھ دیا۔ مگر یہ آنسو فرشتہ نہیں لے جاتاؑ جناب سیدہؑ اپنے رومال میں لے جاتی ہیں۔ تو ان آنسوؤں کی کچھ قیمت ہے۔ جیسی تو حسینؑ کی ماں کہتی ہیں کہ آنسو جمع کرنے میں خود جاؤں گی۔

آج پانچویں محرم ہوگئی۔ یہ بہار عزاء ہے۔ یہ رونے کے دن ہیں۔ اور یہ ہمارے عزا کے رسومؑ یہ سیاہ لباسؑ یہ ماتمؑ یہ مجلسؑ یہ عزا خانےؑ ان کو آپؑ یہ نہ سمجھئے گا کہ اسلام سے ہٹ کر کچھ رواج ہیںؑ رسم ہے۔ جی نہیںؑ یہ حق ہے۔ کس کا حق ہے؟ حسینؑ ابن علیؑ کا حق ہے۔ کون حسینؑ؟ جس نے اپنا بھرا گھر کر ملا لیا۔ معمولی حق ہے حسینؑ کا۔ یہ ماتم و نوحہ ادائے حق ہے اور اس کا ایک استفادہ اور ہے مسلمانوں کے چونکہ اس مجلس میں بچپن آتے ہیںؑ دکھاری ماں آتی ہے۔ تو بچپن دیکھتے ہیں کون کون آیا۔ یہ دیکھنا قیامت میں بہت کام آئے گا۔ کیوں؟ میت ہی میں اندازہ ہوتا ہے کہ اپنا کون ہے۔ شادی میں کوئی نہ آئےؑ شکایت ہوتی ہے مگر رنج نہیں ہوتا۔ لیکن اگر غم ہی میں کوئی نہ آئے تو شکایت ہی نہیں ہوتیؑ رنج بھی ہوتا ہے۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ رسول اللہؐ روئےؑ مولائے کائناتؑ روئےؑ شہزادی کوئینؑ روئیںؑ حسنؑ روئےؑ انبیاءؑ ماسبق روئے۔ حسینؑ پر کون نہیں رویا۔ سب سے پہلے کون رویا؟ سب سے پہلے جناب آدمؑ روئے۔ لکھا ہے کہ جب جناب آدمؑ زمین پر آئے اور گریہ فرماتے تھےؑ دعا کرتے تھے کہ جبرئیلؑ نازل ہوئے۔ کہانی خداؑ ان ناموں کے واسطے سے دعا کرو۔ وہ جو دعا سے پہلے آپ دعا پڑھتے ہیںؑ جس میں آپ کہتے ہیں کہ محمدؑ کا واسطہؑ اس لیے کہ تو محمود ہے۔

رہے۔ اور آج کل جناب مردؑ عورت کو دن بہ دن بے وقوف بناتا چلا جاتا ہے۔ ڈرائیوری بھی سکھادی ہےؑ مارکیٹنگ بھی سکھادی ہے۔ خالی فرض کی بات رہ گئی تھی وہ بھی تعلیم دلا دی ہے۔ نوکری بھی دلا دی ہے۔ پہلے شادی ہوتی تھی کہ لڑکی جا کے لڑکے کا کھائے گی۔ اب شادی ہوتی ہے کہ لڑکی ایسی رکھو جس کی پکار زیادہ ہو تاکہ ہم کو زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔ دو ہزار ذریعہ آمدنی۔ توجہ فرمائی آپ نے۔ صاحب پوری نہیں پڑتی۔ پورا نہ پڑنا اسے کہتے ہیں۔ یہ تو مگر کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ سب کیوں پیدا ہو گیا؟ اس لیے کہ محبت اہل بیتؑ سے ہٹیؑ تو دنیا کی چاہت اور پیروی آگئی۔ لیکن جن کے دلوں میں آل محمدؑ کی محبت جاگزیں ہو جائے گی وہ یہ نہ دیکھیں گے کہ امریکہ کیا چاہتا ہےؑ یورپ کیا چاہتا ہےؑ ماڈرن سوسائٹی کیا چاہتی ہے۔ وہ یہ دیکھیں گے ہمارا مولاؑ کیا چاہتا ہےؑ ہماری شہزادیؑ کیا چاہتی ہےؑ ہمارے شہزادےؑ کیا چاہتے ہیں۔ اب اس میں طرح طرح کی بحثیں نکلتی ہیں۔ حضورؑ کچھ بیویاں یہ کہتی نظر آئیں کہ جب ہماری بی بی کا پردہ نہ رہا تو ہمارا کیا پردہ؟ لیکن بی بی کا پردہ نہ رہا تو جب چادر چھنیؑ بالوں سے منہ چھپایا اور سب سے زیادہ جو مصیبت بیان کی سید سجادؑ نےؑ وہ بے پردگی ہی کی مصیبت تھی۔

اب ایک اور جز ہم آپ کے سامنے عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک مسلک یہ بھی ہے کہ جب تک ایک مسلمان پورے طور پر پابند شریعت نہیں ہو جائے گاؑ کوئی چیز اس کو فیض نہیں پہنچائے گی۔ حالانکہ فکر کی بات یہ ہے کہ جب اعمال تولے جائیں گےؑ تول اور ناپ رکھی ہی اللہ نے اس لیے کہ میری بندوں سے نیکیاں بھی ہوں گیؑ گناہ بھی ہوں گےؑ تو چونکہ نیکیاں بھی ہوں گیؑ گناہ بھی ہوں گےؑ تو ہم انہیں تول کے سزا و جزا دے دیں گے۔ تول کی بات آپ کو یاد ہےؑ گنتی کی نہیں تول کی بات ہے۔ اب تولنے کی منزل میں جتنا عمل گراں ہوگا اتنا ہی نیکی کا پلہ جھکے گا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ نیکی کیا ہےؑ بدی کیا ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ کس نیکی کا وزن کیا ہےؑ کس بدی کا وزن کیا ہے۔ ایک گناہ ایسا ہو سکتا ہے جو پلہ جھکا دے بدی کا اور ایک نیکی ایسی ہو سکتی ہے جو پلہ جھکا دے نیکیوں کا۔ تو یہ تو وہی جانے جو وزن جانتا ہے۔ تو کچھ اہل بیتؑ وزن جانتے تھےؑ اللہ وزن جانتا تھاؑ رسولؑ وزن جانتا تھاؑ اسی لیے محبت کو اجر رسالت میں مانگا کہ کم سے کم محبت سے اعمال کا وزن بڑھ جائے۔

ہے تو آنسو نکلتے ہیں اور محبت نہیں ہوتی تو آنسو نہیں نکل سکتے۔ رونا دلیل محبت ہے۔ خود امامؑ نے فرمایا ہے کہ ”نہ سنے گا میرا دوست میرا تذکرہ مگر یہ کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔ اس لیے کہ مجھے رلا رلا کے قتل کیا گیا۔“ کبھی بھانجوں کی لاش پر روئے، کبھی بھتیجیوں کی لاش پر روئے، کبھی بھائی کی لاش پر روئے، کبھی کڑیل جوان کی لاش پر روئے، حسینؑ صبح سے شام تک نماز صبح کے بعد سے، جنگ مغلوبہ کے بعد سے، جتنے جنازے اٹھا کے لائے۔ حسینؑ سب کو اٹھا لائے، مگر حسینؑ کو لانے والا کوئی نہیں رہا اور وہ بھانجے عونؑ و محمدؑ جو شب عاشور ماں کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ماں شمع جلائے بیٹھی تھی۔ عونؑ محمدؑ تم جعفرؑ کے پوتے ہو۔ تمہارے دادا یوں جہاد کرتے تھے۔ تم علیؑ کے نواسے ہو۔ تمہارے ناناؑ نے بدر میں یوں جہاد کیا، احد میں یوں جہاد کیا، خندق میں یوں جہاد کیا، خیبر میں یوں جہاد کیا۔ عونؑ و محمدؑ نے کہا ”مادر گرامی، آپ ہمیں شجاعت دلا رہی ہیں۔ ماموں جان سے اجازت دلا دیجئے گا۔ اگر عمر سعد (لعین) کا سر کاٹ کر نہ لے آئیں تو ہمارا نام عونؑ و محمدؑ نہیں۔“ بڑی ڈھارس ہو گئی زینبؑ کو۔

صبح عاشور نمودار ہوئی۔ بار بار شہزادے جاتے تھے، آقاہم کو مرنے کی اجازت دیجئے۔ حسینؑ کہتے تھے، ٹھہر جاؤ عونؑ و محمدؑ رک جاؤ۔ بچے رک جاتے تھے۔ ایک وقت وہ آیا کہ خیمے میں آئے، تو ماں نے دیکھا۔ تو عونؑ و محمدؑ نے کہا ہم آقا کے پاس گئے تھے۔ آقا نے کہا ابھی اجازت نہیں ہے۔ دونوں بھائی زانوؤں پر سر رکھ کے، با آواز بلند رونے لگے۔ ماں کا دل تڑپ گیا۔ پوچھا بچوں کیوں رو رہے ہو۔ کہا ماں آپ مشکل کشا کی بیٹی ہیں۔ ہم بڑی مشکل میں گرفتار ہیں۔ کہا میرے لال کیا ہوا؟ کہا ہم خیمے میں آتے ہیں تو آپ گرم نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ آپ کو خیمے میں آنا پسند نہیں۔ ماموں کے پاس جاتے ہیں تو ان کو ہمارا مرنا پسند نہیں۔ ہم کیا کریں؟ اماں اب چل کے اپنے بھائی سے ہماری سفارش کر دیجئے۔ جناب زینبؑ عونؑ و محمدؑ کے بازو پکڑ کے خدمت امامؑ میں آئیں۔ حسینؑ نے دیکھا، کہا زینبؑ یہ تم کو سفارش میں لائے ہیں۔ اے بہن میں تو اس لیے روک رہا ہوں کہ یہ مرجائیں گے تو تم کیا کرو گی؟ کہا بھیا خدا اعلیٰ اکبرؑ کو سلامت رکھے، مجھے ان کے مرنے کا کوئی غم نہیں ہے۔ بھیا میں انہیں قربان گاہ اسلام پر قربان کرنا چاہتی ہوں۔ کہا بہن ایک کو بھیجو، ایک کو روک لو۔ کہا بھیا کیا کریں ایک میری طرف

علیؑ کا واسطہ، اس لیے کہ تو اعلیٰ ہے۔ فاطمہؑ کا واسطہ، اس لیے کہ فاطمہؑ السمواۃ ہے۔ اور اے اللہ تجھے حسنؑ کا واسطہ، اس لیے کہ تو حسن ہے۔ تجھے حسینؑ کا واسطہ کہ تو قدیم الاحسان ہے۔ یہ وہ دعا ہے جو جناب آدمؑ نے پڑھی۔

روایت ہے کہ جب جناب آدمؑ پختن کے واسطے دے رہے تھے تو جب حسینؑ کے نام پر پہنچے کہ حسینؑ کے حق کا واسطہ تو آنکھوں سے آنسو نکلتے گئے، دل تڑپنے لگا۔ کہا ”جبرئیل یہ کونسا نام تم نے لیا کہ دل بے قرار ہو گیا؟“ تو جبرئیل نے کہا ”اے آدمؑ یہ آخری نبیؑ کا نواسہ ہے۔ یہ کربلا میں تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا جائے گا۔“ بھار الانوار میں ہے کہ جناب آدمؑ تلاش حوا میں نکلے اور زمین کربلا سے گزر رہا تھا تو جوتے کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ گرے پیر زخمی ہوا، خون نکلتے لگا۔ کہا ”معبود کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی؟“ جس کی پاداش میں یہ اذیت پہنچی؟“ تو آواز آئی ”نہیں آدمؑ یہ کربلا ہے۔ یہاں میرے آخری نبیؑ کا نواسہ تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا جائے گا۔ خاصان خدا میں سے کوئی نہیں گزر سکتا مگر یہ کہ اسے کچھ اذیت پہنچے۔“ تو آج آپ کو ہمارے رونے پر اعتراض ہے۔ کسی میں ہمت ہو تو آدمؑ کے رونے پر اعتراض کرے۔

حسینؑ پر رونا آدمیت کی دلیل ہے۔ جو حسینؑ پر روئے گا نہیں، میں یہ بحث نہیں کروں گا وہ کون ہے، میں تو پوچھوں گا آدمی بھی ہے کہ نہیں؟ کیونکہ آدمؑ روئے ہیں حسینؑ کے غم میں اور کسی کے غم میں رونا آسان بھی نہیں ہے۔ یہ ماتم و گریہ، یہ وعدہ الہی ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے۔ جب دکھیا ری ماں نے پوچھا تھا ”بابا میرے حسینؑ پر روئے گا کون؟“ تو کہا تھا ”ہم نسل بعد نسل ایک گروہ کو پیدا کریں گے جو غم حسینؑ میں روتا رہے۔“ ہم رو کے کوئی احسان نہیں کرتے، یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہم اسی نسل سے ہیں جسے حسینؑ کے غم میں رونے کے لیے پیدا کیا۔ اور یہیں پر بات تمام نہیں ہوتی۔ حسینؑ نے پوچھا تھا کہ ”نانا یہ بتائیے کہ رونے والوں کے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟“ تو فرمایا تھا ”حسینؑ مجھ سے پوچھتے ہو، مجھے حق شفاعت ہو گا۔ میں ایک ایک روئے والے کو بخشاؤں گا۔“ ”بابا آپ؟“ کہا ”کوثر کا پانی پلاؤں گا“ اس لیے کہ قیامت میں قیامت کی پیاس ہو گی۔ ”بھیا حسنؑ آپ؟“ کہا ”بھیا جتنا حق شفاعت ہے سب تمہارے رونے والوں کے لیے ہے۔“ تو یہ آنسو نجات سے قریب کرتے ہیں۔ یہ طے ہے کہ محبت ہوتی

کے سینے پر سینہ رکھ دیا، بغل گیر ہو کے یا علیؑ کہہ کے اٹھے۔ ایک جنازے کو سینے سے عباسؑ نے لگایا۔ ادھر فضاؑ در خیمہ پہ کھڑی تھیں۔ جناب زینبؑ دروازے کے پاس تھیں۔ فضاؑ کیا دیکھا؟ کہا شزاویؑ بچے چچا اور ماموں کی گود میں آرہے ہیں۔ جناب زینبؑ جنہوں نے فرش عزا بچایا تھا، ایک خیمہ خالی کر کے مسند بچھائی تھی، اس مسند پر مٹیوں لا کر رکھی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ عباسؑ نے آواز دی، فضاؑ پردہ اٹھاؤ۔ فضاؑ نے پردہ اٹھایا۔ جنازے خیمہ گاہ میں رکھ دیئے گئے۔ اے نوجوانوں، اے ماتم داروں، کیوں سب روتے ہو؟ اس لیے کہ کربلا میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی تھے۔ لکھا ہے دونوں بچوں کے ہاتھ سینوں پر رکھے تھے۔ شاید بتا رہے تھے کہ ہم ابھی سے ماتم حسینؑ کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ لکھا ہے کہ بی بیائیں جمع ہو گئیں۔ حسینؑ نے کہا زینبؑ کو بلاؤ۔ بی بیائیں گئیں۔ بی بی چلنے آقا بلا رہے ہیں، شزاویوں کے جنازے آئے ہیں۔ جس زینبؑ نے دن بھر سب کا پرہ لیا اس بی بی نے کہا، میں نہ جاؤں گی، مجھے نہ لے جاؤ۔ ارے میرا علی اکبرؑ سلامت رہے۔ مجھے عونؑ و محمدؑ کا پرہ نہیں چاہیے۔ بیبیوں نے اگر کہا آقا جناب زینبؑ نہیں آ رہی ہیں۔ کتنی ہیں میں نے صدقے اتارے ہیں علی اکبرؑ پر سے، میں ان کا پرہ نہ لوں گی۔ تو حسینؑ اٹھے۔ بن کے خیمے میں گئے اور آواز دی، بن ذرا چل کر تو دیکھ لو، تمہارے بچوں کے چہروں پر کیسا نور ہے۔ بھائی کے کہنے سے بن آئی، سینے پر سر رکھ دیا۔ عونؑ و محمدؑ تم نے ماں کا دل شاد کر دیا۔ میں نے دودھ بخش دیا۔ تم نے جعفرؑ و حیدرؑ کا نام بچالیا۔



سے جان دے گا، ایک اپنے باپ کی طرف سے جان دے گا۔ ان کے باپ نے چلتے وقت کہا تھا، بی بی دونوں کو لے جائے۔ ایک کو میری طرف سے نثار کر دیجئے گا، ایک اپنی طرف سے نثار کر دیجئے گا۔ حسینؑ نے کہا بن تمہاری سفارش نے مجبور کر دیا۔ جاؤ سعد حارو۔

بیبیوں سے عونؑ و محمدؑ رخصت ہوئے۔ خیمے کا پردہ اٹھا، شزاویؑ نکلے۔ ایک کو عباسؑ نے گھوڑے پر سوار کیا، ایک کو علی اکبرؑ نے گھوڑے پر سوار کیا۔ شزاویؑ جانے لگے۔ ماں نے کہا ایک بات سنتے جاؤ عونؑ و محمدؑ۔ کہا مادر گرامی کیا ہے؟ کہا دیکھو لڑتے ہوئے فرات کے کنارے نہ جانا ورنہ ماں دودھ نہ بخشے گی۔ تو مقابل نے لکھا ہے کہ عونؑ و محمدؑ نے فرات کی طرف پیٹھ کر کے جہاد فرمایا۔ اور جس وقت یہ شزاویؑ جنہیں فتون جنگ جناب عباسؑ نے سکھائے تھے، میدان جنگ میں آئے تو عباسؑ در خیمہ سے تعریف کر رہے تھے۔ سبحان اللہ، مرجا۔ بی بی زینبؑ پوچھ رہی تھیں، بھیا عباسؑ میری بچے کیسا لڑ رہے ہیں؟ فرماتے تھے کہ اے شزاویؑ علیؑ و جعفرؑ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لشکر شام پر حملہ کیا۔ ایک مہینے پر ٹوٹا، ایک مہینے پر ٹوٹا۔ فرماتے ہیں کہ اپنی نظروں کو خیمہ عمر سعد (لعین) پر جماؤ، ہم اس طرف بڑھتے ہیں۔ تم اس طرف سے آؤ اور جب یہ میدان میں کھینچے ہیں تو میرا نہیں فرماتے ہیں کہ یہ جن گھوڑوں پر بیٹھے تھے، ان گھوڑوں کی چال و رفتار اور ان کا عالم یہ تھا کہ۔

برچھوں اڑتا تھا جو دب دب کے فرس راتو سے

اکھ لڑ جاتی تھی دریا کے تگہانوں سے

حملہ فرمایا۔ زینبؑ در خیمہ پہ ہیں۔ بار بار آواز محسوس کر رہی ہیں۔ کہ ایک مرتبہ میدان سے آواز آئی، آقا ہمارا آخری سلام قبول کیجئے۔ بس حسینؑ سوار ہوئے گھوڑے پر، عباسؑ سوار ہوئے، علی اکبرؑ سوار ہوئے۔ مثل شیر غضب ناک جھپٹے۔ پکارتے جاتے تھے عونؑ و محمدؑ کہاں ہیں؟ حیدرؑ کہتا ہے کہ حسینؑ کو ہم نے کئی بار غیض میں دیکھا۔ ایک وہ بھی وقت تھا جب عونؑ و محمدؑ کے لیے میدان میں آرہے تھے۔ پہنچے، دیکھا کہ بچے آخری سانس لے رہے ہیں۔ سراٹھا کر زانو پر رکھا۔ چہرہ کو خون سے پاک کیا۔ بچوں نے آخری پگھلی، دم توڑا۔ حسینؑ نے کہا بھیا عباسؑ ان کو خیمہ گاہ میں لے چلو۔ حسینؑ نے ایک

بھی حق ہے جس نے دین پہنچایا ہے۔ سرور کائنات، ختمی مرتبت، جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی امت پر حق ہے۔ اس لیے کہ سرور کائنات نے بڑی محنت سے، بڑی مشقت سے، ۲۳ سالہ تبلیغی زندگی میں اللہ کے دین کو بندوں تک پہنچایا ہے۔ یعنی اسلام کو پہنچانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ آج آپ کو معلوم ہے کہ تبلیغات اسلامی میں کتنی زحمتیں علماء کو اٹھانا پڑتی ہیں۔ کس کے درمیان؟ کفار کے درمیان نہیں، مشرکین کے درمیان نہیں، لہدین کے درمیان نہیں، خود مسلمانوں کو اسلام سمجھانا کتنا دشوار ہو گیا ہے۔ تو آپ غور فرمائیے کہ کفار اور مشرکین کو اسلام سمجھانا کتنا مشکل عمل تھا۔ اس لیے جو پیغمبر اسلام نے زحمتیں اٹھائیں، جو ازیتیں اٹھائیں حضورؐ نے، جو تکلیفیں برداشت کیں، آخر اس کا کچھ حق مسلمانوں پر ہوا کہ انہیں اور اسی حق کو مسلمانوں نے محسوس کیا۔ جیسی تو اجرت لے کر آئے اور جو اجرت لے کر آئے وہ اس محنت کے متوازن نہیں تھی، برابر نہیں تھی۔ اس لیے جس چیز سے اجرت دی جا رہی تھی وہ واپس کر دی گئی اور جو پیغمبر کا مختانہ تھا وہ طلب کر لیا گیا۔ رسولؐ کی محنتوں میں، اجر رسالت میں، صرف اہل بیتؑ کی محبت طلب کی گئی۔ اقرباء کی مودت طلب کی گئی اور اس میں بہت سی بحیثیں اٹھتی ہیں۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اجرت سے کیا مراد ہے؟ اور پھر یہاں سوال کا سوال ہے، براہ راست واجب نہیں ہے اور قرابت دار میں تو سبھی آتے ہیں۔ کچھ یہاں تک کہتے ہیں قرابت داروں میں کہاں کہاں ہے کہ رسولؐ کے قرابت دار مراد ہے۔ یہ تو نہیں کہا قل لا اسئلكم علیہ اجرا“ الا المودة فی القربی۔ اللہ تو یہ کہہ رہا ہے کہ ”کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ قرابت داروں سے محبت رکھو۔“

تو قرابت داروں کی محبت سے مراد ہمارے اپنے قرابت دار ہیں یعنی باپ کو چاہو، ماں کو چاہو، بھائی کو چاہو، بہن کو چاہو، بیٹے کو چاہو، بیٹی کو چاہو، سہیلیاں کو چاہو، سرال والوں کو چاہو، غرض یہ سب مراد ہے۔ نبیؐ کے قرابت دار مراد نہیں ہے۔ تو ہمیں تو کہا نہیں ہے نبیؐ کے قرابت دار۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کچھ کہا جائے۔ یہ بات تجربہ میں ہے کہ آدمی سمجھتا سب ہے، کہتا کچھ ہے، جو اسے کہتا ہوتا ہے، وہ کہتا ہے، جو بحث کرنا ہوتی ہے، اس پر بحث کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سیاہ کو سفید کہے۔ میں نے

چھٹی مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل لا اسئلكم علیہ اجرا“ الا المودة فی القربی

برادران ملت!

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرما رہا ہے کہ ”اے میرے حبیب آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقرباء ہیں، ان سے مودت رکھو، ان سے محبت رکھو۔“

اس آیت کے ذیل میں محفل مرتضیٰ کے اس عشرہ اول میں آپ کی خدمت میں ”محبت اہل بیتؑ“ پر جو گفتگو جاری ہے وہ کل اس منزل تک پہنچی تھی کہ اسلام دین حقوق ہے اور مختلف حقوق بندوں کے اللہ نے بندوں پر قائم کیے ہیں۔ کچھ حقوق اللہ کے ہیں اور کچھ حقوق بندوں کے ہیں جو اللہ نے مہین فرمائے ہیں۔ جو حقوق اللہ کے ہیں وہ حقوق اللہ کہلاتے ہیں۔ جو حقوق بندوں کے ہیں وہ حقوق العباد کہلاتے ہیں۔ اسلام صرف حقوق اللہ کے ادا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اسلام حقوق العباد کے ادا کرنے کا بھی نام ہے۔ اللہ اپنے حق کو تو معاف کرنے کے لیے تیار ہے مگر بندے کے حق کو معاف کرنے پر تیار نہیں۔ تو جس دین میں سب کے حقوق ہیں اس دین، اس رسولؐ کا

جسے بھی قرابت ہو جائے۔ اس کی مودت، اس کی محبت، اجر رسالت قرار پا جائے گی۔ کیونکہ لفظ اقربا ہے لیکن جس قانون میں آپ قانون کی لفظوں کو پڑھتے ہیں اسی قانون کی تعریف اسی قانون میں موجود ہوتی ہے۔ قانون کے لفظوں کو دشمنی میں تلاش نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے آج اتنی دنیا سمجھ دار ہے کہ ہر اسمبلی، ہر مقدمہ، ہر قانون ساز جب قانون بناتی ہے تو پہلے ہی بتا دیتی ہے کہ اس قانون کے لیے یہ وضاحتیں ہیں، یہ شرحیں ہیں، یعنی اس قانون میں اس لفظ کے یہ معنی ہیں۔ کیونکہ دشمنی میں ایک ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ کوئی ناجائز قائدہ اٹھانے کے لیے قانون سے دشمنی سے کوئی معنی کسی عدالت کے سامنے پیش کر کے اپنا مطلب حاصل کر لے۔ اسی لیے اسے ”تعریف“ کہا جاتا ہے۔ ہر قانون میں ”تعریف“ کا باب ہوتا ہے جس میں واضح کر دیا جاتا ہے کہ کس لفظ کے کیا معنی ہیں۔ تو جب قانون کی کتاب میں تعریفوں میں واضح طور پر کہہ دیا گیا کہ اس قانون کے تحت اس لفظ کے کئی معنی ہیں تو پھر کوئی لفظ مراد نہیں ہوگا۔ تو جب قرآن مجید کو ہمیں پڑھنا ہے اور رسولؐ کے اقرباء کی بات ہے، تو قرابت دار ہم اپنے رشتوں سے اور اپنی دشمنی سے نہیں دیکھیں گے، قرآن سے پوچھیں گے کہ قرآن نبیؐ کا قرابت دار کسے سمجھتا ہے۔ صلوٰۃ

آپ مجھ سے بہتر واقف ہیں۔ ایک اشارہ کرنا چلوں گا۔ بیٹا قرابت دار ہوتا ہے کہ نہیں؟ بیٹا باپ کا رشتہ دار ہے کہ نہیں؟ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، باپ کی اولاد بیٹا۔ بیٹا ہی تو وارث ہوتا ہے، بیٹا ہی تو جائیں ہوتا ہے، بیٹا ہی تو باپ کے لیے سب کچھ کرتا ہے۔ بیٹا قرابت دار نہ ہوگا تو کون ہوگا۔ چنانچہ ایک موقع پر جب ایک نبیؐ نے اپنے بیٹے کے لیے کہا ”معبود یہ میرا بیٹا ہے۔ معبود یہ میری اولاد ہے۔“ تو کیا آواز آئی لمس من اھلک ”اے نوحؑ یہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے۔“ نوحؑ کہہ رہے ہیں میرا بیٹا ہے، خدا کہہ رہا ہے تمہارے اہل میں سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی رو سے نبیؐ کو بھی حق نہیں ہے اپنے اہل کے قرار دینے کا۔ یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے کہ جسے چاہے اہل میں رکھے، جسے چاہے اہل سے خارج کر دے۔ صلوٰۃ

یعنی قوانین قرآن میں اللہ نے یہ حق اپنے لیے رکھا اس لیے کہ جب نبیؐ دنیا میں آئے گا تو کسی کا بیٹا بھی ہوگا، کسی کا باپ بھی ہوگا، کسی کا بھائی بھی ہوگا، کسی کا شوہر بھی

اگر یہ کہا کہ نیاز ہے گی، آج نیاز بیٹ رہی ہے۔ تو آپ نے کہا یہ تو نہیں کہا کہ جو مجلس میں آرہے ہیں ان کو مل رہی ہے۔ کارکن دیکھ اٹھا کر لے گئے۔ دوسری جگہ بانٹ آئے۔ آپ نے یہ تو کہا نہیں تھا۔ تو ہر بات کسی نہیں جاتی۔ اللہ نے عقل کس لیے دی ہے؟ وہ سمجھنے کے لیے دی ہے۔ سوال کس کا ہے؟ نبیؐ کا سوال ہے۔ اور اقربا ہمارے مراد ہوں گے۔ تو ہم کیا ہیں اور ہمارے قرابت دار کیسے ہیں، وہ سب جانتے ہیں۔ مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا لیکن میں جو چیز آج کی مجلس میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جذبہ ہی کیوں پیدا ہوا مسلمانوں میں کہ وہ ہر بات کو تسلیم کرے گا لیکن جہاں پر اہل بیتؑ کی بات آئے گی وہاں کوئی نہ کوئی عذر تلاش کر لے گا۔ یہ بات مقام فکر میں ہے۔ یہ بات غور طلب ہے۔ یہ بات تحقیق کی جانا چاہیے کہ ہر بات منظور ہے، لیکن جب اہل بیتؑ کا لفظ آجاتا ہے تو ہم کو یہ سمجھ میں نہیں آتا، وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی سمجھ میں مسئلہ اہل بیتؑ ہی نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں اسلام اس کی سمجھ میں آتا ہی نہیں۔ صلوٰۃ

”قل“ کہہ دو، ”لا اسئلكم“ کوئی سوال نہیں۔ تم سے کوئی سوال ہی نہیں۔ ”اجر“ اجر کے سلسلے میں۔ یعنی میرے رسولؐ کے پاس جو محنت ہے اور جو رسولؐ اللہ نے اسلام پہنچایا ہے اس سلسلے میں تم سے کوئی سوال نہیں۔ ”مودۃ فی القرۃ“ سوائے راضی۔ کس بات سے؟ اقربا کی مودت سے۔ تو جب ”لا“ اور ”اللہ“ کے بعد مودت کو سوال بنا کے مانگا گیا ہے تو یہ یاد رکھنا مسلمانوں کہ اسلام میں ”لا“ اور ”اللہ“ کی بڑی اہمیت ہے۔ ”لا الہ الا اللہ“ کوئی اللہ نہیں ہے، سوائے اس وحدہ لا شریک کے۔ اب کسی کے اللہ کا تصور پیدا ہوا، مشرک ہو گیا، کفر ہو گیا، پھر تم سب کچھ رہے مسلمان نہیں رہے۔ اس لیے کہ لا اسئلكم علیہ اجرا ”الا المودۃ فی القرۃ“ کوئی سوال نہیں ہے سوائے اقرباء کی مودت کے۔

یعنی یہاں گنجائش ہی نہیں ہے کسی تصور کی۔ کیونکہ ”لا“ کہہ کے ”اللہ“ کہا ہے۔ بس بس، صرف اور صرف یہی اجر رسالت ہے کہ اقربا سے مودت رکھو۔ اب سوال یہ ہوگا کہ قرابت داروں سے کون مراد ہے۔ لفظ اقربا کہا ہے۔ اقربا یعنی قرابت دار۔ جب قرابت دار کی بات آئی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جسے بھی قربت ہو جائے رسولؐ سے

تبت ہذا ابی لہب۔

سبحان اللہ ہم سے کہہ رہا ہے کہ قرابت داروں سے محبت کر کے اجر رسالت ادا کرو اور نبی کے چچا کے لیے قرآن میں فرما رہا ہے ”تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں“ کیا ابولہب (لعین) قرابت دار نہیں تھا؟ کہا ٹھیک ہے، اس سے کیا مطلب۔ کیوں مطلب نہیں چچا تھا۔ کہا چچا تو تھا، مگر ایمان نہیں لایا تھا۔ تو ایمان سے کیا ہوتا ہے؟ رشتہ دار تو تھا، قرابت دار تو تھا۔ تو مسلمان کتے ہیں نبی کی قرابت ہر کس و ناکس کو نہیں بنے گی۔ تو اس کا مطلب یہ کہ جتنے بھی قرابت دار تھے ان میں جو ایمان لائے گا وہ قرابت دار رہ جائے گا۔ اور جو ایمان نہیں لائے گا تو قرابت داروں میں اس کا شمار نہیں ہوگا۔ چلیے مان لیا۔ ایمان لانے کا ثبوت تاریخ سے مل جائے گا۔ مومن رہنے کا ثبوت کہاں سے لائیے گا؟ اگر مرتے وقت کسی نے خدا کے وجود کا انکار زبان سے نہیں دل سے کر دیا تو کافر ہو جائے گا کہ نہیں؟ اب آپ تو قرابت دار سمجھ کے اس کی محبت میں اجر رسالت ادا کر رہے ہیں اور اس کی موت حالت کفر میں ہو رہی ہے۔ تو کون معین کرے؟ تو ”تعریف“ قانون کا فرض ہے۔ وضاحت اللہ کا فرض ہے۔ تو اللہ نے کہا میں تمہیں اپنے رسول کے قرابت داروں کو پہنچوائے دیتا ہوں۔ دو اوقات میں، میں رسول کے قرابت داروں کو بلاؤں گا۔ ایک مرتبہ گھر میں پہنچواؤں گا۔ ایک مرتبہ میدان میں پہنچواؤں گا۔ تاکہ گھر میں بیٹھے والیاں یہ نہ کہیں کہ ہمیں نہیں پتا کہ نبی کے قرابت دار کون تھے اور باہر نکلنے والے یہ نہ کہیں کہ ہمیں پتا نہیں نبی کے قرابت دار کون تھے۔

صلوٰۃ

آج گھر سے باہر کی بات سن لیں۔ قرآن مجید میں ایک آیت نازل ہوئی۔ مباہلہ کے وقت، نصارائے نجران سے مقابلے کے وقت، جس میں سچے بلائے گئے۔ آواز دی ”میرے حبیب آپ ان سے کہہ دیجئے کہ لاؤ تم اپنے بیٹوں کو، لاتے ہیں ہم اپنے بیٹوں کو، لاؤ تم اپنی عورتوں کو، لاتے ہیں ہم اپنی عورتوں کو، لاؤ تم اپنے نفسوں کو، لاتے ہیں ہم اپنے نفسوں کو، تاکہ جھوٹوں پر لعنت کہیں اور جو جھوٹا ہو اس پر عذاب الہی نازل ہو۔“

یعنی جہاں بیٹوں کا، عورتوں کا، ذکر کیا قرآن نے وہاں شرط رکھ دی کہ ایسے مواقع پر

ہوگا، کسی کا نانا بھی ہوگا، کسی کا دادا بھی ہوگا، سب ہی رشتے بشری ہوں گے۔ لیکن چونکہ وہ الہی عہدے دار ہے لہذا الہی عہدے دار ہونے کی وجہ سے اس کی قرابت، اس کی رشتہ داری، از روئے اسلام، شریعت اسلام اور قانون قرآن، اللہ کے ہاتھ میں ہوگی۔ ایک گورنر ہے آپ کے سندھ کا، گورنر کا بیٹا گورنر کی جائیداد کا وارث ہوگا۔ کلکٹر کا بیٹا کلکٹر کی جائیداد کا وارث ہوگا۔ صدر کا بیٹا صدر کی جائیداد کا وارث ہوگا۔ لیکن نجی جائیداد کا وارث ہوگا۔ عہدے کا وارث نہیں ہوگا۔ کبھی آپ نے نہیں دیکھا کہ کسی صدر کا بیٹا یہ چیلنج کرے کہ چونکہ ہمارا باپ صدر تھا، وہ مر گیا لہذا ہم صدر ہیں۔ کسی کلکٹر کا بیٹا یہ کہے کہ میرا باپ کلکٹر تھا، وہ مر گیا۔ ہم اس کے بیٹے ہیں لہذا کلکٹر کا عہدہ ہم کو ملنا چاہیے۔ کیوں کیا بات ہے۔ یہ وراثت نجی جائیداد کی ہے۔ عہدے کی وراثت نہیں ہے۔ عہدے پر لانے کا کسے حق ہے؟ جہاں عوام کو حق ہے، وہاں عوام کو حق ہے۔ جہاں صدر کو حق ہے، وہاں صدر کو حق ہے۔ جہاں کورٹ کو حق ہے، وہاں اسے حق ہے۔ یعنی ایک لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حقیقت لحاظ، لحاظ کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ تو جب نبی کی قرابت مراد لی جائے گی تو بشری قرابت نہیں ہوگی، نبوت کی قرابت ہوگی۔ اور نبوت کی قرابت میں وہی قریب ہوگا، وہی اقرب ہوگا، وہی قرابت دار ہوگا، جس کی تعریف قرآن سے ثابت کر دی جائے۔ ویسے میں بھی قرابت دار ہوں اللہ کے رسول کا، اس لیے کہ سید ہوں اور نہ جانے کتنے سادات محمد اللہ آج بھی موجود ہیں۔ جس کی اولاد کو امت نے مٹانا چاہا، اللہ نے آواز دی۔ انا اعطینک الکوفہ ”میرے حبیب ہم نے آپ کو کثرت اولاد دی۔“ جتنا قتل سادات ہوا، اتنے ہی سادات آج ساری دنیا میں نظر آتے ہیں۔ تو کیا سارے سادات سے محبت اجر رسالت ہے؟ صلوٰۃ میں کہہ رہا ہوں کہ میں سید ہوں، نجیب الطرفین سید ہوں، لہذا مجھ سے محبت کیجئے، مجھے چاہیے، میرے چشم امرو کے اشارے پر چلیے۔ اس لیے کہ میں حضور کا قرابت دار ہوں۔ اور قرآن یہ کہتا ہے کہ تم سے قرابت دار کی محبت طلب کی جا رہی ہے۔ لہذا مراد میں ہوں۔ تو آپ کہیں گے آپ اولاد رسول ضرور ہیں، حق سادات کے مستحق ہیں، حق قرابت کے مستحق نہیں ہیں۔ تو قرابت کی تعریف کیا ہے؟ اگر قرابت دار سے مراد یہاں رشتہ دار ہیں، رشتہ دار یاں ہیں تو ابولہب (لعین) چچا تھا جس کے لیے قرآن نے کہا

بیٹوں کو بلاؤں گا، ایسے موقع پر عورتوں کو بلاؤں گا، ایسے موقع پر نفوس کو بلاؤں گا، جہاں جھوٹوں پر لعنت کہنا ہوگی۔ یعنی وہی اولاد آسکتی ہے جو جھوٹے پر لعنت کہہ سکتی ہو۔ وہی عورتیں آسکتی ہیں جو جھوٹوں پر لعنت کہہ سکتی ہوں۔ وہی نفس آسکتے ہیں جو جھوٹوں پر لعنت کہہ سکتے ہوں۔ لعنت وہ نہیں ہے جو آج ہم آپ سمجھتے ہیں۔ لعنت کتنے ہیں دعائے بد کو اور وہاں قرآن میں خدا کہہ رہا ہے کہ تم لعنت کہو۔ یعنی جھوٹوں کے لیے بد دعا کرو۔ تو جو جھوٹا ہوگا اس پر عذاب الہی نازل ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر نبی کے ساتھ ایک شخص بھی ایسا چلا جائے جس نے زندگی میں ایک بھی جھوٹ بولا ہو، تو جب عذاب آئے گا تو اگر ادھر آئے گا تو ادھر بھی آئے گا۔ اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ مرے حبیب! ان بیٹوں کو لے جانا، جھوٹ جن کے قریب سے گزرا نہ ہو۔ ان عورتوں کو لے جانا، جس جن کے دروازے تک آیا نہ ہو۔ ان نفوس کو لے جانا جن کا جس سے کوئی تعلق نہ ہو تاکہ جب عذاب آئے تو وہ ادھر ہی آئے، ادھر نہ آئے پائے۔ صلوٰۃ

یعنی خدا یہ سمجھا رہا ہے کہ میرا رسول سچا ہے، میرا رسول صادق ہے، میرا رسول امین ہے۔ اب اس کے قرابت داروں کو جب میں آواز دوں گا تو صرف رشتہ کے قرابت دار ہی آنے کے مستحق نہ ہوں گے بلکہ صرف وہ قرابت دار مراد ہوں گے جو صفات میں بھی قرابت رکھتے ہوں۔ اگر یہ سچا ہے تو وہ بھی سچے ہوں۔ تو آواز دی "لاؤ تم اپنے بیٹوں کو، لاتے ہیں ہم اپنے بیٹوں کو، لاؤ تم اپنی عورتوں کو، لاتے ہیں ہم اپنی عورتوں کو، لاؤ تم اپنے نفوس کو، لاتے ہیں ہم اپنے نفوس کو۔" مجھے حیرت ہے کہ آج مسلمان ہم سے بحث کرتا ہے کہ آپ اقربائے رسول میں صرف حسینؑ صرف بی بی فاطمہؑ صرف علیؑ کو کیوں قرار دیتے ہیں۔ دوسرے قرابت داروں کے نام کیوں نہیں لکھتے؟ ہم سے آپ بحث کرتے ہیں۔ ایک دن نبیؐ سے بحث کی ہوتی کہ کیا بیٹوں میں یہی دو بیٹے ہیں۔ کیا عورتوں میں یہی ایک عورت ہے۔ کیا نفوس میں یہی ایک نفس ہے؟ یا رسول اللہ آیت کی کھلی چھوٹ ہے، جتنے بیٹے چاہیے، لے جائیے۔ جتنی عورتیں ہیں، لے جائیے۔ نساء، نساء، نساء، کم لفظ بھی وہ جن کے رکھ دیا قرآن میں جس کے تینوں معنی ہیں۔ قرآن میں "نساء" کا لفظ بیٹی کے لیے بھی صرف ہوا۔ قرآن میں "نساء" کا لفظ ماں کے لیے بھی صرف ہوا۔ قرآن میں "نساء" کا لفظ زوجہ کے لیے بھی صرف ہوا۔ یعنی

آیت کا لفظ چھوٹ دے رہا ہے۔ چاہے بیٹوں کو لے جاؤ، چاہے بیویوں کو لے جاؤ، چاہے ماؤں کو لے جاؤ۔ ہم "نساء" کہہ رہے ہیں۔ لیکن جب پیغمبرؐ گھر سے نکلے تو ازواج مطہرات نظر نہیں آئیں۔ جب پیغمبرؐ گھر سے نکلے تو اگر تاریخ کتنی ہے اور بھی بیٹیاں تھیں۔ تو مباہلے میں کوئی نظر نہیں آئی۔ کون نظر آئیں؟ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا۔ اے میرے رسول! میں نے تم سے "نساء" کے لے جانے کے لیے کہا ہے۔ "نساء" کے معنی بیٹی کے بھی ہیں، "نساء" کے معنی زوجہ کے بھی ہیں۔ "نساء" کے معنی ماں کے بھی ہیں۔ تو رسولؐ نے کہا معبود اس عورت کو لے جاؤں گا جو میری بیٹی ہے، علیؑ کی زوجہ ہے، حسینؑ کی ماں ہے۔ صلوٰۃ

میں اپنے اس موضوع کو مکمل کر رہا ہوں کہ یہ قرابت داروں کو کھلے عام میدان میں اللہ پہنچا رہا ہے۔ قرابت داروں میں یا عورتیں ہوں گی، قرابت داروں میں یا نفوس ہوں گے، قرابت داروں میں اولاد ہوگی۔ لیکن پیغمبرؐ جب گھر سے لے کر چلے تو امام حسنؑ کی انگلی پکڑے تھے، حسینؑ کو گود میں لیے تھے، پیچھے پیچھے جناب سیدہ تھیں، ان کے پیچھے مولائے کائنات حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے۔ صلوٰۃ

اے تمام برادران اسلامی! مجھے کبھی اس سے بحث نہیں رہی کہ آپ کا مسلک کیا ہے۔ مجھے آپ کے مسلک سے بحث نہیں ہے۔ مجھے آپ سے اسلام کی گفتگو کرنا ہے۔ اسلام اللہ کا دین ہے۔ قرآن میں ایک آیت ہے۔ علمائے اسلام لکھتے ہیں، مفسرین اسلام لکھتے ہیں کہ جس وقت پیغمبرؐ گھر سے نکلے تو حسنؑ کی انگلی پکڑے ہوئے تھے، حسینؑ کو گود میں لیے ہوئے تھے، پیچھے پیچھے ان کی اکلوتی بیٹی تھیں، ان کے پیچھے مولائے کائنات تھے۔ یعنی پیغمبرؐ اسلام اس آیت کے ذیل میں صرف چار ہستیوں کو لے گئے۔ تو کیوں نہیں اہل مدینہ نے پیغمبرؐ اسلام سے یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا بچوں میں یہی دو بچے ہیں؟ کیا بیٹوں میں یہی دو بیٹے ہیں؟ یا رسول اللہ! کیا عورتوں میں بس ایک بی بی فاطمہؑ ہی ہیں؟ کیا نفوس میں ایک علیؑ ہی ہیں؟ مدینے میں کیا بچے نہیں ہیں؟ مدینے میں کیا عورتیں نہیں ہیں؟ مدینے میں کیا اور نفس نہیں ہیں؟ کیا دوسروں سے آپ کو قربت نہیں ہے؟ کیا دوسروں کو آپ سے قرابت نہیں ہے؟ لیکن میرا زیادہ مطالعہ نہیں ہے۔ آپ علماء اسلام سے پوچھ گئے گا۔ کسی سڑی گلی تاریخ میں بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ مدینے کے بچوں

لایا ہوں لیکن اب اور عورتیں بھی آئیں۔ تو میں کیا کروں۔ نفوس میں میں لایا تو علیٰ ہی کو ہوں لیکن اور بھی چلے آئے تو میں کیا کروں۔ دیکھنے والا کیسے سمجھتا۔ اکثر آپ نے دیکھا ہوگا، پارٹیوں میں دیکھا ہوگا، شادیوں میں دیکھا ہوگا کہ دعوت نامہ آپ کا، آپ کے ساتھ لگ کے میں بھی چلا گیا۔ صاحب خانہ جانتا ہے کہ طاہر صاحب کو نہیں بلایا ہے لیکن اس لیے نہیں بولتا کہ ایسے کے ساتھ آئے ہیں کہ اگر ہم کہیں گے، انہیں تو نہیں بلایا ہے کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔ تو بہترین موقع تھا اقربا میں شمولیت کا۔ اگر سارے مدینے کے لوگ انفسنا میں چلے جاتے، تو اللہ کتنا میرے حبیب، ہم نے تو خالی علی کو بلایا تھا۔ خیر اب سب آگئے ہیں تو آئے دو۔ ہم نے تو صرف حسنین کو بلایا تھا۔ خیر اتنے بچے تم جمع کر کے لے آئے تو آئے دو۔ ہم نے تو صرف فاطمہ کو بلایا تھا۔ تم اتنی بیبیوں کو لے آئے، لے آؤ۔ اللہ بولتا ٹھیک ہے، چلے دو۔ لیکن میرا کہنا جو ہے وہ کسی بچے نے بھی نہ کہا کہ ہم چلیں گے۔ کسی بوڑھے نے نہ کہا کہ ہم چلیں گے۔ کسی جوان نے نہ کہا کہ ہم چلیں گے۔ کسی رشتے دار نے نہ کہا کہ ہم چلیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کے لوگ قرآن سمجھتے تھے۔ آج قرآن سمجھ میں نہیں آتا تو میں کیا کروں۔ اس وقت کے لوگ سمجھتے تھے کہ انفسنا میں صرف علی جائیں گے۔ اہناءنا میں صرف حسنین جائیں گے اور نساءنا میں صرف فاطمہ جائیں گی۔ ہم کوئی عقیدہ خاص نہیں رکھتے۔ ہم نے تو حسنین جاتے دیکھا انہیں اقربا میں مانا اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اور بھی قرابت دار ہوتے تو مباہلے میں آتے۔ ارے یہ چانس کوئی ضائع کرتا ہے۔ لیکن وہاں شرط لگادی تھی، جھوٹوں پر لعنت کنا ہوگی، تو سب نے سب کو خود ہی روک لیا۔ آیت کا آخری ٹکڑا اللہ نے بریک بنا دیا۔ صلوٰۃ

اب ایک بات آپ اور سماعت فرمائیں۔ بت اہم ہے۔ وہ یہ کہ جتنی بھی رشتہ داریاں ہیں، جتنی بھی قرابت داریاں ہیں پیغمبر اسلام سے، وہ زمانی اور مکانی ہیں۔ زمانی یعنی وقتی سبب اور مکانی یعنی جگہیں یعنی اگر سرور کائنات، بجائے مکہ کے، کراچی میں پیدا ہوتے تو رشتہ داروں کی وہ فہرست نہ ہوتی جو آج تاریخ میں ہے۔ مکہ میں جس خاندان میں پیدا ہوئے، ان کی فہرست نہ ہوتی۔ کراچی میں جس خاندان میں پیدا ہوئے، ان کے نام لکھے ہوتے۔ اور زمانی یوں ہے کہ جس سن میں حضور پیدا ہوئے ہیں اس سے اگر

نے کہا ہو کہ یا رسول اللہ ہم بھی چلیں گے۔ عورتوں نے کہا ہو کہ ہم بھی چلیں گے۔ دوسروں نے کہا ہو کہ نفوس میں ہم بھی چلیں گے۔

میں جب نبی سے پوچھتا کہ آپ کیوں نہیں لے گئے جب مدینے کے بچے آئے ہوتے، یا رسول اللہ ہم بھی چلیں گے۔ اور نبی کہتے بس ہم دو بچوں کو لے جائیں گے۔ نبی نہیں لے گئے کی بات میں جب کتنا جب ساری عورتیں جمع ہوئی ہوتیں، یا رسول اللہ ہم بھی چلیں گے مباہلے میں، نصارائے نجران کے مقابلے میں، اور نبی کہتے کہ ہم تم کو نہیں لے جائیں گے، صرف اپنی بیٹی فاطمہ کو لے جائیں گے۔ تو ہم پوچھتے یا رسول اللہ آپ سب کو کیوں نہ لے گئے؟ اگر نفوس میں نبی کے سارے چاہنے والے نبی کے گرد جمع ہو جاتے، یا رسول اللہ ہم بھی چلیں گے مباہلے کا شرف حاصل کرنے کے لیے، ہمیں بھی ساتھ لے چلیں، اور رسول اللہ کہتے نہیں نہیں، تم میں سے کوئی نہیں جاسکتا سوائے علی کے۔ جناب والا فکر کی بات یہ ہے کہ کسی نے کہا ہی نہیں کہ ہم چلیں گے۔ نہ بچوں نے کہا ہمیں لے چلیں۔ نہ عورتوں نے کہا ہمیں لے چلیں۔ نہ مردوں نے کہا ہمیں لے چلیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس دن آیت نازل ہوئی تھی پچہ پچہ جانتا تھا کہ ہم اقربا میں نہیں ہیں۔ عورت عورت جانتی تھی کہ ہم اقربا میں نہیں ہیں۔ مرد مرد جانتا تھا کہ ہم اقربا میں نہیں ہیں۔ آپ آج جس کا نام چاہیں لکھ دیں لیکن جب وہ خود زندہ تھا تو جانتا تھا کہ ہم نہ جائیں گے۔ صلوٰۃ

”اقربا“ کے لفظ کی وضاحت ہو رہی ہے۔ جس رشتے کی منزل میں ”انفسنا“ میں اصحاب کرام جرات نہ کریں جانے کی، جس ”نساءنا“ کی منزل میں ازواج کرام ہمت نہ کریں جانے کی، جس ”اہناءنا“ کی منزل میں مدینے کے بچے جرات نہ کریں جانے کی، اس میں آپ کہتے ہیں اقربا سے ہمارے قرابت دار مراد ہیں۔ وہاں نبی کے سارے مراد نہیں، آپ کا کیا سوال۔ آپ تو تھے بھی نہیں۔ جو تھے وہ خود جانتے تھے کہ ہم مراد نہیں ہیں۔ اگر مدینے کے بچے چلے گئے ہوتے تو آج سب بچوں کے نام اقربا میں لکھے ہوتے۔ اگر مدینے کے افراد چلے گئے ہوتے تو تاریخ لکھتی سب انفسنا میں چلے گئے۔ اگر ساری عورتیں چلی گئی ہوتیں تو تاریخ لکھتی۔ اور اگر نبی کہتے بھی جاتو سب رہے ہیں مگر بچوں میں، میں صرف دو کو لیے جا رہا ہوں، چلے سب آئیں۔ عورتوں میں صرف بی بی فاطمہ کو

بغیر پہچانے۔ آپ جانیں سکتے بغیر پہچانے۔ صلوٰۃ

آدمؑ کو نبوت نہیں ملی، بغیر پختنؑ کو پہچانے۔ ہم کو جنت نہیں ملے گی، بغیر پختنؑ کو پہچانے۔ اس لیے کہ نہ جانے کیا اہمیت ہے پختنؑ پاک کی کہ انہیں پہچانو تو خلافت ملے اور جب زمین پر خلیفہ اللہ ہو کے بھی جاؤ اور دعا کرو، تو دعائوں کا نہیں، جب تک ان کا حوالہ نہ دو گے۔ کو محمدؐ کا واسطہ، اس لیے کہ تو محمود ہے۔ کو علیؑ کا واسطہ، اس لیے کہ تو اعلیٰ ہے۔ کو فاطمہؑ کا واسطہ، اس لیے کہ تو فاطمہ السموات ہے۔ کو کہ حسنؑ کا واسطہ، اس لیے کہ تو حسن ہے۔ کو کہ حسینؑ کا واسطہ، اس لیے کہ تو قدیم الاحسان ہے۔ آج لوگ کہتے ہیں ویسے کی کیا ضرورت ہے؟ دادا کی نہ سنی بے ویسے کی، تو ہماری آپ کی کیا سنے گا بے ویسے کی۔ لہذا کہا، ان کے ذریعے سے مانگو۔ ہم نے انہی ناموں کو تمہاری دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ بنایا اور یہ ہمارا طریقہ پختنؑ سے عقیدت اور پختنؑ سے محبت کا طریقہ اور یہ ہمارے بعض دستور، جس پر دنیا محو حیرت ہے۔ یہ نذر کیا ہے؟ یہ نیاز کیا ہے؟ یہ پختنؑ کے اسماء کیا ہیں؟ یہ پختنؑ کا حوالہ کیا ہے؟ جو کچھ ہے وہ اللہ ہے۔ بے شک جو کچھ ہے وہ اللہ ہی ہے مگر اس کہنے کا انجام کیا ہے؟ مجھے نہیں معلوم ہے آپ قرآن سے پوچھئے۔ جب آدمؑ کے سامنے سر جھکانے کا حکم دیا گیا تو قرآن کہتا ہے ”سب نے پیشانیاں جھکا دیں۔“ الا ابلیس اور وہاں بھی لفظ سجدہ ہی ہے۔ کس کے سامنے سر جھکوا یا تھا؟ اگر آدمؑ کے سامنے سر جھکوا یا تھا تو آدمؑ کا ہتھ پہلے بن چکا تھا۔ جب ابوار پختنؑ جہنم میں ودیعت کیے تو کہا ”پیشانیاں جھکا دو۔“ پہلے دن بتا دیا کہ ان کے سامنے جھکو گے تو میرے سامنے جھکنا کام آئے گا اور اگر ان کے سامنے جھکنے سے انکار کرو گے تو میں اپنے جہنم کو بھی رد کر دوں گا۔ اس لیے کہ میرے دین پہنچانے کا ذریعہ ہی یہی ہیں۔

تو یہ پختنؑ وہ ہیں جن کے نام عرش اعظم پر لکھے تھے۔ یہ پختنؑ وہ ہیں جن کے اسماء جہنم آدمؑ پر تھے۔ یہ پختنؑ وہ ہیں جن کے اسماء کے سامنے ملائکہ کی پیشانیاں جھکا لی گئی تھیں۔ یہ پختنؑ وہ ہیں جن کی محبت کے بغیر کسی کو نبوت نہیں ملی۔ تو ان کی محبت اجر رسالت ہے۔ ان کی محبت، جن کا ذکر خلقت آدمؑ کے ساتھ ہے۔ وہ پختنؑ جن کے نام نوحؑ کی کشتی پر لکھے تھے۔ وہ پختنؑ جو نوحؑ کا سفینہ پہچانے کے ذمہ دار اور ذریعہ قرار

ایک ہزار برس پہلے پیدا ہوئے ہوتے تو نام رشتہ داروں کے بدل جاتے۔ اگر ہزار برس کے بعد پیدا ہوتے تو نام بدل جاتے۔ فرض کیجئے کراچی میں آج رسول اللہؐ ہوتے تو ہمارا آپ کا نام اصحاب میں ہوتا۔ جو ہزار برس پہلے چودہ سو برس پہلے مر گئے ان کا نام کہاں سے آتا۔ یعنی یہ وقتی سبب ہے۔ یہ جگہ کی بات ہے کہ مکہ کی سرزمین پر نبیؐ پیدا ہوا لہذا جو قرابت دار نبیؐ کے تاریخ نے معین کیے وہ جگہ اور نام کی وجہ سے مگر پیغمبرؐ فرماتے ہیں کہ ”اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹی کا کوئی کفو نہ تھا۔“ یعنی جب تک میں نہ ہوتا، بیٹی نہ ہوتی اور جب تک کہ کفو نہ ہوتا، شادی نہ ہوتی۔ جب شادی ہی نہ ہوتی تو بیٹے نہ ہوتے یعنی پختنؑ کا جو ساتھ نبیؐ کے ہے، وہ مکانی اور زمانی نہیں ہے۔ نبیؐ روس میں آتا تو وہ روس میں آتے، نبیؐ کراچی میں آتا تو وہ کراچی میں آتے، نبیؐ ہزار برس پہلے آتا تو وہ ہزار برس پہلے آتے۔ نبیؐ دو ہزار برس بعد آتے یہ اہل بیتؑ دو ہزار برس بعد آتے۔ تاریخ بدل جاتی، اہل بیتؑ نہ بدلتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس قرابت دار سے وہ قرابت مراد ہیں جن کو آدمؑ نے دیکھ کے پہچان لیا تھا۔ صلوٰۃ

قرابت بشری مراد نہیں ہے بلکہ قرابت نورانی مراد ہے۔ کون قرابت دار؟ جن کے انوار آسمانوں پر تھے، جن کے اسماء کی تعلیم آدمؑ کو دی گئی، جن سے امتحان لیا گیا تھا۔ قرآن پڑھیے، غور سے پڑھیے، کیا کہہ رہا ہے قرآن؟ یہی تو کہہ رہا ہے کہ جب ہم نے زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجنا چاہا تو ملائکہ نے ہم سے درخواست کی کہ ”معبود ہم میں سے کسی کو بنا کے بھیج۔“ ہم نے جواب دیا کہ ”جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے“ پہلے ہی دن اللہ نے بتا دیا کہ اس مسئلے میں، میں رائے نہیں چاہتا، بس جو میں کہوں اسی کو تسلیم کرنا ہوگا۔ جب ملائکہ کا مشورہ پسند نہیں ہے، تو تمہارے مشوروں کی کیا اہمیت ہے۔ یہ یاد رکھنا اور اسماء کی تعلیم دے دی اور کہا بتاؤ کون ہیں؟ ملک دیکھتے رہے بتا نہ سکے۔ آدمؑ نے بتا دیا یہ محمدؐ ہیں، یہ علیؑ ہیں، یہ فاطمہؑ ہیں، یہ حسنؑ ہیں، یہ حسینؑ ہیں۔ اس لیے خلافت الہیہ اللہ نے آدمؑ کو دے دی۔ یعنی آدمؑ کا شرف معرفت پختنؑ بنا۔ اب میں اسلام کی بات نہیں کر رہا ہوں، یعنی آدمؑ وہ ہے جو ختمی مرتبت کو پہچانے، آدمؑ وہ ہے جو علیؑ کو پہچانے، آدمؑ وہ ہے جو حسینؑ کو پہچانے، آدمؑ وہ ہے جو فاطمہؑ کو پہچانے۔ یہ آدمؑ کو بنانے والے ہیں۔ آدمؑ نہ آتے نبیؐ بن کے اگر پختنؑ کو نہ پہچانتے۔ آدمؑ انہیں سکتے تھے

جائیں گے۔ ذرا کچھ سوچ کر کہا کرو۔ یہ دیکھ لو کہ کون کون سیہ لباس پہنے ہے۔ اللہ کے گھر پر بھی سیہ پردہ ہے۔ کیوں؟ میری وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا خدا نخواستہ خداوند عالم کا انتقال ہو گیا جس کے غم میں یہ کالا پردہ ڈالا؟ کہا آپ کیسی مہمل باتیں کر رہے ہیں۔ ارے میں پوچھ رہا ہوں کعبہ پر کالا غلاف کیوں چڑھا ہوا ہے اور ہر سال بدلا کیوں جاتا ہے؟ میری تو سمجھ میں نہ آیا کہ پردہ کیوں چڑھا۔ جب حج پر گیا، پردہ بدلا جا رہا تھا تو ایک گمان گزرا، میری بدگمانی ہے آپ سے کوئی مطلب نہیں۔ جب ایک نشان دیکھا تو گمان گزرا کہ کہیں اس نشان کو چھپانے کے لیے تو پردہ نہیں چڑھایا۔ صلوٰۃ

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نشان مٹا نہیں تو چھپایا جاتا ہے۔ بس اسی سے ظاہر ہے کہ جب ذکر حسین مٹا نہیں تو ذکر کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جس کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ جب علیؑ کی ولادت کی نشانی نہیں مٹ سکتی تو ذکر علیؑ کیا مٹے گا۔ جب حسینؑ کے غم کی نشانی اللہ نے شفق کی صورت میں نمایاں کی۔ یعنی بعد شہادت حسینؑ جو پتھر بھی اٹھایا جاتا تھا، خون تازہ جوش مارتا۔ یہ آسمان کب سے سرخ ہونا شروع ہوا؟ جب سے حسینؑ کربلا میں شہید کیے گئے۔ آج تک اس خاک میں اثر دیا۔ آج بھی اصلی خاک شفا جہاں موجود ہوتی ہے وہاں عاشور کے دن سرخ ہو جاتی ہے۔ ایک عظیم خاندان ہے، عجلہ علماء اہلسنت کا لکھنؤ میں، علمائے فرنگی محل کا۔ ان کے یہاں وہ اصلی تسبیح موجود ہے جو آج بھی عاشور کے دن سرخ ہو جاتی ہے۔ چودہ سو برس گزر گئے، مٹی نے سرخ ہونا نہیں چھوڑا۔ تو جب مٹی کا سرخ ہونا نہیں رکا تو ہمارا رونا کیسے رکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو ہم عزاداری کرتے ہیں، مگر یہ وبکا کرتے ہیں، یہ خود ساختہ نہیں ہے۔ اللہ کی طرف سے علامت ہے۔ کعبہ ہمیشہ سیہ غلاف پہنے رہے گا۔ تمہاری آنکھوں سے ہمیشہ آنسو جاری رہیں گے۔

اور پھر جب یہ دس دن آتے ہیں تو لوگ پوچھتے ہیں، یہ محرم کیا چیز ہے؟ میں کہتا ہوں، حج کیا چیز ہے؟ کعبہ ہمیشہ محترم ہے۔ کعبہ حج ہی کے زمانے میں محترم نہیں ہے، کعبہ ہر دور میں محترم ہے۔ عمرہ ہمیشہ کیا جاتا ہے، لیکن حج کا زمانہ مخصوص ہے۔ ویسے ہی حسینؑ ہمیشہ مظلوم ہیں، حسینؑ پر ہمیشہ رویا جاتا ہے مگر ایک رونے کا زمانہ ہے۔ ایک عمرہ کرنا اور ایک حج کرنا۔ ایک ہر شب جمعہ حسینؑ کو رونا، ایک محرم میں رونا۔ آپ نے

پائے۔ وہ بچپن جو ہر ہیبت اور ہر بلا میں معین و مددگار رہے۔ اور جب وہی بچپن دنیا میں آئے تو جن کا ذکر توریت میں ہوا جن کا ذکر زبور میں ہوا جن کا ذکر انجیل میں ہوا جن کا ذکر قرآن میں ہوا، ان کو تو سارے مسلمانوں کو پیشانی جھکا دینا چاہیے ان کے آستانے پر، ان کے دروازے پر، کیونکہ یہی وہ ہیں جو سب قبولیت عبادت ہیں۔ ہم جو محرم میں عزا خانے سجاتے ہیں، عزادار مسلمان جو محرم میں عزاداری کرتے ہیں، یا آستانہ بچپن بناتے ہیں، بچپن کی یادگاریں یہاں رکھتے ہیں، یہ کس لیے رکھی جاتی ہیں؟ اسی لیے کہ آج بھی فرشتے دیکھیں کون جھکتا ہے، کون نہیں جھکتا۔ کون بوسہ دیتا ہے، کون بوسہ نہیں دیتا ہے۔ کون آنکھوں سے لٹکتا ہے، کون آنکھوں سے نہیں لگتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ یہ آپ علم کے پھریرے کو، بچکے کو آنکھوں سے کیوں لگاتے ہیں؟ یہ آپ چو کھٹ کو کیوں چومتے ہیں؟ یہ اسلام نہیں۔ ارے یہ اسلام نہیں ہے تو پھر کیا اسلام ہے؟ سارے مسلمان جا کے کعبہ کے پردے کو کیوں آنکھوں سے لگاتے ہیں؟ کعبہ پر کوئی پردہ چڑھوایا؟ کہا نبیؐ نے تو کوئی پردہ نہیں چڑھوایا۔ تو آج پردہ کیوں چڑھا؟ کہا انتہائی عقیدت سے مسلمانوں نے چڑھا دیا ہے۔ مجھے انکار نہیں ہے۔ اچھا پھر پردہ چڑھانے میں کوئی رنگ ہی نہ ملتا تھا۔ کتنے رنگ تھے، کسی رنگ کا چڑھ سکتا تھا۔ یہ کالا ہی پردہ کیوں چڑھا؟ بتائیے قرآن کی کس آیت کی روشنی میں کالا پردہ چڑھا؟ قرآن کی کس آیت میں ہے کہ اللہ نے کہا کہ میرے گھر پر کالا پردہ چڑھانا؟ کس حدیث میں ہے کہ کعبہ پر کالا پردہ چڑھانا؟ اور کس حدیث میں ہے کہ کالے پردے پر سنہرے تاروں سے آیتیں لکھنا؟ کہیں ہے حدیث، کہیں ہے قرآن میں! تو پھر کیوں ہے پردہ؟ کہا احترام کے لیے ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ جس چیز کا احترام کیا جاتا ہے اس پر پردہ چڑھایا جاتا ہے۔ جس چیز کا احترام کیا جاتا ہے اس پر سونے کے حروف سے آیتیں لکھی جاتی ہیں۔ تو وہ کعبہ کا احترام ہے، یہ مولود کعبہ کا احترام ہے۔ صلوٰۃ

وہ مکان کا احترام ہے، یہ مکین کا احترام ہے۔ دوسرے لفظوں میں سنہنے، ساری امت نے بیت کا احترام کیا، ہم نے اہل بیت کا احترام کیا۔ صلوٰۃ
یعنی اگر احترام بیت شرک نہیں ہے، تو احترام اہل بیت شرک کیسے ہوگا؟ کون سی طاقت تھی جس نے کالا پردہ چڑھا دیا۔ آج یہ کہتے ہیں، یہ سیہ لباس پہننے والے جنم میں

تمہارے باپ نے تمہارے بازو پر ایک تعویذ باندھا تھا اور کہا تھا قاسم جب کوئی ایسی مشکل آئے کہ تمہیں اس کا حل نظر نہیں آئے تو بازو سے تعویذ کھول کے پڑھ لینا۔ یہ تعویذ تمہاری مدد کرے گا۔ کہا ہاں مادر گرامی! یہ کہہ کے تعویذ کھولا۔ اب جو تعویذ کھولا تو نہ کوئی دعا تھی نہ کوئی سورۃ تھا نہ کوئی آیت تھی خط تھا۔ بھیا حسین تیری غربت اور تیری مظلومی پر یہ بھائی اپنے بیٹے قاسم کو تیری نصرت کے لیے بھیج رہا ہے، میری طرف سے اللہ کی بارگاہ میں میرے قاسم کو قبول کر لیتا۔ خط پڑھنا تھا کہ چرے پر مسکراہٹ آئی، سر جھکا کے حسین کے پاس آئے۔ کہا قاسم تمہیں سمجھا دیا کہ ابھی تمہیں اجازت نہیں ملے گی، کیوں بار بار آتے ہو۔ کہا حضور کچھ کہنے نہیں آیا، یہ تحریر لایا ہوں۔ حسین نے جو بھائی کا خط پڑھا تو با آواز بلند رونے لگے۔ بھائی کی محبت یاد آئی۔ کہا قاسم تم نے مجبور کر دیا۔ ایک مرتبہ اجازت ملی، گھوڑے پر سوار ہوئے۔ لکھا ہے کہ یہ بچہ خالی کرتا پن کر کر لیا میں گیا، زرہ نہیں پہنی۔ اس کو شوق شہادت کہتے ہیں۔ قاسم میدان کو سدھارے۔ حسین درخیمہ پر کھڑے ہیں، عباس درخیمہ پر کھڑے ہیں۔ فضہ سے بار بار ام فروہ پوچھتی ہیں۔ فضہ معلوم کر میرا بیٹا کیسا جہاد کر رہا ہے کہ ایک مرتبہ حسین ابن علی نے فرمایا کہ نامی پہلوان قاسم کے مقابلے پر آئے ہیں۔ ارزق کے چاروں بیٹوں کو واصل جہنم کیا۔ بیچ و تاب کھاتا ہوا ارزق شامی آیا، اسے بھی واصل جہنم کیا۔ تو عمر سعد (عین) نے نکل کر کہا، کیا کر رہے ہو۔ ارے یہ علی کا پوتا ہے، اسے گھیر کر قتل کرو۔ ایک ایک لڑتے رہو گے تو شام ہو جائے گی، جنگ تمام نہیں ہوگی۔ لیجئے چاروں طرف سے لشکر دوڑے، تیر برسنے لگے، نیزے چلنے لگے، قاسم سے گھوڑے پر نہ سنبھلا گیا تو گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے۔ جزانکم دیکھ لکھا ہے کہ جو بھی شہید جاتا تھا، جب گھوڑے سے گرتا تھا تو کتنا تھا، آقا میرا آخری سلام قبول کیجئے۔ مگر جب قاسم گھوڑے پر سے گرے تو کہا بچا میری مدد کو آئے۔ یہ سنا تھا کہ حسین ذوالجناح پر سوار ہوئے۔ عباس و علی اکبر کو ساتھ لیا۔ اک مرتبہ حملہ کرتے ہوئے بڑے، ارے میرے قاسم کو کہاں گرایا، ارے میرا قاسم کہاں ہے؟ دو کلمے آپ سنیں۔ جب حسین قاسم کے جنازے پر پہنچے تو آواز دی، میرے لال قاسم حسین تم سے شرمندہ ہے۔ کیا دیکھا؟ خدا کسی بچا کو اپنے بھتیجے کا یہ عالم نہ دکھائے جو حسین نے دیکھا۔ روایت کے کلمے

ملاحظہ فرمایا، یہ گریہ و بکا کیوں ہے؟ اس لیے نہیں ہے کہ ہم کوئی خاص ربط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم سے نہ پوچھو، اس معبود سے پوچھو کہ ہمارا دل ایسا کیوں بنایا کہ نام حسین آیا اور ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ معبود سے پوچھو کہ ہمارا دل اتنا سخت کیوں بنایا کہ نام حسین سنا اور اثر نہ ہوا۔ تو اللہ کے گا، ایسا نہیں ہے۔ ہم نے سب کا دل نرم بنایا تھا۔ تم نے ظلم سے اس کو اتنا سخت کر لیا۔ ہم عادل ہیں، ہم کوئی فرق نہیں کرتے۔ اس لیے لوگ ہم سے کہتے ہیں، یہ بہت روتے ہیں۔ دوستوں ہم بہت کہاں روتے ہیں۔ ہم تو رونے کا حق بھی ادا نہیں کر پاتے۔ ارے دو بیٹے آٹھ دن کی مجلس کیا ہوئیں۔ بہتر (۷۲) شہید کر لیا کہ ہیں۔ بہتر (۷۲) دن کہاں ہوئے؟ دو بیٹے آٹھ دن تو ارٹھ (۶۸) ہی دن ہوئے۔ ہم ایک دن بھی ایک شہید کو نہیں رو پاتے اور جب یہ دس دن آتے ہیں تو سب کو کہاں رو پاتے ہیں۔ بزرگوں نے اس میں بھی دن اور شعبہ مخصوص کر دی ہیں۔ جیسے آج کی شب شہزادہ قاسم کے لیے مخصوص کر دی ہے۔ کون قاسم؟ سبط اکبر، امام حسن کے فرزند اکبر۔ ام فروہ کے ساتھ قاسم بھی آئے، عبد اللہ ابن حسن بھی آئے۔ جب شب عاشور آئی، ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ جناب قاسم نے آکے کہا مادر گرامی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟ کہا قاسم میری آہو تمہارے ہاتھ ہے۔ اس لیے کہ میں نے ابھی دیکھا کہ بی بی زینب عون و محمد کو قربانی کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ زوجہ عباس بیٹھی عباس کو ماں کا قول یاد دلا رہی تھیں۔ اے قاسم اگر تم نے کل چچا پر قربانی پیش نہ کی تو بی بیوں کی سوچیں گی، یہ غیر خاندان سے بیاہ کے آئی تھیں شاید اس نے اپنے بچوں کو روک لیا۔ قاسم نے کہا مادر گرامی سب سے پہلے میں اجازت لوں گا۔ کتنی ماں کے دل کو ڈھارس ہو گئی۔

شب عاشور ختم ہوئی، بازار کا رزار گرم ہوا۔ ایک کے بعد ایک جا رہا ہے۔ جناب قاسم بار بار جاتے ہیں۔ چچا مجھے مرنے کی اجازت دیجئے۔ حسین کہتے ہیں قاسم تم میرے بھائی کی یادگار ہو، میں کیسے تمہیں مرنے کی اجازت دے دوں۔ آج انہی جناب قاسم کا تابوت برآمد ہوگا۔ کون قاسم؟ جو خیمے میں آکر بیٹھ کر رونے لگے۔ ماں کا دل تڑپ گیا۔ کہا قاسم کیوں رو رہے ہو؟ کہا ماں میں جاتا ہوں تو چچا اجازت نہیں دیتے، میں کیا کروں۔ اس لیے میرا دم گھٹ رہا ہے، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ کہا بیٹا

ساتویں مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل لا اسئلكم عليه اجرا" الا المودة فى القربى

برادران ملت!

خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے کہ ”میرے حبیب کہہ دیجئے ان لوگوں سے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقربا ہیں ان سے مودت اور محبت رکھو۔“

اس آیت کے ذیل میں محفل مرتضیٰ کے پہلے عشرے کی مجلسوں میں ”محبت اہل بیت“ کے عنوان پر جو گفتگو آپ سامنے جاری ہے کہ ”محبت اہل بیت“ کیا چیز ہے۔ ”محبت اہل بیت“ کا کیا فائدہ ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر مسلمانوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ مختصر لوگ ہیں اور ایک فرقہ ہے جو اہل بیت کی محبت پر زور دیتا ہے ورنہ اہل بیت کی محبت کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ حیرت ہے کہ قرآن میں اجر رسالت کے طور پر جس محبت کو طلب کیا گیا ہو اس کی اہمیت کا تسلیم نہ کرنا تکذیب قرآن ہے۔ قرآن میں اس محبت کو اجر رسالت کے طور پر مانگا ہے۔ محبت کیا چیز ہے اور محبت کا فائدہ کسے ملتا ہے؟ دو طرح کی محبتیں ہوتی ہیں۔ ایک محبت تو وہ ہوتی ہے کہ جہاں جس کو چاہا جاتا ہے اس کو فائدہ

ہیں کہ جب حسینؑ اپنے تولاں پامال ہو چکی تھی۔ ادھر کے گھوڑے ادھر، ادھر کے گھوڑے ادھر۔ ارے سب کے جنازے حسینؑ اٹھا لائے، قاسمؑ کا جنازہ نہ لاسکے۔ اس لیے کہ لاش اطہر پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ ہائے حسنؑ کے جنازے پر تیر پڑے تھے۔ بیٹے کا جنازہ کربلا میں پامال ہوا۔ لکھا ہے کہ کربلا میں بی بی زینبؑ نے ایک خیمہ خالی کیا تھا، ایک مسند بچھائی تھی۔ شہداء کے جنازے رکھے جاتے تھے۔ اس پر پرسہ دیا جاتا تھا۔ جب بیبیوں کو خبر ملی، قاسمؑ شہید کر دیئے گئے۔ بی بیوں ام فروہؑ کو لے کر اس خیمے میں آئیں۔ مسند کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔ اب جنازہ آتا ہے، اب جنازہ آتا ہے۔ ایک مرتبہ فضلؑ نے پردہ اٹھایا۔ حسینؑ روتے ہوئے داخل ہوئے۔ بی بی زینبؑ نے کہا، بھیا میرے لال قاسمؑ کا جنازہ؟ حسینؑ نے سر جھکا دیا۔ اے بن جنازہ پامال ہو گیا۔ ارے حسینؑ کیسے جنازہ لائے۔



نہیں ہے۔ ایک بھی نہ چاہے تو ان کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ جب ان کا چاہنے والا اللہ موجود ہے، جب ان کا چاہنے والا رسول اللہ موجود ہے تو ہمارے چاہنے کی قیمت ہی کیا ہے۔ ہمارے چاہنے سے اللہ نے خیر ہم ہی کو فائدہ پہنچایا ہے کہ جب تم ان سے وابستہ ہو جاؤ گے تو بہت سی باتوں سے محفوظ رہو گے۔ گناہوں سے محفوظ رہو گے، نافرمانیوں سے محفوظ رہو گے، گمراہی سے محفوظ رہو گے، فقر سے محفوظ رہو گے، فاقے سے محفوظ رہو گے، جہالت سے محفوظ رہو گے۔ صلوٰۃ

محبت کیا ہے؟ محبت ایک کنٹرولنگ پاور ہے، محبت ایک شکتی ہے، محبت ایک پاور ہے جو انسان کو صحیح راستے پر چلاتی ہے۔ محبت ہی کے ذریعے کائنات کو جیتا جاتا ہے۔ محبت ہی کے ذریعے لوگوں سے روابط و تعلقات بڑھائے جاتے ہیں۔ یعنی وہ کشش ہے محبت میں کہ چاہنے والا بھٹکن بھی چاہے تو بھٹک نہیں پاتا اور چاہنے والے کو کوئی راستے سے ہٹا نہیں پاتا۔ اور آج کے دور میں سمجھنا کیا مشکل ہے۔ آج کے دور میں باتوں کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ آپ نے سنا ہوگا، بیٹھ کے دیکھا بھی ہوگا کہ جب ہوائی جہاز اڑتے ہیں، پی آئی اے کا جہاز کراچی سے اڑا۔ اس نے ”ٹیک آف“ کیا اور گھوم کے دہلی کی سمت اختیار کی تو اتنی دیر کام تو پائلٹ کا رہتا ہے کہ ”رن وے“ پر دوڑائے، ”رن وے“ سے اٹھائے، فضا میں لاکے دہلی کی سیدھ میں لائے اور اب تو سائنس نے اتنی آسانیاں کر دی ہیں کہ آٹوٹیک پائلٹ آن کیا بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ہوائی جہاز خود بخود سیدھ میں چلا جا رہا ہے۔ یہ کیا چیز ہے آٹوٹیک پائلٹ؟ یہ اس لیے ہے کہ کہاں تک آدمی توجہ کرے گا۔ ذرا بھی ہینکے گا تو راستہ بدل جائے گا لہذا نور کے ذریعے، برق کے ذریعے ”آٹوٹیک پائلٹ“ شروع کر دی گئی کہ تم راستے پر لگاؤ، ”آن“ ”کرڈ“ آرام سے بیٹھے رہو، گاہلی ہی کی سیدھ میں۔ میں یہ سمجھتا ہوں یہ

”قل لا اسئلكم عليه اجرا“ الا المودة فی القربی

کی آیت اللہ نے آٹوٹیک پائلٹ مقرر کیا ہے کہ تم کلمہ پڑھ کے مسلمان ہو جاؤ۔ اللہ کا دین سمجھ لو، جنت کا رخ اختیار کر لو۔ جب اہل بیت کی محبت ہو جائے گی تو خود بخود جنت ہی میں اترو گے۔ صلوٰۃ

پہنچتا ہے۔ اور ایک محبت وہ ہوتی ہے کہ جو چاہتا ہے اس کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ طرف کی بات ہے۔ مثلاً میں ایک غریب آدمی ہوں۔ اگر مجھے کسی دولت مند سے محبت ہو گئی تو ایک غریب کی محبت ایک دولت مند کو کیا فیض پہنچا سکتی ہے؟ اس محبت کا فائدہ مجھی کو ہو گا کہ اگر اس امیر آدمی نے، اس دولت مند آدمی نے یہ تسلیم کر لیا کہ واقعی یہ ہمارا چاہنے والا ہے تو قدم قدم پر جب ہمیں مالی پریشانی آتی رہے گی تو وہ ہماری مدد کرتا رہے گا۔ بنیاد محبت ہے۔ اگر ایک عالم دین سے مجھے محبت ہو گئی تو میں جہل رکھتا ہوں، وہ علم رکھتا ہے۔ تو ایک جاہل اپنی محبت سے عالم کو کیا فیض پہنچا سکتا ہے۔ کوئی فائدہ اس جاہل کی محبت سے عالم کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس جاہل ہی کو فائدہ پہنچے گا کہ اگر عالم کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ میرا چاہنے والا ہے تو سوچے گا کہ اپنا علم کچھ اسے بھی دے دیں تاکہ اس کی جہالت دور ہو جائے۔ اسی طرح سے اگر ایک صاحب اقتدار، ارباب حکومت میں سے، طاقت رکھنے والے میں سے کسی آدمی سے مجھے محبت ہو گئی تو جب اسے خود ”پاور“ اور قانونی طاقت حاصل ہے تو میں اس کو اپنی محبت سے کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں سوائے اس کے کہ اگر اس نے مان لیا کہ میں اس کا چاہنے والا ہوں تو اس کی طاقت، اس کی قوت، اس کی حکومت سے پلٹ کے مجھ ہی کو فائدہ پہنچ جائے گا۔ تو معلوم یہ ہوا کہ اگر چاہنے والا مختار ہوتا ہے تو محبوب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن اگر چاہنے والا مجبور ہوتا ہے تو خود اسی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اب دیکھیے کس کی محبت اللہ نے مانگی ہے؟ کسی مجبور کی محبت مانگی ہے، کسی غریب کی محبت مانگی ہے، کسی علم نہ رکھنے والے کی محبت مانگی ہے، کسی طاقت نہ رکھنے والے کی محبت مانگی ہے، کسی دولت نہ رکھنے والے کی محبت مانگی ہے۔ ایسوں کی محبت مانگی ہے، علم میں جن کا جواب نہیں، اقتدار میں جن کا جواب نہیں، مشیت الہی کے جو مالک ہیں، تقدیروں کے بدلنے والے ہیں، ہاتھ کے دھون کو جواہرات بنانے والے ہیں، پتھر کو علم بخشنے والے ہیں۔ تو جو جوان کو جتنا چاہے گا اتنا ہی خود فائدہ اٹھائے گا۔ انہیں کیا فیض پہنچائے گا۔ صلوٰۃ

دوسرے رخ سے آپ غور فرمائیں کہ جو اہل بیت سے محبت نہ کرے گا کیونکہ چاہنے والے سے محبوب کو کوئی فیض نہیں ہے۔ تو جب فیض نہیں ہے تو اہل بیت کا کوئی نقصان بھی نہیں، دس چاہیں، دس بھی نہ چاہیں، ہزار بھی چاہیں تو اہل بیت کا کوئی فائدہ

ہے۔ حاکم اچھا ہے مگر کردار اچھا نہیں ہے۔ کیا چیز ہے کردار؟ کردار کسے کہتے ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کا ایک کردار بنایا ہے۔

کردار کا مطلب یہ ہے کہ برائیاں نہ ہوں، اچھائیاں ہوں۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ برائی کیا ہے؟ اچھائی کیا ہے؟ کردار کسے کہتے ہیں؟ یہ عجیب و غریب بات ہے کہ مذہب میں بٹ کے انسان بدل جاتا ہے مگر کردار کا ہر مذہب والا قدر کرتا ہے۔ جب کردار کی بات آتی ہے تو تعصب مذہب بھی نہیں رہتا، تعصب ذات پات بھی نہیں رہتا، تعصب علم و جہل بھی نہیں رہتا، تعصب امیری و غربی بھی نہیں رہتا۔ اگر کسی نے اپنا کردار بنالیا تو سب کہتے ہیں ہمارا اس کا مذہب الگ ہے، نظریہ الگ ہے، سب کچھ الگ ہے مگر جناب یہ ماننا پڑے گا کہ کردار میں اس کا جواب نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ انسان کے دل میں جو چیز اثر انداز ہوتی ہے وہ کردار ہے۔ تو سب سے بڑی ضرورت انسان کے لیے کردار سازی کی ہے کہ کردار بنے۔ کردار کیسے بنے گا؟ کردار بننے کے لیے اصول بہت ہیں، علم الاخلاق کی کتابیں بہت ہیں، فلسفی بہت ہیں، منطقی بہت ہیں، لکھنے والے بہت ہیں، ادیب بہت ہیں، تقریریں کرنے والے بہت ہیں، مگر نمونے کم ہیں۔ اچھی باتیں سب بتا دیتے ہیں۔ میں بھی آپ کے سامنے سات دن سے پڑھ رہا ہوں، اچھی باتیں ہی پڑھ رہا ہوں لیکن آپ میری زبان پر بھروسہ کر رہے ہیں، میرے عمل پر نہیں۔ لیکن میں اگر آپ کے سامنے کہوں کہ جھوٹ بولنا عیب ہے اور سچ بولنا اچھے کردار کی علامت ہے اور پھر میں ہی آپ سے جھوٹ بولوں تو تقریر کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ کیوں بات تو سچ کہی انہوں نے کہ سچ اچھا ہے جھوٹ برا ہے لیکن اگر واقعی اچھا ہوتا تو خود کیوں جھوٹ بولتے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہدایت وہ کرے جو کردار میں پختہ ہو۔ تو ایک وہ ہے جس کا کردار پختہ ہے۔ ایک وہ جسے کردار بنانا ہے۔ ہم مسلمان اس لیے ہوئے ہیں کہ کردار بنائیں۔ اہل بیت اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ کردار کا نمونہ بنے رہیں۔ صلوٰۃ

آج تک دنیا میں کوئی ایسا مصنف نہیں گزرا کہ اس نے جو کتاب لکھی ہو، جو تصنیف کی ہو، اس میں جن باتوں کی خوبیوں کا اعلان کیا ہو، ان سب پر خود عمل بھی کیا ہو لیکن یہ اہل بیت کی شان ہے کہ کہا بعد میں، عمل کیا پہلے۔ یہ رسول اسلام کی شان ہے۔

انہوں نے آئوٹنگ لینڈنگ کا بھی سٹم بنادیا۔ مگنٹک آلات ایئرپورٹ پر لگا دیئے۔ جہاز سیدھا گیا۔ انہوں نے کشش سے کھینچ کے آستہ سے ”رن وے“ پر لینڈ کر دیا۔ تو یہ ”محبت اہل بیت“ وہ ہے جو دنیا سے اپنی محبت کی کشش سے ”ٹیک آف“ کرتی ہے اور جنت میں لے جا کے لینڈ کر دیتی ہے۔ اسی کا نام ہے پل صراط پر سے گزرنا۔ صلوٰۃ

محبت میں طاقت ہے۔ محبت میں قوت ہے اور پھر کن کی محبت؟ محبت معیار کردار بھرا ہے۔ آپ جانتے ہیں دنیا میں جتنی ویلیو آج دنیا میں جتنی عزت اور آج دنیا میں جتنی وفات کردار کو ہے، شخصیت کوئی چیز نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ کردار ہے۔ کردار اچھا ہوتا ہے تو پھر انسان کی عزت ہوتی ہے، انسان کی عظمت ہوتی ہے اور اگر کردار اچھا نہیں ہوتا ہے تو بڑے سے بڑے عہدے پر ہو، عزت نہیں ہوتی۔ بہت ہی دولت کیوں نہ ہو، عزت نہیں ہوتی۔ یعنی یہ تو دنیا کے تجربات میں ہے کہ دنیا نے اتنی ترقی کی۔ انسان نے دولت میں ترقی کی، انسان نے علم میں ترقی کی، انسان نے سیاست میں ترقی کی۔ آج انسان کتنا ترقی کر جاتا ہے، لکھ پتی بن جاتا ہے، کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ آج انسان حاکم بن جاتا ہے، صدر بن جاتا ہے، وزیر اعظم بن جاتا ہے، وزیر بن جاتا ہے۔ آج انسان آئی جی ڈی آئی جی بن جاتا ہے، آج انسان ڈائریکٹر بن جاتا ہے، نہ جانے کیا کیا بن جاتا ہے۔ آج انسان پڑھ لکھ کر پروفیسر بن جاتا ہے، انجینئر بن جاتا ہے، ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ تو ڈاکٹر بن گیا، صدر بن گیا، وزیر اعظم بن گیا، انجینئر بن گیا، لیکن عزت کس چیز کی ہوتی ہے؟ بنیادی عزت نہ عہدے کی ہوتی ہے، نہ دولت کی ہوتی ہے، نہ علم کی ہوتی ہے۔ بنیادی عزت کردار کی ہوتی ہے۔ یعنی اگر انسان کا کردار اچھا ہے تو وہ کسی جگہ بھی اگر ترقی کرتا ہے تو نیکی سے یاد کیا جائے گا اور اگر جاہل ہی ہے، عالم نہیں ہے مگر کردار کا اچھا ہے تو بھی لوگ تعریف کریں گے۔ امیر نہیں ہے، غریب ہے مگر کردار کا اچھا ہے، جب بھی لوگ تعریف کریں گے۔ ملازمت دینا دوسروں کے ہاتھ میں ہے، دولت دینا دوسروں کے ہاتھ میں ہے، علم دینا دوسروں کے ہاتھ میں ہے مگر کردار بنانا انسان کے خود اپنے ہاتھ میں ہے۔ تو جب کردار بن جاتا ہے تو اس کردار کا بڑا ہی اثر ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو لوگ کہتے ہیں کہ فن کا ماہر ہے مگر کردار کا اچھا نہیں ہے۔ بڑے بڑے علماء کو لوگ کہتے ہیں کہ عالم بہت بڑا ہے مگر کردار اچھا نہیں

ہیں، تو سمجھ گئے کہ آپ کو پھولوں سے عشق ہے اور پھولوں میں بھی گلاب پسند ہے۔ اگر دیکھا کرکٹ کے کھلاڑیوں کی تصویریں لگی ہیں، سمجھ میں آگیا کہ ان کو کھیلوں سے دلچسپی ہے۔ یہ کرکٹ کے شائق ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے گھر میں اور ڈرائنگ روم میں بھی اچھے کرکٹرز کی تصویریں لگا رکھی ہیں۔ اسی طریقے سے خدا نخواستہ ذوق کوئی اور ہے تو دوسرے قسم کی تصویریں لگی ہیں۔ تصویر کسی اور کی لگی ہے، ذوق آپ کا معلوم ہو رہا ہے۔ صلوٰۃ

اب اگر جا کے دیکھا کہ پولٹیکل لیڈرز کی تصویریں لگی ہیں تو سمجھ گئے، ٹیسٹ پولٹیکل ہے۔ اگر دیکھا اقبال وغالب کی تصویریں لگی ہیں، میر اور سودا کی تصویریں لگی ہیں تو سمجھ میں آگیا کہ ادبی ذوق ہے اور اردو ادب سے دلچسپی ہے۔ اگر دیکھا کہ شکسپیر کی تصویر لگی ہے، سمجھ میں آگیا کہ ان کو انگریزی ادب سے دلچسپی ہے۔ تصویر کی کیا اہمیت ہے؟ کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تصویر ٹیسٹ ظاہر کرتی ہے۔ تو آپ جو ہم سے پوچھتے ہیں کہ یہ روئے کی تصویر کیوں لگاتے ہو، کرلا کا فوٹو لگا ہے، نجف کا فوٹو لگا ہے؟ حضرت یہ ٹیسٹ ظاہر کرتا ہے۔ جس کا جو ٹیسٹ ہوگا اس کے گہروہی تصویر لگی ہوگی۔ میں کچھ کہہ گیا۔ صلوٰۃ

یہ ٹیسٹ کا اشارہ ہوتا ہے۔ اب میں آپ کے پاس بیٹھا، کیا مزاج ہے؟ الحمد للہ۔ آپ اچھے ہیں؟ کیسے ہیں؟ کب آئے؟ فلاں تاریخ کو آیا۔ ٹھنڈا چلے گا کہ گرم؟ اور اس کے بعد جو گفتگو شروع کی تو اپنا موضوع لے لیا۔ کون جانتا ہے کہ آنے والے کا ٹیسٹ کیا ہے۔ آپ کو پتا ہے فلاں نے اس بار چھ پنچیاں بنائیں۔ ارے صاحب ہم آپ سے ملنے آئے تھے یا کرکٹ ریکارڈ سننے کے لیے؟ آپ کو پتا ہے اس بار ہاکی ٹیم نے چھ گول کیے۔ ارے ہم کیا جانیں ہاکی کو۔ ہم آپ کا مزاج پوچھنے آئے تھے۔ انہوں نے کہا آپ نے فلاں بکچر دیکھی؟ استغفر اللہ ربی واتوب الیہ۔ اچھا کیا آپ ”ملا“ ہیں؟ صلوٰۃ

جس ٹیسٹ کا آدمی ہوتا ہے، اسی ٹیسٹ کی بات کرتا ہے۔ اگر ادیب ہے تو ادیبوں کی بات کرے گا، اگر شاعر ہے تو شاعروں کی بات کرے گا، کھلاڑی ہے تو کھیلنے والوں کی بات کرے گا اور یہ بھی ملے ہے کہ ہر کھیلنے والے کا ذکر نہیں ہوگا۔ ذکر پنچری بنانے والے ہی کا ہوگا۔ ذکر اسی کا ہوگا جو ایک اور میں چھ چھ دکت لے لے۔ بھی عرض

اسی لیے کہا چالیس برس کے بعد اعلان نبوت کرنا، چالیس برس کے بعد میرا قرآن دنیا کے سامنے پیش کرنا تاکہ لوگ کردار ملا کے دیکھ لیں کہ جو آج ہمیں سمجھا رہے ہیں، خود تو کبھی نہیں کیا؟ یعنی اگر بت پرستی سے روک رہے ہیں تو خود تو کبھی بت کے سامنے سر نہیں جھکایا؟ اسی لیے تو ان کی محبت کو اجر قرار دیا گیا کہ یہ اسی نور سے پیدا تھے جس نور سے رسول اللہ پیدا کیے گئے۔ آج ہم سے عامۃ المسلمین میں سے بعض کج فہم، سمجھ دار نہیں، نا فہموں کو یہ شکایت ہے کہ آپ کے یہاں ذکر اہل بیت کیوں اتنا زیادہ ہوتا ہے؟ محرم کیوں منایا جاتا ہے؟ اہل بیت کی فضیلت کیوں بیان کی جاتی ہے؟ فضائل علی پر مجمع کیوں اچھلتا ہے؟ صلوٰۃ کے نعرے کیوں بلند ہوتے ہیں؟ یہ عزاء خانوں سے وابستگی کیوں ہے؟ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ جب بھی چار آدمی بیٹھے ہیں تو کچھ بات کرتے ہیں، جب بھی دس آدمی بیٹھیں گے تو کچھ بات کریں گے۔ جب بھی کہیں مجمع ہو گا یا سب بولیں گے یا ایک بولے گا اور سب سنیں گے، اسی کا نام مجلس ہے۔ مجلس کے معنی کیا ہیں؟ جہاں لوگ بیٹھ گئے، مجلس ہونا۔ بیٹھنا کہتے ہیں عربی میں۔ مجلس یعنی جہاں لوگ بیٹھے ہوئے ہوں۔ یہاں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ میں منبر سے اتر آتا ہوں۔ مسلمانوں کا مجمع ہے۔ اتر آؤں گا، بات شروع ہوگی۔ چار آدمی بات کر رہے ہیں، تین آدمی بات کر رہے ہیں، دو آدمی بات کر رہے ہیں مگر سب کی بات ایک نہیں ہوگی۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ہی موضوع پر سب ایک ہی بات کر رہے ہوں۔ الگ الگ بات کریں گے۔ کس کی بات کریں گے؟ جس کا جو شوق ہوگا، جس کا جو ”ٹیسٹ“ ہوگا وہ اس کی بات کرے گا۔

میں یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ لوگوں سے ملنے کا شرف مجھے حاصل ہوتا رہتا ہے۔ میں آپ کے گھروں پر جاتا ہوں، دوستوں کے گھروں پر جاتا ہوں۔ انسان، انسان سے ملتا ہے۔ میں آپ یہاں ملنے کو پہنچا، جیسے ہی میں نے آپ کے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو ڈرائنگ روم میں کچھ تصویریں لگی دیکھیں۔ ہر طرف کوئی نہ کوئی تصویر لگائے رہتا ہے۔ تصویروں سے ٹیسٹ کا پتا چلتا ہے۔ اگر سبزی لگی ہے، پہاڑ کی تصویر ہے، سمندر کی تصویر ہے، درختوں کی تصویر ہے، تو سمجھ میں آگیا کہ آپ کا ٹیسٹ سیاحت ہے یعنی مناظر قدرت سے آپ کو دلچسپی ہے۔ اگر دیکھا فریم میں گلاب کے پھول کی تصویریں لگی ہوئی

ہوگا، تو مشکل کشا وہی نظر آئیں گے۔ صلوٰۃ۔

میں ہندوستان سے کراچی آیا۔ آپ سے ملنے گیا۔ آپ نے مجھ باتیں مجھ سے شروع کیں، اپنے ذوق کے مطابق۔ میں نے کہا سبحان اللہ۔ آپ کے خیالات فلاں صاحب سے بہت ملتے ہیں۔ کون صاحب؟ ہندوستان میں ایک صاحب ہیں۔ بالکل وہ بھی یہی کہتے ہیں جو آپ کہہ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا اور ان کا مزاج ملتا ہے۔ آپ نے کہا انشاء اللہ، میں لکھنؤ آؤں گا تو ان سے ضرور مجھے ملائے گا اور جب میں نے ان سے کہا کہ کراچی میں ایک صاحب وہی باتیں کرتے ہیں جو آپ کرتے ہیں۔ کہا آئیں کراچی سے، تو مجھے ضرور بتائیے گا۔ یعنی محبت پیدا ہوگئی۔ نہ صورت دیکھی، نہ نام سنا، نہ گھر دیکھا، نہ پتا معلوم ہوا۔ خالی نظریہ کی یکسانیت سے ایک کی محبت دوسرے کے دل میں۔ ہم اہل بیتؑ کے جو فضائل بیان کرتے ہیں۔ کبھی قرآن پڑھ کے دیکھو۔ اللہ بھی وہی کہتا ہے۔ تو جب اللہ سنتا ہوگا، ارے یہ وہی پڑھتے ہیں جو ہم نے قرآن میں کہا ہے تو کہے گا یہ ہمارے ٹیٹ کے لوگ ہیں۔ صلوٰۃ۔

جناب صرف مولائے کائنات علیؑ ابن ابی طالبؑ کی مدح میں قرآن مجید میں ساڑھے تین سو (۳۵۰) آیتیں ہیں۔ تو اللہ جس کی تعریف میں ساڑھے تین سو (۳۵۰) آیتیں بھیجے، اگر ہم نے ایک گھنٹہ اس کی تعریف کی تو جس کا جی چاہے بگڑ جائے لیکن خدا خوش رہے۔ وہ تو وہ کہہ رہا ہے جو ہم نے کہا ہے۔ یہ اسی کی تعریف کر رہا ہے جس کی ہم تعریف کر رہے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے اٹھتے بیٹھتے جن کی مدح کی ہو۔ فرش پر بیٹھے ہیں تو اہل بیتؑ کی مدح کر رہے ہیں، بستر پر ہیں تو اہل بیتؑ کی مدح کر رہے ہیں، میدان جنگ میں ہیں تو اہل بیتؑ کی تعریف کر رہے ہیں، محراب میں ہیں تو اہل بیتؑ کی تعریف کر رہے ہیں، منبر پر ہیں تو اہل بیتؑ کی تعریف کر رہے ہیں۔ قرآن میں خدا آل محمدؐ کی مدح کرے، منبر پر نبیؐ آل محمدؐ کی تعریف کرے اور جب ہم اپنی مجلسوں میں ان کی مدح کریں تو یہ پیروی حکم خدا ہے، یہ پیروی سنت رسولؐ ہے۔ اس سے تو کوئی مسلمان چڑھی نہیں سکتا اور آپ کہیں گے کہ ہم تو بہت تنگ آگئے ہیں۔ فضائل، فضائل۔ ارے آپ اتنا ہی تنگ آگئے ہیں تو قرآن پڑھنے سے بھی تنگ آگئے ہوں گے، حدیثیں پڑھنے سے بھی تنگ آگئے ہوں گے اور جب محشر میں حضورؐ سے ملاقات ہوگی۔ السلام علیکم۔ کہا ہم آپ سے بہت تنگ

کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس لائن کا ذکر ہے اس کے ہیرو کا تذکرہ ہوگا، ہر ایک کا نہیں ہوگا۔ میں نے کہا جناب فلاں کا تذکرہ نہیں کیا؟ ارے چھوڑیے، دوسری بال پر تو آؤٹ ہو جاتے ہیں، ذکر کیا کریں۔ ارے یہ تو آپ نے برائی شروع کر دی۔ کہا برائی ہم نے نہیں کی آپ نے نام ہی ایسا لے لیا کہ ہم کو کتنا پڑا۔ صلوٰۃ۔

کردار کی بات کیوں نہیں۔ جیسا ٹیٹ ہوگا ویسی گفتگو ہوگی۔ اب میں بیٹھا سن رہا ہوں اور آپ بیان کر رہے ہیں۔ اب اگر میں بھی ”اسپورٹس مین“ ہوں تو مجھے دلچسپی ہو جائے گی اور نہیں ہے تو بور۔ کسی طرح ٹھنڈا گرم ختم ہو، خدا حافظ کہہ کر ہم گھر جائیں۔ اور اگر میرا ٹیٹ آپ کے ٹیٹ سے مل گیا تو آپ بولے جائیں گے، میں خوش ہوتا جاؤں گا۔ کیا بات کہی آپ نے، واہ واہ صاحب، ہم قائل ہو گئے۔ یہ واہ واہ کب نکلتی ہے؟ جب ٹیٹ ملتا ہے۔ تو دنیا کو آزادی ہے، پہلوانوں کا ذکر کرو، ڈراموں کا ذکر کرو، کھلاڑیوں کا ذکر کرو، قلم ایکٹر کا ذکر کرو، ارے ہر ایک کا ذکر کریں۔ اگر ہم نے اہل بیتؑ کا ذکر کیا، اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ یہ اپنے ٹیٹ کی بات ہے اور ایک نے ذکر کیا، سب نے واہ واہ کہا۔ معلوم ہوا جو کہنے والے کا ٹیٹ ہے وہی سننے والے کا بھی ٹیٹ ہے۔ اب اس ٹیٹ کی منزل میں کمال کا آدمی وہ مانا جاتا ہے، دیکھیے یاد رکھیے گا، اگر بہادر ہیں ہم تو ہمیشہ بہادروں کے قہے پسند آئیں گے، بزدلوں کے قہے پسند آئیں گے، اگر ہم غنی ہیں تو سخاوت والوں کے قہے پسند آئیں گے، اگر کجوس ہیں تو کجوسوں کے قہے پسند آئیں گے۔ صلوٰۃ۔

یعنی جو ہمارا مزاج ہوگا، جو ہماری طبیعت ہوگی، جو ہمارا ٹیٹ ہوگا، اسی کا جو ہیرو ہوگا، اس کے ذکر میں مزہ آتا ہے۔ دوستوں! ہم ذکر اہل بیتؑ کرتے ہیں۔ ذرا اہل بیتؑ کا کردار قرآن کے آئینے میں دیکھو، کبھی حدیث کے آئینے میں دیکھو، کبھی تاریخ کے آئینے میں دیکھو۔ جب شجاعوں کا ذکر ہوگا تو سب سے زیادہ شجاع وہی نظر آئیں گے۔ جب معصوموں کا ذکر ہوگا تو سب سے زیادہ سخی وہی نظر آئیں گے۔ جس وقت دینداروں کا ذکر ہوگا تو سب سے زیادہ دیندار وہی نظر آئیں گے۔ جس وقت سجدہ کرنے والوں کا ذکر ہوگا، سب سے بڑے سجدہ کرنے والے وہی نظر آئیں گے۔ جب نبیؐ کے ساتھ دینے کا ذکر ہوگا، سب سے زیادہ ساتھ دینے والے وہی نظر آئیں گے۔ جب لوگوں کی مشکل کا تذکرہ

ہیں؟ کہا پر یکیش کا مطلب یہ ہے کہ پر یکیش کرو۔ کس کی پر یکیش کریں گے؟ بیٹلس کی۔ یعنی رے پر سے آدمی کیوں نہیں گزر پاتا۔ اس لیے کہ بیٹلس نہیں کر پاتا۔ ادھر جھکے تو ادھر گئے، ادھر جھکے تو ادھر گئے، وہاں تک نہیں پہنچے۔ تو صراط سے اللہ نے یہ سمجھایا ہے کہ متوازن زندگی اختیار کرو۔ ادھر جھکے تو ادھر گئے، ادھر جھکے تو ادھر گئے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہہ رہے، جنت نہیں پہنچے۔ اسلام بیٹلسنگ کا نام ہے۔ اپنے کھاتے کے بیٹلس لوگ خوب ٹھیک کر لیتے ہیں۔ صلوٰۃ

بیٹلسنگ پاور ہے یا علی۔ یہ تجربہ ہے لوگوں کا کہ یہ نام وہ ہے جو گرتوں کو سنبھال لیتا ہے۔ جب زمین پر گرتے کو سنبھال لیتا ہے تو آخرت میں تو اللہ بھی جانتا ہے کہ یہ ایسا فورس ہے جو سنبھالے رہتا ہے۔ اب ہم چل رہے ہیں۔ اب چلنے میں بیٹلس کی ضرورت ہے۔ تو آدمی بیٹلس کرتا ہے ہاتھوں سے۔ یہ دو ہاتھ اللہ نے دیے ہیں۔ اس سے بڑی مدد ملتی ہے انسان کو بیٹلس کرنے میں۔ کبھی آپ تجربہ کیجئے۔ جب آپ چلتے ہیں تو خود بخود دونوں ہاتھ چلتے ہیں۔ کبھی ایک ہاتھ روک کر چلنے، دیکھیے چال بدل جاتی ہے کہ نہیں؟ کبھی ایک ہاتھ روک کر چلنے۔ تجربات ہیں۔ دیکھیے چال میں کتنا فرق آ جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اگر دو ہاتھ دیئے تو دونوں کا سہارا لینا ہے۔ تو اگر اسلام کی بیٹلسنگ کے لیے اللہ نے قرآن اور عزت دونوں کو بھیجا۔ جب آپ کہتے ہیں ہمیں تو قرآن کافی ہے۔ کافی ہے، مگر چال بدل جائے گی۔ صلوٰۃ

یہ ہو سکتا ہے مگر چال بدل جائے گی اور چال ہی پر انحصار ہے۔ صرف اس دنیا میں پر یکیش کرنا ہے کہ قرآن کو بھی ایک ہاتھ میں رکھنا ہے اور اہل بیت کا دامن بھی ایک ہاتھ میں رکھنا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ جب لوگ بالٹی میں پانی بھر کے چلتے ہیں تو ایک طرف جھک جاتے ہیں۔ کبھی آپ نے دیکھا ہے لوگوں کو وزن اٹھائے ہوئے؟ گڑھا اٹھائے ہوئے، بالٹی اٹھائے ہوئے، جھکے جھکے چلتے ہیں۔ یہ آپ دائیں طرف کیوں جھک گئے؟ کہا اس ہاتھ میں بالٹی ہے۔ اس کا مطلب یہ وزن جھکا دیتا ہے۔ قرآن وزن ہے، جھکا دے گا اور صراط پر ذرا سا جھکے، اور گئے۔ تو جو سمجھ دار ہیں وہ ایک بالٹی نہیں دو بالٹی لے کر چلتے ہیں۔ جو دو بالٹی لے کر چلتا ہے، سینہ تانے ہوئے، سیدھا چلا جاتا ہے۔ جو ایک بالٹی لے کر چلتا ہے، جھکا ہوا چلتا ہے۔ بس یہی صراط پر سے گزرتا ہے۔ اگر ایک

آگئے ہیں۔ اس لیے کہ کبھی آپ کو ہماری بات پسند ہی نہ آئی۔ صلوٰۃ حضور، کون ہیں اہل بیت؟ کون ہیں آل محمد؟ آل محمد پارٹی بندی کی چیز نہیں ہیں۔ آل محمد گروہ بندی کی چیز نہیں ہیں، آل محمد کوئی سیاسی لیڈر نہیں ہیں، آل محمد مسلمان سے کچھ فیض نہیں حاصل کرنا چاہتے، آل محمد فیض بخش ہیں۔

وہ فیض بخش کہ دامن کوئی بچا نہ سکے کوئی دنیا میں بچا نہیں ہے جو آل محمد کے احسان سے خالی ہو۔ آپ سے میں پوچھتا ہوں، آپ کا مذہب کیا ہے؟ ادھر آپ نے کہا ہمارا مذہب اسلام ہے۔ سمجھ لیجئے کہ آپ آل محمد کے ممنون احسان ہیں کیونکہ یہ کلمہ بھی آل محمد کا بچایا ہوا ہے، یہ اذان بھی آل محمد کی بچائی ہوئی ہے، یہ مسجدیں بھی آل محمد کی بچائی ہوئی ہیں، یہ کعبہ بھی آل محمد کا بچایا ہوا ہے۔ اسلام میں جو کچھ ہے سب اہل بیت کا بچایا ہوا ہے۔ اب اہل بیت سے بچنا، اسلام سے بچنا ہے۔ اہل بیت کیا ہیں؟ سرمایہ نجات ہیں۔ اہل بیت کیا ہیں؟ جن کی محبت دنیا میں دین پر قائم رکھتی ہے اور صراط پر گزرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ صلوٰۃ پل صراط کیا چیز ہے؟ کہا پل پر سے گزرتا پڑے گا۔ کب گزرتا پڑے گا؟ مرنے کے فوراً بعد؟ کہا نہیں مرنے کے بعد تو قبر ہے۔ قبر کے بعد؟ کہا حشر ہے۔ حشر میں کیا ہو گا؟ کہا حساب کتاب۔ حشر میں میزان پر اعمال تولے جائیں گے۔ اس کے بعد فیصلہ سنایا جائے گا کہ تم اپنے لیے کیا فیصلہ کر کے آئے۔ اور اس کے بعد؟ کہا چلو۔ اب جو چلے تو لکھا ہے کتابوں میں، اس میں تیس (۳) فرقوں میں کوئی فرق نہیں، کہ ہر بشر کو ہر انسان کو پل صراط سے گزرتا پڑے گا۔ پل صراط کیا ہے؟ کہا ایک پل ہے۔ کیا نام ہے اس پل کا؟ صراط۔ کیا اس کی لمبائی ہے؟ کیا اس کی چوڑائی ہے؟ کہا شریعت کہتی ہے کہ بال سے زیادہ باریک ہے۔ اچھا! بال سے بھی زیادہ باریک ہے اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز۔ اس پر سے سب کو گزرتا ہے۔ کون گزرتے گا؟ آپ گزریں گے صراط پر سے؟ کہا ہم گزریں گے۔ میں ایک رسی باندھے دیتا ہوں۔ گزر کے دکھا دیجئے۔ ایک رسی باندھے دیتا ہوں، موٹی رسی، ادھر سے ادھر تک گزر جائے۔ کہا پر یکیش کرنا پڑے گی گزر جائیں گے۔ تو صراط کے لیے کون سی پر یکیش کر رہے ہیں۔ رے پر سے گزر نہیں سکتے بغیر پر یکیش کے، تو صراط پر سے ہم آپ کیا گزریں گے بغیر پر یکیش کے۔ پر یکیش کے کتے

جب اسپینڈ آئے گی تو بیلنس ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی کھینچ بھی لے، تو ڈبل اسپینڈ ہو جائے گی۔ ڈبل انجن لگ جائے گا۔ کوئی کھینچ رہا ہے، کوئی دھکیل رہا ہے۔ بیچ میں جنم، ادھر جنت۔ تو جنم میں دھکیلنے والے تو بہت ملتے ہیں، جنت میں دھکیلنے والا کہاں ملتا ہے۔ اس لیے حدیثوں میں کہا کہ ”صراط پر علیؑ ملیں گے۔“ ”علیؑ کون ہیں؟“ اول اہل بیتؑ۔ کیسے گئے یہ میرا ہے، ادھر کہا میرا ہے، تو علیؑ نے دھکا دیا، جنت نے کھینچا، علیؑ والا ہے، ڈبل اسپینڈ ہو گئی۔ تو صراط پر سے ہم خود نہیں گزر سکتے۔ ان کی محبت گزار لے جائے گی۔
صلوٰۃ

تو اب یہ محبت ہے جو صراط مستقیم پر قائم رکھتی۔ اسی لیے اہل بیتؑ کی محبت اجر رسالت میں طلب کی گئی۔ جس جس مسلمان کو اہل بیتؑ سے محبت ہوتی ہے، ایک تو اجر رسالت ادا ہوتا رہتا ہے۔ اجر رسالت خود بخود ادا ہوتا رہتا ہے محبت اہل بیتؑ سے۔ دوسری طرف راستہ سیدھا رہتا ہے۔ تیسری طرف بیلنس قائم رہتا ہے۔ چوتھی طرف جنت کی طرف کھینچا رہتا ہے اور جنت بھی علیؑ کے چاہنے والوں کو کھینچتی رہتی ہے۔ اس لیے کہ انہی کی محبت دلیل نجات ہے اور کیوں نہ دلیل نجات ہوگی۔ اللہ انہیں چاہے، رسولؐ انہیں چاہے۔
صلوٰۃ

اب وہ راتیں آگئیں کہ مصائب پر بھی زیادہ توجہ دینا ضروری ہے کیونکہ مصائب ملنا اور مصائب پر رونا بھی امتحان محبت ہے۔ ہر ایک کے آنسو نہیں نکلتا۔ آنسو اسی کے نکلتا ہے جسے کسی سے عشق ہوتا ہے، جسے کسی سے محبت ہوتی ہے۔ ارے یہ حسینؑ ابن علیؑ نے قربانی پیش کر کے دلیل محبت فراہم کر دی۔ اس عمل کی اہمیت یہ ہے کہ جب ہم غم حسینؑ میں روئے ہیں تو دکھیا ری ماں رومال سفید لے کر آجاتی ہے۔ مرحبا، مرحبا، تم میرے بیٹے کے غم میں رو رہے ہو، ہم تمہارے آنسوؤں کو اپنے رومال میں جمع کریں گے اور قیامت کے دن تمہاری بخشش کے لیے اور تمہاری نجات کے لیے ہم اپنے خزانے سے پیش کریں گے۔ جس اسلام کو آپؐ نے کر بلا سے پہچانا، وہ مظاہر محبت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ یہ کون بہتر (۷۲) جمع تھے حسینؑ کے گرد؟ جنہیں حسینؑ سے محبت تھی۔ اہل بیتؑ کی محبت نے انہیں بچا لیا اور جن کے دلوں میں اہل بیتؑ کی محبت نہیں تھی وہ لشکر یزید (لعین) میں شامل ہو کے واصل جہنم ہو گئے۔

ہاتھ میں قرآن، ایک ہاتھ میں اہل بیتؑ ہوں گے، سینہ تانے سیدھے چلے جائیں گے۔ اور اگر خالی قرآن لیے ہوں گے تو گر جائیں گے۔ آپؐ یہی تو کہیں گے ارے کیسے کافر ہو۔ قرآن لے کر جہنم میں جائیں گے؟ جی نہیں، وہاں کوئی کھڑا ہوگا، جب آپؐ گرنے لگیں گے تو قرآن لے لے گا۔ صلوٰۃ

آپؐ انصاف سے بتائیے، اگر کوئی بچہ چلا قرآن ہاتھ میں لے کر اور اس کا پیر پھسلا، تو اگر بچہ اکیلا ہے، آپؐ دوڑ کے بچے کو اٹھائیں گے۔ لیکن اگر بچہ ہاتھ میں قرآن لے رہا ہے تو بچے کو بھول جائیں گے قرآن کو سنبھالیں گے کہ بے ادبی نہ ہو۔ تو وہاں بھی جو صراط پر ہوگا، جب اس نے دیکھا مع قرآن چلا تو وہ آپؐ کو کہاں سنبھالے گا، قرآن کو سنبھالے گا اور اگر دونوں ہاتھ میں بیلنس برابر ہوگا، وزن برابر ہوگا، یعنی عزت کی پیروی بھی ہوگی، قرآن کی تلاوت بھی ہوگی، تو بیلنس صحیح ہوگا۔ اسی کا نام ہے صراط پر سے گزرتا۔ لیکن بیلنس کر کے گزرنے میں بھی کتنی پریشانی ہے۔ اس کی میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک چیز اور ہے جو بیلنس کر دیتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟ اس کا نام ہے رفتار۔ جیسے آپؐ بائیں سائیکل لیتے ہیں تو بائیں سائیکل کا ہینڈل چھوڑا آپؐ نے، تو اگر دائیں طرف وزن زیادہ ہے تو دائیں طرف گر جائے گی۔ اگر بائیں طرف وزن زیادہ ہے تو بائیں طرف گر جائے گی۔ تو سائیکل کو اگر آپؐ چھوڑیں گے تو کھڑی نہیں رہے گی۔ تو جب پتے ٹاڑ ہیں، بیلنس نہیں کر سکتی، سائیکل گر جائے گی۔ دائیں گر جائے گی یا بائیں گر جائے گی۔ اور اسی سائیکل پر جب آپؐ بیٹھ کر چلتے ہیں، نہیں گرتی۔ سائیکل تو وہی ہے؟ کہا سائیکل وہی ہے، کھڑی کی تو گر گئی اور پیڈل پر پیر رکھ کے بیٹھ گئے تو نہیں گری۔ تو کہا آپؐ سمجھے نہیں، یہ اسپینڈ میں آگئی۔ تو چیز رکی رہے گی تو بیلنس مشکل ہوگا۔ لیکن چیز اگر اسپینڈ میں ہوگی تو خود بخود بیلنس آجاتا ہے۔ یعنی کشش ثقل پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام تو بیلنس ہے۔ تو جب سائیکل پر آپؐ چلتے ہیں تو بیلنس رہتا ہے، جیسے ہی روکا، گر گئی۔ تو اسپینڈ کنٹرول کرتی ہے بیلنس کو۔ اسپینڈ کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تو دھکا دیا جائے کسی چیز کو، تب وہ آگے بڑھتی ہے۔ یا کھینچا جائے تب وہ چیز آگے بڑھتی ہے۔ یعنی یا دھکا دینے سے بڑھتی ہے یا کھینچنے سے بڑھتی ہے ورنہ بڑھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو اب صراط پر یہ تلاش کر لیجئے کہ کوئی چیز ہمیں ایسی مل جائے جو دھکا دے، تو اسپینڈ آجائے گی۔

باڑے کی چوکھٹ کو کیوں چومتے ہو؟ ہم سے نہ پوچھو، ام البنینؑ سے پوچھو کہ زوجہ بن کے آئیں تھیں۔ زوجہ گھر کی مالکہ ہوتی ہے، کیوں چوما؟ لوگوں نے بڑھ کے کہا ام البنینؑ آپ علیؑ کی زوجہ کی حیثیت سے بیاہ کے آئی ہیں، آپ اس گھر کی مالکہ ہیں۔ آپ چوکھٹ چومتی ہیں؟ کہا میں اس گھر کی مالکہ کہاں سے ہو گئی۔ یہ بی بی سیدہؑ کی ڈیوڑھی ہے۔ جب ماں ایسی ہوتی ہے تو بیٹا عباسؑ سا ہوتا ہے۔ جب گھر میں داخل ہوئیں تو شہزادے بیٹھے ہوئے تھے۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ ماں کی تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ جناب ام البنینؑ نے کہا شہزادوں آپ کیوں کھڑے ہوئے تعظیم کو؟ کہا آپ ہماری ماں ہیں۔ کہا نہیں نہیں، میں خدمت کرنے کے لیے آئی ہوں۔ آپ کی ماں تو خاتون جنتؑ ہیں۔ اللہ اللہ، جب بی بی کے دل میں اتنا احترام ہوتا ہے، تب قدر ہوتی ہے کہ اہل بیتؑ اور ان کی محبت کیا ہے اور یہ وہی تھیں جب عباسؑ جیسا چاند سا بیٹا پیدا ہوا تو ہمیشہ یہی سمجھایا، دیکھو عباسؑ کبھی حسنؑ اور حسینؑ کو بھائی نہ کہتا، آقا کہتا۔ وہ آقا ہیں، تم غلام ہو۔

حالانکہ عمومی ذہنیت یہ ہے کہ سوتیلی ماں سوتیلے بیٹوں کو سمجھاتی ہے کہ تم درجے میں برابر ہو۔ کسی بی بی نے کہا ام البنینؑ یہ آپ کیوں اپنے بچوں سے کتنی ہیں کہ تم غلام ہو، وہ آقا ہیں۔ آخر علیؑ کے یہ بھی بیٹے ہیں، علیؑ کے وہ بھی بیٹے ہیں؟ کہا خاموش ہو جاؤ، یہ علیؑ کے بیٹے ہیں، وہ محمدؐ معطفی کے بیٹے ہیں۔ یہ مجھ سے ہیں، وہ خاتون جنتؑ سے ہیں۔ ارے یہ بچے علیؑ کے ہیں مگر سردار نہیں ہیں جو اتنا جنت کے۔ جو مرتبہ شناس ہوتے ہیں وہ برابر آکے بھی برابری نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ کوفہ میں مولانا بیٹھے ہوئے ہیں۔ حسینؑ کو پیاس لگی۔ کہا پانی لاؤ۔ لوگ دوڑے حسینؑ کے لیے پانی لانے کو۔ ایک مرتبہ لوگوں نے مسجد میں دیکھا کہ ایک پھونٹا سا بچہ، ایک کاسہ آب سر پر رکھے، لیے چلا آ رہا ہے۔ پانی چھلک رہا ہے، کپڑے بھیگ رہے ہیں اور سب سے پہلے وہ بچہ ہی پانی لایا۔ جب کاسہ اتار کر بڑھایا تو سب نے دیکھا یہ عباسؑ ہے۔ علیؑ نے اٹھایا، گود میں بٹھایا، بوسے دینے لگے۔ لوگوں نے پوچھا یا علیؑ بڑا پیار آگیا عباسؑ پر۔ چھوٹے بھائی کا فرض ہے بڑے بھائی کے لیے پانی لانا۔ کہا خاموش ہو جاؤ، تو وہ نہیں جانتا جو میں جانتا ہوں۔ ارے یہ کرتا جو آج پانی میں بیگا ہے، یہ کرتا ایک دن اسی پانی کے لیے خون میں ڈوب جائے گا۔ علیؑ نے مجلس پڑھی، عباسؑ کے مصائب پڑھے۔ اصحاب علیؑ نے مسجد کوفہ میں رونا

کر بلا کی محبت، ابدی محبت ہے، ازلی محبت ہے، ابراہیمؑ غم حسینؑ میں روئے، اسماعیلؑ غم حسینؑ میں روئے اور جناب یوسفؑ، جناب یحییٰؑ، جناب زکریاؑ، جناب صالحؑ، جناب سلیمانؑ و داؤدؑ۔ جناب ختمی مرتبتؑ کیا ایک بار روئے؟ کبھی مسجد میں روئے، کبھی منبر پر روئے، کبھی گھر میں بیٹھ کر روئے، کبھی کسی کے سامنے ذکر کر کے روئے۔ اور یہ دن تو وہ ہیں کہ جب محرم آتا ہے تو نانا نواسے پر مسلسل روتا ہے، دکھیا ری ماں بھی گریہ کرتی ہے۔ کر بلا حادثہ نہیں ہے۔ کر بلا کے لیے نانا نے اپنے نواسے کے بیٹے کے لیے دعا کی تھی اور علی اکبرؑ شبیبہؑ پیغمبر بن کر کر بلا میں آئے تھے۔ حسنؑ نے قاسمؑ کو ذخیرہ کیا تھا۔ جناب سیدہؑ نے جناب زینبؑ و ام کلثومؑ کو بھیجا تھا۔ رسول اللہؐ نے علی اکبرؑ کو بھیجا تھا اور علیؑ نے عباسؑ کو بھیجا تھا۔

آج کی رات ہم اور آپ مل کے عباسؑ کا ماتم کرتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ ماتم عباسؑ سے منسوب ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بڑے بھائی کے غم میں چھوٹے بھائی کا حق ہے ماتم کرنا، مگر چونکہ چھوٹے بھائی کے شانے قلم ہو گئے تھے، عباسؑ کیسے ماتم کرتے، دونوں بازو قلم ہو گئے تھے۔ اس لیے آج نوجوان کہتا ہے آقا عباسؑ! آپ اپنے بھائی کا ماتم نہ کر سکتے، تو آپ کی طرف سے لاکھوں ہاتھ اٹھیں گے ماتم کرنے کے لیے۔ یہ غم حسینؑ میں سرود سینہ پینا، یہ غم حسینؑ میں ماتم کرنا۔ اس کی کیا تاثر ہے۔ خود ایک مجلس اس کے لیے چاہیے کہ یہ ماتم کیا ہے، یہ گریہ کیا ہے، مگر کون سی کشش ہے نوجوانوں کو مجبور کر دیتی ہے؟ یہ عباسؑ کی حسرت ہے کہ ہائے ہم بھائی کا ماتم کیسے کریں، دونوں شانے قلم ہو گئے۔ تو اللہ نے کہا تم نے اپنے شانوں کو ہمارے ہاتھ پر نثار کیا۔ ہم لاکھوں ہاتھ اٹھا دیں گے تمہارے ماتم میں۔

کون عباسؑ؟ جن کے لیے جناب عقلؑ سے کہا تھا جناب امیر المومنینؑ نے، بھائی عقلؑ ہم ایسے خاندان میں عقد کرنا چاہتے ہیں جس سے ایسا شجاع بیٹا پیدا ہو جو وقت مصیبت میرے حسینؑ کے کام آئے۔ جناب عقلؑ نے قبیلہ تلاش کیا، جناب ام البنینؑ سے عقد ہوا۔ جب عقد کے بعد جناب ام البنینؑ آئیں علیؑ کے گھر، تو آتے ہی جھک کر چوکھٹ کو بوسہ دیا۔ آج کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تم علم کو کیوں چومتے ہو؟ تم امام

زمین پر ایک خط کھینچا، کہا جس کی ہمت ہو وہ اس خط سے آگے بڑھے۔ تو میرا نہیں فرماتے ہیں، یہ بیت تھی کہ۔

لڑہ پڑا تھا رعب سے ہر نابکار کو

روکے تھا ایک شیر جری، دس ہزار کو

ادھر جناب زہنب نے کہا، بھیا حسین جلدی خیمے کے باہر جائے۔ کہا بن کیا ہے؟ کہا عباس سے جنگ ہوئی جاتی ہے۔ حسین آئے دیکھا کہ شیر بھرا ہوا ہے۔ پشت پر ہاتھ رکھا، مڑ کے دیکھا۔ کہا آقا۔ کہا عباس خیمے ہٹالو، ہم اہل بیت ابتدا نہیں کرتے۔ خیمے ہٹالو، معمولی بات ہے۔ اصل شجاعت صبر ہے۔ گھوڑے سے کود پڑے۔ خیمے ہٹا کے ربیعہ پر ہریا کیے۔ خیمے تو ہٹا دیئے لیکن پیاس میں عباس کنوئیں کھودتے رہے۔ کتنی پیاس بڑھ گئی ہوگی جناب عباس کی اس لیے کہ مسلسل کنوئیں کھودتے تھے مگر پانی نہیں نکلتا تھا۔

یہاں تک کہ شب عاشور آگئی اور اسپ دو رکابہ پر سوار، خیموں کے گرد جناب عباس پھر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ زہیر قین آئے، کوفے کے رہنے والے تھے۔ کہا آقا مجھے کچھ کہنا ہے۔ کہا کو زہیر کیا کہنا چاہتے ہو؟ کہا میں اس دن مسجد میں بیٹھا تھا جب آپ کے بابا نے عقیل سے کہا تھا کہ میں ایسے شجاع خاندان میں عقد کرنا چاہتا ہوں جس سے ایسا بیٹا پیدا ہو جو وقت مصیبت حسین کے کام آئے۔ کہا کیا مطلب زہیر؟ کہا آج ہی کے لیے آپ کو ذخیرہ کیا ہے۔ بس ایک مرتبہ اٹھو آئی لی، تھے رکابوں کے ٹوٹ گئے۔ کہا زہیر تم مجھے شجاعت سکھا رہے ہو، زہیر خدا کی قسم یہ لشکر کوئی حقیقت نہیں رکھتا لیکن زہیر مجھے آقا سے اجازت دلا دینا۔ اللہ اللہ کیا عباس کے دل پر گزر رہی تھی۔ یہ یقین تھا کہ اجازت نہیں ملے گی۔ اجازت مل جائے تو اس لشکر کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ صبح نمودار ہوئی۔ ایک ایک کر کے میدان میں جانے لگا۔ ہاں اب آپ آمادہ ہو جائیں تاکہ عباس کا حق بھی ادا ہو جائے۔ اس لیے کہ عباس کو باب الحوائج قرار دیا۔ خدا آپ کو زیارت سے شرف کرے۔ آپ روضہ عباس پر جائیں گے تو باب الحوائج لکھا ہوا ہے یعنی حاجتیں پوری ہونے کا دروازہ۔ روایات میں ہے کہ چونکہ عباس کی حسرت پوری نہ ہوئی کر بلا میں پیاسی بھتیجی کے لیے پانی نہ لاسکے، اس لیے خدا نے باب الحوائج بنا دیا۔ ایک واقعہ جو عراق میں سنا تھا، آپ بھی سن لیں کہ عباس کون ہیں؟ لوگ مریضوں

شروع کیا۔

یہ وہ عباس ہے، جب کوفے میں علی دنیا سے رخصت ہونے لگے تو روایات میں ملتا ہے کہ ایک ایک بیٹے کو، ایک ایک بیٹی کو بلا کے امام حسن کے سپرد کیا، کہا حسن کہاں ہیں؟ قریب بلایا، اولاد کو بلاتے جاتے تھے، ہاتھ لے کے حسن کے ہاتھ میں دیتے تھے۔ حسن میرے بعد میری اولاد سے خبردار رہنا۔ سب کو سپرد کر دیا۔ عباس آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے آئے ماں کے پاس۔ کہا اماں میں نے کیا غلطی کی ہے۔ کہا کیا ہوا بیٹا؟ کہا بابا نے سب کو امام کے سپرد کیا، مجھے نہیں سونپا۔ ام البنین آنکھیں لگیں، کون سے آنکھیں ملیں، علی نے پوچھا کون؟ کہا آپ کی کنیز ام البنین۔ کہا کیوں رو رہی ہو؟ کہا آقا میرے عباس کو کیوں رلا دیا۔ کہا عباس کہاں ہیں؟ میرے پاس لاؤ۔ کہا رو رہے ہیں کہ آپ نے سب کو حسن کے سپرد کیا، عباس کو چھوڑ دیا۔ کہا نہیں نہیں ام البنین، عباس کو میرے پاس لاؤ۔ عباس کو سینے سے لگایا، میرے لال نہ رو۔ یہ کہہ کے آواز دی، حسین اور جیسے ہی حسین آگے بڑھے، عباس کے دونوں ہاتھ لے کر حسین کے ہاتھ میں دیئے۔ بیٹا حسین عباس سے خبردار رہنا۔

۱۱ویں رمضان کی رات کو عباس کے ہاتھوں کو حسین کے ہاتھوں میں علی نے دیا کہ یہ تمہارے سپرد ہے۔ جب عاشور کے دن حسین کو عباس کے کٹے ہوئے ہاتھ ملے اور اٹھا کے چوا تو ۱۱ویں رمضان کی رات یاد آگئی ہوگی۔ یہ وہی ہاتھ ہیں جو بابا نے میرے ہاتھوں میں دیئے تھے۔ مگر جب بابا نے یہ ہاتھ دیئے تھے تو جڑے ہوئے تھے۔ آج مجھے خاک پر ملے ہیں تو کٹے ہوئے ہیں۔ جناب عباس کو سونپا، علی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ عباس نے حسن سے وفا کی، عباس نے حسین سے وفا کی۔ جب مدینے سے قافلہ چلنے لگا تو تاریخ کہتی ہے کہ عباس ایک بلند گھوڑے پر سوار تھے۔ تلوار کاندھے پر برہنہ رکھے تھے۔ کبھی آگے جاتے تھے، کبھی پیچھے جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ معمولوں کی طرف نظر اٹھا کے دیکھے یعنی عباس بیبیوں کے پردے کے محافظ تھے اور جب یہی عباس کر بلا پہنچے اور حسین نے کہا خیمے نصب کرو۔ جناب عباس نے فرات کے کنارے خیمے نصب کیے۔ جب چوتھی محرم کو شمر (لعین) نے آگے کہا۔ خیمے فرات کے کنارے سے ہٹائے جائیں تو عباس کو جلال آگیا۔ کہا کس کی مجال ہے۔ نیزہ کاندھے پر سے اتارا،

میں تھا۔ جلوس نکل رہے تھے۔ میں نے دیکھا ساتویں محرم کو ایک جلوس حسینؑ کے روئے سے نکلا۔ قمری ہاشمؑ کے روئے کی طرف بڑھا۔ بچے کالا کرتا پہنے ہوئے ہاتھ میں خالی کوزے لیے ہوئے "العطش العطش" کہتے ہوئے بڑھے۔ میں ساتھ تھا۔ جب یہ ننھے ننھے بچوں کا جلوس روضہ عباسؑ پر پہنچا، باب قبلہ پر پہنچا اور آواز دی، چچا ہم پیاسے ہیں، تو معلوم ہوتا تھا کہ زمین کر بلا مل رہی ہے۔ عباسؑ جلال میں ہیں۔ حسینؑ قریب آئے، سیکنہؑ آگے بڑھیں، بابا علمؑ آگیا، علمدارؑ نہیں آیا۔ حسینؑ نے گود میں اٹھالیا، سیکنہؑ تیرا چچا مار ڈالا گیا۔ علمؑ گیا تھا۔ مشکوٰۃ الگ گیا تھا مگر جب علمؑ واپس آیا تو سیکنہؑ کا مشکوٰۃ چھدا ہوا علمؑ میں بندھا ہوا تھا۔ جب سے بھتیجی کی مشک علمؑ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اب جو علمؑ علی اکبرؑ لے کر بڑھے، بچوں نے ماتم شروع کیا۔ وا عباسا، وا ابا، وا عباسا۔ فضاؑ نے خیمے کا پردہ اٹھایا۔ علی اکبرؑ علمؑ لے کر خیمے میں پہنچے۔ جنازہ تو آیا نہیں تھا۔ علمؑ مسند پر رکھ دیا، بیویوں نے آکر مسند کو گھیر لیا۔ آواز دی عباسؑ تم فرات کے کنارے سے واپس نہ آئے۔ بی بی زینبؑ کہہ رہی تھیں عباسؑ اب میری چادر کا خدا حافظ ہے، اب میرا بھیا اکیلا رہ گیا۔ اے عباسؑ سیکنہؑ کا ترپنا نہیں دیکھا جاتا۔ بچوں کا بلکنا نہیں دیکھا جاتا۔



کولا کے ضریح سے باندھ دیتے ہیں۔ لوگ اسے توہم پرستی سمجھتے ہیں۔ ارے تمہیں کیا پتا، اللہ نے اپنے عباسؑ کو کیا قدرت اور اختیار بخشا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ضعیف بیمار جسے اسپتال سے رہا کر دیا گیا تھا۔ لوگوں نے کہا اب یہ مرجائے گا، نہیں بچے گا۔ ماں اس بیٹے کو لے کر آئی کر بلا، بغداد سے اور ضریح سے باندھ کر کہا، عباسؑ سارے ڈاکٹر کہہ چکے ہیں کہ نہیں بچے گا۔ اب میں تمہارے پاس لے کر آئی ہوں، عباسؑ مجھے زندہ طے میرا بیٹا۔ ضریح سے باندھ دیا۔ صبح کو جب خادم آئے، ماں آئی، تو دیکھا بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔ کہا کیا ہوا؟ کہا ماں عجب واقعہ گزرا۔ رات کو ملک الموت قبض روح کے لیے آئے تو ضریح سے آواز آئی عباسؑ کی، ملک الموت یہ میری ضمانت میں ہے۔ کہا اے حضرت عباسؑ حکم الہی سے آیا ہوں۔ کہا میں حکم الہی میں مانع نہیں ہوتا، لیکن جا کے میری طرف سے عرض کرو کہ عباسؑ سفارش کرتا ہے۔ ملک الموت نے کہا کہ یہ قضائے مہر ہے، آخری موت ہے۔ کہا اچھالے جاؤ اس کو تمہرے باب الحوائج کا خطاب بھی لیتے جاؤ۔ ایک مرجہ ملک الموت آئے، کہا خدا بعد تحفہ درود و سلام کے ارشاد فرماتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا، باب الحوائج کا خطاب نہیں واپس ہو گا۔ بتاؤ کتنی عزت دی جائے۔

اللہ اللہ عباسؑ کے اقتدار اور قدرت کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔ جو پھریرے کے سائے میں آتا ہے، وہی ہوا کا مزہ جانتا ہے۔ لیکن دعا مانگنے میں خلوص چاہیے، عقیدت چاہیے۔ ان کا امتحان نہیں لینا ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہ جو خدا سے کہیں گے، سفارش کریں گے، وہ سفارش کبھی رد نہیں ہو سکتی۔ بس عزاداروں یہ وہ عباسؑ ہیں جو فرات کی طرف جارہے ہیں۔ جناب سیکنہؑ بچوں کو لیے کھڑی ہیں۔ وہ میرا چچا جارہا ہے، وہ علمؑ جارہا ہے، ابھی فرات سے پانی آئے گا۔ اے بچوں ہم تم کو یہ پانی پلائیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ علمؑ کیوں اٹھاتے ہو؟ آؤ ہم بتائیں پہلا علمؑ کس نے اٹھایا۔ لوگ کہتے ہیں یہ پھریرے پر خون کے دھبے کیوں ہوتے ہیں؟ آؤ ہم تمہیں کر بلا میں علمؑ دکھائیں۔ پہلا علمؑ علی اکبرؑ نے اٹھایا۔ علی اکبرؑ علمؑ لیے ہوئے تھے۔ حسینؑ مکر پکڑے ہوئے نوحہ پڑھ رہے تھے۔ تمہارے مرنے نے راہ اور تدبیر مسدود کر دی بھیا عباسؑ۔ حسینؑ کی کمر شکستہ ہو گئی۔ جناب سیکنہؑ نے کہا بچوں علمؑ آ رہا ہے، بچے خالی کوزے ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ خدا اس دور کو تیزی کے ساتھ بدلے۔ سن ۶۳ میں، میں کر بلا معلیٰ

انہوں نے علم حاصل کیا اور کسی شعبہ حیات میں ترقی کی تہ لوگوں نے ان کو جانا اور پہچانا۔ پیدا ہوتے وقت کسی کی کوئی اہمیت کائنات میں نہیں ہوتی کیونکہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بچہ جو آج پیدا ہوا ہے، یہ کل کس شخصیت کا مالک ہوگا۔ دنیا میں بڑے بڑے رہبر گزرے ہیں، بڑے انقلاب لانے والے گزرے ہیں، بڑے بڑے علماء گزرے ہیں، بڑے بڑے سائنس دان گزرے ہیں، لیکن آپ بتائیے کہ ولادت کے وقت پیدا ہونے کی اہمیت کسی کی نظر میں تھی کہ کون ہے؟ کبھی نہیں ہوا۔

تاریخ عالم کا آپ جائزہ لے لیں، جتنی بڑی بڑی شخصیتیں ہیں، نام نہیں لینا چاہتا، آپ جانتے ہیں تاریخ کی بڑی شخصیتوں کو، جب پیدا ہوئیں تھیں تو کوئی جانتا تھا کہ کون ہیں، یہ کیا ہیں؟ کوئی اہمیت، کوئی آثار ان کی بڑائی کے، کوئی بات تاریخ میں ایسی ملتی ہے کہ یہ تو جس دن پیدا ہوئے تھے، اسی دن پتا چل گیا تھا کہ کوئی ایسی شخصیت ہے۔ کسی کے لیے تاریخ نے نہیں لکھا۔ برخلاف اس کے آپ کے نبی، سرور کائنات ختمی مرتبت جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے وقت، آپ اسلام کے تہتر (۷۳) فرقوں سے پوچھنے، علماء سے پوچھنے کہ تاریخیں کیا لکھتی ہیں۔ یعنی جب حضور کی ولادت ہوئی تو کسی نے نہ جانا کہ یہ کون ہے۔ مگر ولادت ہی کے وقت یہ جان لیا کہ یہ کوئی عام بچہ نہیں ہے، ہمارا جیسا کوئی بچہ نہیں ہے بلکہ یہ کسی شخصیت کا حامل ہے، کسی بزرگی کا حامل ہے۔ اس کی ولادت ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کوئی اہمیت شخصیت ہے۔ اور اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ جس وقت حضور کی ولادت ہوئی تو تاریخ اور سیرت میں جو لکھا ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ چند چیزیں رونما ہوئیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ سرور کائنات کی ولادت کے ساتھ مکہ میں ایک نور چکا، ایک لائٹ پیدا ہوئی اور لوگ یہ کہتے ہیں لائٹ ایسی تھی کہ اس میں دور دور کی آبادیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ چیز سب نے محسوس کی کہ ایک لائٹ پیدا ہوئی، ایک نور چکا، ایک برق چمکی، ایک بجلی چمکی اور ساری دنیا منور ہو گئی۔ ایک تو یہ علامت اہل مکہ نے دیکھی اور اس کے بعد عراق میں آپ کو معلوم ہے، کسریٰ کی حکومت تھی، کسریٰ بادشاہ تھا۔ اس کا قصر تھا۔ اس کے قصر کے کنکرے گر گئے۔ یعنی نہ کوئی زلزلہ آیا، نہ کوئی آندھی آئی، نہ کوئی طوفان آیا۔ حضور کی ولادت کے وقت قصر کسریٰ کے کنکرے زمین پر

آٹھویں مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل لا اسئلكم عليه اجرا" الا المودة فی القربی

برادران ملت!

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرما رہا ہے کہ ”میرے حبیب آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقربا ہیں ان سے مودت اور محبت رکھو۔“

”محبت اہل بیت“ کے موضوع پر محفل مرتضیٰ کے پہلے عشرے میں جو گفتگو آپ کے سامنے جاری تھی وہ کل اس منزل تک پہنچی تھی کہ قرابت داروں سے کون شخصیتیں مراد ہیں؟ بظاہر مباہلہ کے میدان میں پیغمبر نے اپنے قرابت داروں کو لے جاکے پہنچوا دیا۔ چادر کساء کے نیچے گھر میں جمع کر کے پہنچوا دیا اور تمام مسلمان اور خصوصاً علماء اسلام اس بات کو جانتے ہیں کہ بچن ”پاک کی شخصیت اور ان کی عظمت اور بچن ”پاک کا مرتبہ اور درجہ سب سے مختلف ہے، سب سے جداگانہ ہے۔ اور کثرت سے روایات میں اس بات کا تذکرہ ملتا ہے یعنی صرف تاریخ اسلام ہی میں نہیں، زیادہ تر شخصیتیں دنیا میں ایسی گزری ہیں کہ جب وہ پیدا ہوئے تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون پیدا ہوا۔ جب

ہے کہ دور دور تک محمدؐ کی ولادت نے اثر کیا اور کعبہ کے گرد جو بت رکھے ہوئے تھے، ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ پھر آگے بڑھ کے تاریخیں یہ لکھتی ہیں کہ جس دن علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولادت ہوئی، کعبہ کے بت منہ کے بل گر پڑے۔ صلوٰۃ

نبیؐ کی ولادت کی علامت دور دور ظاہر ہوئی اور علیؑ کی ولادت کی علامت کعبہ میں ظاہر ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا شروع سے سمجھانا چاہتا تھا اپنے بندوں کو کہ ہم نے دو شخصیتوں کو خلق کیا ہے، ایک اس کو خلق کیا ہے کہ جو ہمارا دین لے کے جائے گا اور ہمارا آخری پیغمبر ہوگا۔ اس کی ذمہ داری دین پہنچانا ہوگی۔ اور ایک اس کو خلق کیا ہے جو اس کے پہنچائے ہوئے دین کو بچائے گا۔ وہاں پر نبوت کا خاتمہ ہوگا، یہاں سے اہل بیتؑ کا آغاز ہوگا۔ تم جس کعبہ کی طرف سر جھکاؤ گے، وہاں ولادت علیؑ کی نشانی نمایاں ہوگی۔ کیوں؟ اس لیے کہ علیؑ سے اختلاف غیروں کو نہیں ہوگا، جب ہوگا مسلمانوں کو ہی ہوگا۔ صلوٰۃ

علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولادت اللہ کے گھر میں ہوئی۔ جناب فاطمہؑ بنت اسد تشریف لے گئیں، دیوار کعبہ در بنی، تین دن تک کعبہ میں مقیم رہیں۔ تیسرے دن پیغمبر اسلامؐ گئے تو پھر دیوار کعبہ وہیں سے شق ہوئی، تشریف لے گئے۔ اور لوگ کہتے ہیں جب پیغمبرؐ نکلے تو آپؐ کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اسی بچے کا نام علیؑ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شخصیتوں نے آنے کے بعد، دنیا میں علم حاصل کر کے ترقی نہیں کی بلکہ یہ دو شخصیتیں وہ تھیں جو اللہ کی طرف سے اس لیے بھیجی گئیں تھیں کہ بندے معلوم کر سکیں کہ اللہ کا دین کیا ہے۔ چنانچہ آپؐ ملاحظہ فرمائیں کہ وہ علامت خانہ کعبہ کے بت منہ کے بل گرے جب مولائے کائنات علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولادت ہوئی۔ میں ایک بات آپؐ سے اس موقع پر کہنا چاہتا ہوں اور وہ بات یہ ہے کہ جو لوگ بتوں کو پرستش کر رہے تھے، جو لوگ لات و منات کو خدا سمجھ رہے تھے، جو لوگ اپنے اپنے خدا بنا کے لائے تھے اور انہوں نے کعبہ میں خدا بنا کے رکھے تھے اور کہہ رہے تھے کہ بس یہی خدا ہے اور ان سے ڈر بھی رہے تھے، اور ان کی پوجا بھی کر رہے تھے، ان کی پرستش بھی کر رہے تھے، وہ ان کے ماننے والے تھے۔ آپؐ کا کیا خیال ہے کہ وہ ان بتوں کے ماننے والے تھے، بتوں سے ان کو عقیدت تھی، بتوں کی پرستش کر رہے تھے؟ میرا خیال ہے کہ وہ ان بتوں کے

گر گئے۔ وہ جو برجیاں بنی تھیں، کنکرے بنے تھے، وہ سب گر گئے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اب کیا ہوا؟ یہ کنکرے کیوں گر گئے؟ دوسرے ”سادہ“ ایک دریا تھا، جس کی لوگ پرستش کرتے تھے، جس کو خدا سمجھتے تھے، جس کو پوتر سمجھتے تھے، ایک دم خشک ہو گیا۔ پانی نہیں رہا اس میں۔ لوگوں کو حیرت ہو گئی کہ جس کو ہم خدا سمجھتے تھے، وہ خدا کہاں غائب ہو گیا۔ اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ فارس میں، ایران میں، وہ آگ جو ہزاروں سال سے جل رہی تھی اور جس کی پرستش کی جا رہی تھی، وہ آتش کدہ فارس گل ہو گیا۔ بغیر پانی بر سے ہوئے، بغیر کوئی ہوا چلے، ایک دم آگ ٹھنڈی ہو گئی، آگ ختم ہو گئی۔ تو اب لوگوں کو پریشانی ہوئی کہ یہ کیا ہوا یعنی چار جگہ نشانیاں نمودار ہوئیں۔ قصر کسریٰ کے کنکرے گرے اس لیے کہ لوگ کسریٰ کو اپنا بادشاہ ہی نہیں خدا تک مانتے تھے۔ ”سادہ“ کا پانی خشک ہوا یعنی جس کی لوگ پرستش کر رہے تھے، وہ پانی ختم ہو گیا۔ جس آگ کو پوج رہے تھے، وہ آگ بجھ گئی۔ تو کیا وجہ ہے کہ ساری دنیا میں جہاں جہاں کفر تھا، جہاں جہاں شرک تھا، وہاں وہاں نشانیاں نمودار ہوئی۔ تو اللہ نے یہ بتایا کہ کوئی بھی میرا نبی نہیں بن سکتا۔ تم کہہ سکتے ہو ہم نبی ہیں۔ مگر ہم جسے نبی بنا کر بھیجتے ہیں تو یہ نہیں کہ جس دن اعلان کرے اس دن تمہیں معلوم ہو کہ کوئی شخصیت ہے۔ ہم پہلے دن جب زمین پر بھیجتے ہیں تو کوئی ایسی علامت ظاہر کر دیتے ہیں تاکہ جب تم کسی کو بناؤ گے، تو جب بنانا چاہو گے تب بناؤ گے، ولادت کے وقت سے کیسے بنا سکتے ہو۔ یہ تو ہم ہیں جو اسی وقت سے اظہار کرتے ہیں۔

اب ایک میرے سوال کا آپؐ جواب دے دیں کہ تمام تاریخیں یہ لکھتی ہیں کہ حضورؐ کی ولادت کے وقت قصر کسریٰ کے کنکرے گرے، ”سادہ“ کا پانی خشک ہوا، آتش کدہ فارس گل ہوا اور مکہ میں ایک روشنی پیدا ہوئی۔ تو جہاں جہاں کفر و شرک تھا، وہاں اور علامتیں نمایاں ہوئیں اور مکہ میں حضورؐ پیدا ہوئے اور مکہ میں خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت رکھے تھے اور وہاں کسی کو کچھ نہ پتا چلا، کعبہ پر کوئی اثر نہیں پڑا، کعبہ کے گرد جو بت تھے، ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ کسریٰ کے ماننے والوں کو معلوم ہوا کہ کوئی آیا، ”سادہ“ کے ماننے والوں کو معلوم ہوا کہ کوئی آیا، لیکن کے میں بت پرستی کرنے والوں کو کچھ نہ پتا چلا کہ کون آیا۔ آثار نہیں نمودار ہوئے۔ اس کا مطلب یہ

ہی نہیں کریں گے کیا۔ ارے بھی تو آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟ کہا ہم جیتنے کے لیے تھوڑی کھڑے ہوئے ہیں۔ کہا پھر؟ کہا ہم تو طاہر صاحب کو ہرانے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک مزاج ہوتا ہے کہ نہیں؟ معلوم ہے کہ ہم جیتیں گے نہیں، پھر کیوں کھڑے ہیں؟ کہا ہم جیتنے کے لیے نہیں، ان کے ووٹ کاٹنے کے لیے کھڑے ہیں۔ تو مقصد کھڑے ہونے کا کیا ہے؟ اقتدار میں آنا نہیں، خدمت کرنا نہیں، طاہر صاحب کامیاب نہ ہونے پائیں، اس لیے کھڑے ہیں تاکہ ان کے ووٹ کاٹ لیں۔ یہی نظریہ مذاہب میں چلتا ہے۔

بچوں کو جو لوگ مان رہے تھے، وہ بت پرست نہیں تھے۔ ان کو تو یہ ضد تھی کہ اسے خدا نہ کہیں گے، وہ سب خدا کے خلاف تھے۔ جو حقیقی خدا ہے اسے نہ کہیں گے، اللہ کو اللہ نہیں مانیں گے، جو حقیقی خدا ہے اس پر یقین نہیں کریں گے۔ یعنی سب یہ نہیں ہے کہ ہمارا خدا کوئی ہے۔ سب یہ ہے کہ خدا تو تو ہی ہے، ہم جانتے ہیں کہ تو ہی ہے، تیرے علاوہ کوئی نہیں ہے، مگر ہمارے مزاج میں ایک ضد ہے کہ تجھے نہیں مانیں گے۔ جب تجھے نہیں مانیں گے تو جو مل جائے گا اپنے کو خدا کہلانے والا اس کو کہنے لگیں گے۔ فرعون کے گامچے کو، فرعون کو خدا مان لیں گے۔ نمرود کے گامچے کو، نمرود کو خدا مان لیں گے۔ شداد کے گامچے کو، شداد کو خدا مان لیں گے۔ اور جب انسانوں میں کوئی نہ کہے گا مجھے کو، تو پھر کاہنہ کے مان لیں گے۔ مگر تجھے نہیں مانیں گے۔ یعنی مذہب کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک کسی کو ماننا، ایک کسی حقیقت کا انکار کرنا۔

تو جو عرب تھے وہ انہیں خدا نہیں مان رہے تھے۔ اگر مان رہے ہوتے تو جیسے ہی کعبے کے بت گرے تھے، وہ بھی سجدے میں گر جاتے، جو لوگ ”سادہ“ کے پانی کی پرستش کر رہے تھے، ان کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ ایک بندہ اللہ کا، کعبے میں پیدا ہوا ہے جس کا نام محمد ہے اور اس کی ولادت کی وجہ سے پانی خشک ہو گیا ہے۔ تو دوڑ کے جاتے کہ اس بچے کی زیارت کریں گے۔ کون آیا جو ہمارا خدا غائب ہو گیا! اگر فارس کے رہنے والے واقعی آگ کو خدا مان رہے ہوتے تو جیسے ہی آگ بجھ گئی تھی ویسے ہی تلاش کرتے کہ آگ کیسے بجھ گئی، ہمارا خدا کس کا قائل ہو گیا۔ جیسے ہی قصر کسریٰ کے کنکرے گرے تھے، ویسے ہی کسریٰ والے بڑھتے، یہ کون آیا کہ کنکرے گر گئے۔ انہوں نے کنکروں کی

ماننے والے نہیں تھے۔ اگر بچوں کے ماننے والے ہوتے تو جب بچوں نے گر کر سجدہ کیا تھا تو اس کے سامنے گر پڑتے جن کے سامنے ان کا خدا گر پڑا۔ کہتے کہ یہ کون بچہ پیدا ہوا کہ جس کی ولادت سے یہ بت سجدے میں گر گئے۔ تو ہمارے خداؤں نے جس کی عظمت مان لی ہم کو اس کی عظمت ماننا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ ابوطالب کے گھر جاتے اور کہتے ذرا اس بچے کی زیارت کرو، جس کی ہمارے خدا نے جھک کے تعظیم کی ہے۔ کعبہ میں آئے اور بچوں کو سیدھا کر کے رکھ دیا۔ تم گر جاؤ، ہم نہ گریں گے۔

اب اس جذبے کا تجزیہ کرنا چاہ رہا ہوں آپ کے سامنے۔ فرض کیجئے، میں کراچی آیا اور آپ کو میں نے بزرگ تسلیم کیا۔ آپ کے سامنے جھک جھک کے سلام کر رہا ہوں، آپ کا احترام کر رہا ہوں۔ لب مجمع میں کوئی آیا۔ آپ اس کی تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ تو میں نے کہا، میں تو اس کی تعظیم نہیں کروں گا۔ تو کہا پھر آپ میری کیا تعظیم کر رہے ہیں۔ ارے آپ جب مجھے مانتے ہیں تو جسے میں مانوں اسے مانئے۔ میں نے کہا، آپ کو مانوں گا، آپ جسے مانیں گے اسے نہیں مانوں گا۔ تو یہ جذبہ کب ہو گا کہ جب آنے والے سے میری مخالفت ہو اور اگر مخالفت نہیں ہے تو جب آپ کھڑے ہو گئے تو میں بھی کھڑا ہوا۔ کون صاحب ہیں؟ تو کہا یہ ہمارے بھی والد ہیں۔ آداب عرض۔ جب بیٹے کی تعظیم کر رہا ہوں تو باپ کی کیوں نہ کروں گا۔ یہ ہے نچل بات کہ نہیں؟ بت کر گئے اور یہ نہیں کرتے۔ اور بچوں کو سیدھا کر کے رکھ دیا اور پھر انہی کی پرستش کرنے لگے۔ یہ کیا بات ہے۔ صلوٰۃ

دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک کسی کو ماننا، کسی کا احترام کرنا، کسی کی عظمت کرنا۔ اور ایک کسی کی مخالفت کرنا اور کسی کی مخالفت میں کسی کو ماننا۔ اس کو بہت سادہ طریقے سے بچوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ جب آدمی الیکشن میں کھڑا ہوا ہے۔ کوئی انجمن کا الیکشن ہو، ادارے کا الیکشن ہو، ٹرسٹ کا الیکشن ہو، کونسل کا الیکشن ہو، پارلیمنٹ کا ہو، بلدیہ کا ہو، کہیں کا بھی ہو، تو آپ نے دیکھا ہو گا۔ میں کھڑا ہوا الیکشن میں۔ مجھے ووٹ دیجئے، مجھے ووٹ دیجئے، یہ میرا منشور ہے۔ میں جاؤں گا تو یہ کروں گا، وہ کروں گا۔ میں ووٹ مانگوں گا منشور لے کے۔ اکثر آپ نے دیکھا ہے کہ ایک امیدوار کھڑا ہے۔ بھی آپ کیوں کھڑے ہیں؟ آپ کا منشور کیا ہے؟ کہا کچھ نہیں۔ آپ کیا کریں گے؟ کہا ہم جیتیں گے

سے محبت نہیں ہے تو اجرت نہیں دے گا۔ آپ یہ مت سمجھئے کہ ”محبت اہل بیت“ اجر رسالت ہے۔ تو یہ امتحان ”محبت اہل بیت“ ہے۔ یہ امتحان محبت رسول ہے۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرے رسول کے چاہنے والے کتنے ہیں؟ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرے رسول سے محبت رکھنے والے کتنے ہیں؟ جب یہ چاہتا ہے تو اس نے معیار بنایا اہل بیت کی محبت کو۔ آپ یہ یقین رکھیں جو بات میں کہہ رہا ہوں اسے یاد رکھیں اور جس فرقے اور جس مسلک کے مسلمان کے سامنے پیش کریں کہ اللہ جن کی محبت کو اجر رسالت میں مانگے گا، اگر ان میں کوئی بھی نقص ہوگا، کوئی بھی غامی ہوگی، کوئی بھی کمی ہوگی، یا ان کی محبت دین سے ہٹا دینے والی ہوگی، مذہب سے جدا کر دینے والی ہوگی یا عظمت الہی میں کمی لانے والی ہوگی، یا رسول سے دوری اختیار کرنے والی ہوگی، تو اللہ ایسوں کی محبت کو کبھی اجرت میں نہ مانگے گا جو دین سے ہٹا دے۔ بھئی خدا پر تو بھروسہ ہے، ہمارا کیا سوال ہے۔ خدا ایسوں کی محبت مانگے گا کہ جن کی محبت خدا پر یقین میں اضافہ کرے، کہ جن کی محبت اللہ کی اطاعت میں اضافہ کرے، کہ جن کی محبت دین کے سمجھنے میں مدد کرے، کہ جن کی محبت رسالت کی عظمت میں اضافہ کرے۔

چنانچہ آج چودہ سو برس کے بعد اندازہ کر لیں کہ جو لوگ اہل بیت سے محبت رکھتے تھے، جو لوگ اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں، انہیں کے یہاں اسلام کا تصور صحیح ہے اور جنہیں اہل بیت سے محبت نہیں ہے، وہ اظہارِ عداوت رسول تک کر بیٹھے ہیں۔ آج آپ دیکھیں، یہ کل کی بات تھی، جب یہ بات بحث میں تھی کہ علی کون ہیں؟ یہ کل کی بات تھی، جب یہ بات بحث میں تھی کہ حسن کون تھے؟ کیا تھے؟ یہ بات کل کی تھی کہ جب بحث تھی کہ حسین کون تھے؟ کیا تھے؟ آج تو مسلمانوں کے درمیان یہ بھی بحث ہے کہ محمد کیا تھے؟ آج کھلی ہوئی بحث ہو رہی ہے کہ نہیں ہو رہی؟ مجھے پاکستان کی خبر نہیں ہے، مگر ہمارے یہاں ہندوستان میں تو باقاعدہ مسلمانوں کے دو حصے ہیں رسول اللہ کے سلسلے میں۔ ایک انہیں بشر محض سمجھتا ہے، سادہ سا آدمی سمجھتا ہے۔ ایک انہیں نورانی سمجھتا ہے۔ ایک ان سے خطا کا قائل ہے۔ ایک ان کی عصمت کا قائل ہے۔ ایک ان کی موت کا قائل ہے۔ ایک ان کی حیات بعد از موت کا قائل ہے۔ کتنا سوچ کا فرق ہے پیغمبر کی زندگی کے سلسلے میں! کوئی سمجھتا ہے جب سے پیدا ہوئے، جب تک وفات ہوئی،

مرمت کئی، انہوں نے پھر آگ روشن کر دی، انہوں نے ”سادہ“ میں پھر سے نہر کھود کے پانی جاری کر دیا، انہوں نے بت اٹھا کے سیدھے کر دیئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جستجو نہیں تھی تلاش حق کی، بلکہ حق کی مخالفت کا جذبہ تھا۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیے کہ اتنی واضح نشانیاں ہونے پر بھی جنہوں نے اللہ کے دین کو تسلیم نہیں کیا، ان کی بات کو اگر آپ اہمیت دیں گے تو کیا مسلمان رہ جائیں گے؟ آپ تو مسلمان جیہی رہیں گے کہ جو لوگ حق کے موافق ہوئے، ان کا ساتھ دیں اور جو حق کی مخالفت میں جے رہے، ان کا ساتھ نہ دیں۔ اب آگے بڑھیے وہی لوگ جو ”سادہ“ کے پانی کی پرستش کر رہے تھے، وہی لوگ جو آتش کدہ فارس میں آگ کو پوج رہے تھے، وہی لوگ جو قیصر کسری کے قدموں پر اپنا سر رکھ رہے تھے، وہی لوگ جو خانہ کعبہ کے جوں کو پوج رہے تھے، وہی ایک دن الشہد ان لا الہ الا اللہ الشہد ان محمد رسول اللہ پڑھ رہے تھے۔ صلوٰۃ

وہی کلمہ پڑھ رہے تھے۔ اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ اس میں جتنے کلمہ پڑھنے والے ہیں، سب تبلیغ سے متاثر ہیں یا حالات سے متاثر ہیں۔ دو باتوں میں غور کریں۔ دل سے یقین کر کے کلمہ پڑھنا اور ہے اور حالات سے متاثر ہونا اور ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ جو آتش کدہ فارس میں آگ کی پوجا کر رہے تھے، وہ بھی کلمہ گو ہیں۔ جو سادہ کے پانی کو پوج رہے۔ وہ بھی کلمہ گو ہیں۔ جو بتوں کی پرستش کر رہے تھے، وہ بھی کلمہ گو ہیں۔ جو دریا کو پوج رہے تھے، وہ بھی کلمہ گو ہیں۔ جو ستاروں کی پرستش کر رہے تھے، وہ بھی کلمہ گو ہیں۔ لیکن ابھی کلمہ گویوں میں اللہ کے دین سے مخلص کتنے ہیں، اس کا معیار کیا ہے، اس کو جانچا کیسے جائے، اس کو پہچانا کیسے جائے اور ان کو دین کا مخلص برقرار رکھا کیسے جائے؟ اسی لیے یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اللہ نے چاہا کہ اس پہچان کے لیے کہ واقعی مسلمان کون ہے، سچا مسلمان کون ہے، دل سے مسلمان کون ہے، نبی کی اجرت مانگ لی کہ جو اجرت دیدے گا وہ مخلص ہے، اور جو اجرت نہ دے گا وہ مخلص نہیں ہے۔

تو ”محبت اہل بیت“ اہل بیت پر احسان نہیں ہے، اپنے دین کی سچائی کی دلیل ہے کیونکہ بظاہر ”محبت اہل بیت“ اجرت میں مانگی ہے، درحقیقت امتحان لیا ہے نبی کی محبت کا۔ یعنی اگر مسلمان کو رسول سے محبت ہے تو ان کی اجرت دے گا اور اگر رسول اللہ

کر سکے۔ اب آپ بتائیے کہ اگر نمرود کو ابراہیمؑ خدا مان لیتے، اگر فرعون کو موسیٰؑ خدا مان لیتے تو آج ساری دنیا کہتی کیا فرعون خدا نہیں تھا؟ ارے اللہ کے نبی نے مان لیا۔ اب آپ کا کیا منہ ہے بحث کرنے کا۔ کما نمرود خدا نہیں تھا۔ ارے ابراہیمؑ نے مان لیا، اب آپ کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ نمرود خدا نہیں تھا۔ ابراہیمؑ نے تو اللہ مانا، آپ ابراہیمؑ سے زیادہ جانتے ہیں۔ مگر آگ میں کود پڑے، اللہ نہیں کہا۔ اسی وجہ سے آج آپ کہتے ہیں کہ وہ جھوٹا خدا بنا تھا۔ اگر ابراہیمؑ مان لیتے نمرود کو خدا، تو وہ جھوٹا نہ ہوتا، تاریخ میں خدا ہوتا۔ اگر جناب موسیٰؑ فرعون کو خدا مان لیتے تو وہ جھوٹا خدا نہ لکھا جاتا، خدا لکھا جاتا۔ اور دلیل یہ دی جاتی کہ موسیٰؑ نے مانا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہمیت نمرود کو نہیں ہے، اہمیت فرعون کو نہیں ہے، اہمیت ابراہیمؑ کو ہے، اہمیت موسیٰؑ کو ہے۔ انکار موسیٰؑ نے بتایا کہ فرعون خدا نہ تھا، انکار ابراہیمؑ نے بتایا کہ نمرود خدا نہیں۔ بس جیسے موسیٰؑ کے انکار نے آپ کو سمجھایا کہ فرعون خدا نہ تھا، جیسے ابراہیمؑ کے انکار نے آپ کو سمجھایا کہ نمرود خدا نہ تھا، ویسے ہی حسینؑ کے انکار نے سمجھایا کہ یزید (لعین) خلیفۃ المسلمین نہ تھا۔ صلوٰۃ

یعنی اگر آج کسی کے دل میں فرعون کی محبت ہوگی، تو کیا وہ مسلمان ہو سکے گا؟ اگر آج کسی کے دل میں نمرود کی محبت ہوگی، تو کیا وہ مسلمان ہو سکے گا؟ نہیں ہوگا۔ محبت فرعون اور محبت نمرود، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے کردار کی شقیں نکالے گی۔ لیکن یہ ان کی محبت ہے جس نے سمجھا دیا۔ اب جب نبیؐ آخر آگیا اور اس کے دین میں فرعون اور نمرود ہونے لگے تو کون سمجھائے۔ اس لیے اللہ نے کچھ بندوں کا سلسلہ رکھا کہ ان کی محبت کو اجر رسالت بناتا ہوں، اگر ان سے محبت ہے تو میرے دشمنوں کو پہچانتے رہو گے اور اگر ان سے محبت نہیں رہے گی تو میرے دشمنوں کو نہیں پہچانو گے؟ تو اہل بیتؑ کی محبت اس لیے واجب قرار دی گئی تاکہ ہم دائرہ دین میں باقی رہیں۔ حسینؑ کی محبت اس لیے اہمیت رکھتی ہے کہ ہم مسلمان رہیں۔ اگر آج حسینؑ کی محبت نہ ہوتی تو یہ محرم نہ ہوتا، یہ عزاداری نہ ہوتی، یہ ماتم نہ ہوتا، یہ مجلسیں نہ ہوتیں، یہ حسینؑ کی آواز نہ گونجتی۔ جو محبت کرنے والے ہیں وہ اپنے محبوب کے کوچے کی طرف جاتے ہیں۔ یہ محرم اس پہچان کے لیے آتا ہے کہ کون اہل بیتؑ کا چاہنے والا ہے، کون اہل

جب بھی رسولؐ تھے اور آج بھی رسولؐ ہیں۔ اور کوئی کہتا ہے مر گئے، مر گئے تو مر گئے۔ اب ہم سے کیا مطلب ہے۔ ڈاکا تھے، ڈاک پہنچائی، چلے گئے۔ تو اب یہ جو رسولؐ کے لیے بحث ہو رہی ہے یعنی یہ سیلاب جو رسولؐ کی شخصیت تک پہنچا ہے، جب اس نے اہل بیتؑ کا بند توڑ لیا ہے، تب پہنچا ہے۔ لیکن جہاں دلوں میں اہل بیتؑ کا بند روکے ہوئے ہے، یہ سیلاب نبیؐ تک نہیں جاتا، اہل بیتؑ کے دروازے سے لوٹ جاتا ہے۔ صلوٰۃ

جن کو اللہ سے دشمنی تھی اور خدا کو نہ ماننے کے لیے کبھی فرعون کو خدا کہتے تھے، کبھی نمرود کو خدا کہتے تھے، کبھی شدار کو خدا کہتے تھے۔ میرا ایک سادہ سا سوال ہے۔ کیا آپ ثابت کر سکیں گے کہ فرعون خود بھی سمجھتا تھا کہ میں خدا ہوں؟ کیا آپ مجھ پر ثابت کر سکیں گے کہ نمرود خود بھی سمجھتا تھا کہ میں خدا ہوں؟ کیا شدار خود بھی اپنے کو خدا سمجھتا تھا؟ بچوں کا ذکر ہی کیا کروں، پتھر کا ذکر ہی کیا کروں، کیا فرعون اپنے کو خدا جانتا تھا؟ اگر فرعون اپنے کو خدا جانتا ہوتا تو بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل نہ کراتا۔ بھی جب خدا تھا تو موسیٰؑ کو پیدا ہی نہ ہونے دیتا۔ دوسرے بچوں کو قتل کیوں کرا رہا تھا؟ بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنا دلیل ہے کہ وہ جانتا تھا کہ میں خدا نہیں ہوں۔ کیا نمرود اپنے کو خدا سمجھتا تھا؟ اگر نمرود واقعی اپنے کو خدا سمجھتا ہوتا تو ابراہیمؑ کو آگ میں نہ پھینکتا۔ ملک الموت کو حکم دیتا کہ ان کی روح قبض کرلو۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ میں خدا نہیں ہوں۔ میری حکومت ملک الموت پر نہیں ہے۔ اللہ ہی نے آگ جلانے کا ذریعہ بنایا ہے لہذا ان کو جلا کے ختم کر دو۔ کیا شدار جانتا تھا کہ میں خدا ہوں؟ اگر جانتا تو جنت کو دیکھ لیتا۔ تو سب جانتے تھے کہ ہم خدا نہیں ہیں۔ پھر اپنے کو خدا کیوں کہلاتے تھے؟ یہ انبیاء ماسبق کی کامیابی تھی۔ یہ جو پیغمبر فرعون سے پہلے آئے تھے وہ اتنے کامیاب تھے اپنے مشن میں کہ انہوں نے ایک ایک انسان کو یہ بتا دیا تھا کہ حاکم اللہ ہے۔ حکومت کرنے کا حق اللہ کو ہے۔

اب جب انسانوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس بندے کو اللہ کی اطاعت کرنا چاہیے، تو جسے حکومت کرنا تھی اس نے کہا ہم بھی تو ہیں اللہ۔ جانتا ہے کہ ہم اللہ نہیں ہیں۔ اللہ بنا، حکومت کرنے کے لیے۔ فرعون جانتا تھا کہ ہم خدا نہیں، نمرود جانتا تھا کہ ہم خدا نہیں، شدار جانتا تھا کہ ہم خدا نہیں۔ خدا تو اس لیے کہلایا کہ ہم پر حکومت

فرمائش نہیں کی، خود جس کے غم میں آپ رونے کو جمع ہوتے ہیں، اس نے اپنی دوستی کی علامت بتایا ہے رونا۔ ”نہ سنے گا میرا دوست میرا ذکر، مگر یہ کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔“ کیوں؟ ”اس لیے کہ مجھے رلا رلا کے قتل کیا گیا۔“

رونا دلیل محبت ہے۔ کیونکہ رونا دلیل محبت ہے اس لیے رونا بہترین اجر رسالت ہے۔ یہ جو ہم حسینؑ پر روتے ہیں، تو حسینؑ پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ اپنے روزے نماز کو جائز بنانے کے لیے ادائے اجر رسالت کرتے ہیں۔ اور اس سے بہتر طریقہ عبادت نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے اجتماعات کو آپ دیکھ لیں۔ اجتماعات میں آپ کو یکساں دلچسپی نہیں ملے گی۔ ایسے پروگرام دنیا میں ہوتے ہیں، جس میں نوجوانوں کو دلچسپی ہے تو ضعیفوں کو نہیں ہے۔ جاہلوں کو ہے تو عالموں کو نہیں ہے۔ غریبوں کو ہے تو دولت مندوں کو نہیں۔ ہندوستانیوں کو ہے تو پاکستانیوں کو نہیں ہے۔ لیکن یہ غم حسینؑ وہ ہے جو برابر کی دلچسپی رکھتا ہے۔ بچے کے لیے بھی، جوان کے لیے بھی، بزرگ کے لیے بھی، پاکستانی کے لیے بھی، ہندوستانی کے لیے بھی۔ ہر وہ شخص جو دل بشریت رکھتا ہے، وہ حسینؑ سے وابستہ ہے۔ اس لیے کائنات میں ایسے اجتماع نہیں دیکھنے میں آتے کہ جہاں وہ ضعیف بیٹھے ہوئے ہیں جن کی کمر جھکی ہوئی ہے۔ وہاں وہ جوان بھی ہیں جن کا سن کھیلنے کودنے کا ہے۔ وہاں بچے بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ سب ادب سے بیٹھے ہیں، سب قاعدے سے بیٹھے ہیں۔ سب جو کچھ خود سے خود نصیحت کا مضمون سنایا جا رہا ہے، اسے توجہ کے ساتھ سن رہے ہیں اور اس وقت یہی طے کر رہے ہیں کہ اب کل سے گناہ نہیں کریں گے، کل سے غلطی نہیں کریں گے، کل سے حسینؑ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے۔ کم سے کم ایک گھنٹہ یہ فکر تو رہتی ہے کہ صحیح اسلام جان رہے ہیں، ہم حقیقت اسلام سے واقف ہو رہے ہیں۔ اسی لیے کہا ہے کہ حسینؑ کے غم میں روتے رہنا۔ ایک بار نہیں کہا، بلکہ انعام میں جنت دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ کبھی فرمایا ہے ”جو کوئی میرے فرزند حسینؑ کے غم میں روئے گا، روز محشر میں اس کی شفاعت کروں گا۔“ اب یہ جو ہمارا تعلق ہے، یہ انتہائی عقیدت اور محبت کی دلیل ہے۔

لوگ کہتے ہیں، یہ نذر کیا ہے؟ یہ نیاز کیا ہے؟ یہ تعزیر اور علم کیا ہے؟ یہ کچھ اکیا ہے؟ یہ ثمرت کیا ہے؟ تو دیکھیے، یہ آپ دین نہیں پوچھ رہے، آپ شریعت نہیں پوچھ

بیت کا چاہنے والا نہیں ہے۔ جس مسلمان کو بھی اہل بیتؑ سے محبت ہے، وہ پوچھتا ہے، مجلس کہاں ہے، ذکر کہاں ہوگا، گریہ و ماتم کہاں ہوگا، یاد حسینؑ کہاں منائی جائے گی۔ دس کام چھوڑ کر چلا آتا ہے۔ اس محبت کا قائدہ کیا ہے؟ جب غم حسینؑ منانے کے لیے آتا ہے، تو آکے سال بھر کی جو گرد ذہن پر جم جاتی ہے، وہ ان آنسوؤں سے دھل کر صاف آئینہ ہو جاتی ہے۔ آج آپ دیکھیں کہ آپ کی سائنس یہ کہتی ہے کہ انسان کے لیے گریہ انتہائی ضروری ہے، رونا انتہائی ضروری ہے، اگر انسان روئے گا نہیں، اگر انسان گریہ نہیں کرے گا تو اس کا قلب سخت ہو جائے گا اور اس کا دماغ مصل ہو جائے گا۔ لہذا یہ لازمی چیز ہے کہ ایک انسان سال میں کم سے کم کچھ دن رو ضرور لیا کرے۔ یعنی خالی Summaries نہ پڑھا کرے، Tragedy بھی پڑھا کرے۔

ان کا تجزیہ یہ ہے کہ آپ کوئی ٹریجڈی پڑھ لیں تاکہ آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل جائیں۔ یعنی غم بھائے قلب کے لیے، سچائے قلب کے لیے اور جلاء ذہن کے لیے ضروری ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ دنیا کی کوئی ٹریجڈی ایسی نہیں ہے جسے دو تین بار آدمی پڑے اور آنکھ سے آنسو نکل آئے۔ ہمیشہ ٹریجڈی بدل بدل کے پڑھنا پڑے گی۔ کیوں؟ اس لیے کہ کائنات کی کوئی ٹریجڈی ایسی نہیں ہے کہ جسے جب پڑھو تو آنکھ سے آنسو نکل آئے۔ ٹریجڈی کا اثر قلب پر ہوتا ہے، لیکن کیا بات ہے کہ چودہ سو برس گزر گئے ہیں اس ٹریجڈی کو سنتے ہوئے اور کثرت سے سنتے ہوئے، کثرت سے پڑھتے ہوئے۔ اور ایک زبان میں نہیں، دنیا کی کوئی ٹریجڈی ایسی نہیں ہے کہ جس کا اتنی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہو جتنی زبانوں میں واقعہ کرلا کا ترجمہ ہوا ہے۔ لیکن آج تک یہ عالم ہے کہ جب بھی انسان پڑھتا ہے، رو ضرور دیتا ہے۔ یعنی یہ وہ دوائے سچائے قلب ہے اور یہ وہ دوائے جلاء ذہن ہے کہ جس سے انسان، انسانیت کے قریب آ جاتا ہے۔ ذہن کی گرد بھی صاف ہو جاتی ہے، دل کا غبار بھی کم ہو جاتا ہے، مگر جو حسینؑ پر رونا جائز ہی نہیں سمجھتے، ان کے دل کا غبار جائے کیسے؟ ان کے ذہن سے گرد دھلے کیسے؟ یہ گریہ کیا ہے؟ یہ اسلام سے الگ نہیں ہے، یہ جزو اسلام ہے، بنائے اسلام ہے، سبب اسلام ہے، بھائے اسلام ہے۔ جہی تو فرمائش ہے، کبھی رسول اللہؐ فرمائش کرتے ہیں گریہ کے لیے، رونے کے لیے۔ کبھی مولائے کائنات فرمائش کرتے ہیں، کبھی حسینؑ فرمائش کرتے ہیں۔ کس نے

کیا خدا کہے میں آکے رہے گا؟ کسی رات میں اللہ سویا کہے میں؟ یا ملنے کے لیے ابراہیم سے آیا۔ اے ابراہیم تم نے مجھے یہ گھر بنا کے دیا، بڑا آرام دہ ہے، آدھا گھنٹہ ہم لیٹیں گے۔ آپ کہیں گے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اللہ گھر میں رہے گا، اللہ مکان میں رہے گا۔ تو پھر یہ ابراہیم نے کیوں مکان بنایا؟ اور اگر بنایا بھی تھا تو اس نے کیوں قبول کیا؟ کتنا ابراہیم ہوش کی دوا کرو، میں خدا ہوں، میرے جسم و جسمانیات نہیں، میں تو ہر جگہ ہوں۔ یہ چار دیواری میں مجھے کیوں گھیر رہے ہو؟ میں تو سب کا خدا ہوں، میں تو سب کا اللہ ہوں، میں نے تو سب کو پیدا کیا ہے، میرے ماننے والے تو سب ہیں۔ یہ گھر کیوں بنایا؟ لیکن قرآن میں کتا ہے کہ "ابراہیم نے میرے لیے گھر بنایا اور میں نے اس گھر کو قبول کیا۔"

اب وہ کس کا گھر ہے، کعبہ کس کا گھر ہے؟ اب مسلمانوں تمہیں کعبہ کی قسم ہے، ایمان ایمان کی کتنا۔ بنایا ابراہیم واسمعیل نے، اینٹیں اٹھائیں اسمعیل نے، رکھیں ابراہیم نے، کہاں گئے؟ اللہ کے گھر۔ کہاں گئے تھے؟ بیت اللہ کی زیارت کو۔ ارے اللہ نے کب بنایا، اللہ کب رہا۔ کہا آپ سمجھے نہیں، بنایا تو ابراہیم نے اور گارے اور چوڑے سے بنایا، مٹی اور اینٹوں سے بنایا۔ مگر کیونکہ اس کے لیے بنایا۔ تو جسے رہنے کی ضرورت نہیں کیوں بنایا؟ قرآن سے سمجھا دیجئے، حدیث سے سمجھا دیجئے۔ ہم چلے جگہ کرنے۔ پہلے سمجھا دیجئے توجہ کریں گے۔ لوگ کہتے ہیں نا، ہمیں سمجھا دیجئے تو ہم محرم منائیں۔ ہمیں سمجھا دیجئے۔ جج کریں اور یہی باتیں جو محرم کی سمجھ میں نہیں آتیں، ہمیں جج کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ کیوں؟ ارے توبہ وہ تو اللہ کا گھر ہے۔ کہاں کا اللہ کا گھر۔ کیوں آپ اللہ کو تمہمت رکھ رہے ہیں۔ خدا کہیں محدود ہے۔ کہا بھی جہالت کی باتیں نہ کیجئے، علم کی بات سمجھائیے۔ کہا ابراہیم نے محبت سے بنا کے پیش کیا۔ اللہ نے قبول کیوں کیا؟ کہا محبت میں بنایا۔ تو اگر خدا ابراہیم سے محبت میں گھر لے لے، جبکہ اسے لیٹنا بیٹھنا سونا نہیں ہے۔ تو اگر شدائے کرلا ہمارے کھانا پکا کے نذر کرنے سے اسے قبول کر لیں تو انہیں کھانا نہیں ہے، انہیں پینا نہیں ہے۔ اللہ نے ابراہیم کی محبت کو دیکھا، کرلا والوں نے مسلمانوں کی محبت کو دیکھا۔ انہوں نے کہا گھر ہمارا ہے۔ حسین نے کہا یہ نذر کا کھانا ہمارا ہے۔ اب دلیل کیا ہے حسین کا ہو جاتا ہے، شدائے کرلا کا ہو جاتا ہے؟ دلیل یہ

رہے۔ لوگ کہتے ہیں قرآن میں دکھائیے، کچھوا کہاں لکھا ہوا ہے؟ قرآن میں دکھائیے شربت کہاں لکھا ہوا ہے؟ قرآن میں دکھائیے یہ جو نیاز بنتی ہے، یہ کہاں لکھا ہوا ہے؟ اور کیا حسین کی قربانی اسی لیے تھی کہ آپ شربت پئیں؟ کیا حسین کی قربانی اسی لیے تھی کہ آپ کچھوا کھائیں؟ کیا حسین کی قربانی اسی لیے تھی کہ اچھا اچھا تھک اور نیاز بانٹیں مجلس میں اور لوگ کھائیں؟ کیا اس لیے حسین نے جان دی؟ اور کیا یہ جو آپ نذر و نیاز کرتے ہیں وہ حسین اور کرلا والے کھاتے ہیں؟ لوگ بحث کرتے ہیں۔ یہ جو آپ نے کچھوا پکا کے نذر دیا تو کیا حسین اور کرلا والوں نے کھایا؟ نام ان کا لے رہے ہیں، خود کھا لیا۔ یہ شیرمال اور کباب؟ آپ نے کہا حاضری ہے جناب عباس کی۔ تو کیا جناب عباس نے کھایا۔ نام ان کا لیا اور خود کھا لیا۔ وہ کیا محتاج ہیں کچھوے کے؟ وہ کیا محتاج ہیں کباب اور شیرمال کے؟ کیا وہ محتاج ہیں بریانی کے؟ کیا وہ محتاج ہیں شربت کے؟ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے سوال آپ کر رہے ہیں، جنہوں نے کیا نہیں۔ یہ بھی غور کی بات ہے۔ آپ کرتے ہوں اور پریشانی ہو تو ایک الگ بات ہے۔ ہم کرتے ہیں، ہم سے پوچھنے۔ تو کہا حسین تو کھاتے نہیں۔ اچھا یہ بات بڑی منطقی سمجھ میں آئی کہ جس چیز کو کوئی استعمال نہ کرے اس کو اس کے نام پر دینے سے کیا فائدہ۔

یعنی اگر آپ کسی قبلہ و کعبہ اور عالم دین کو ایک "کیپ" (ٹوپی) لاکے دیں، جناب یہ ہم آپ کے لیے لائے ہیں، تو سب نہیں گے۔ بھی جناب عمامہ پہنتے ہیں، پھر "کیپ" کا کیا کریں گے۔ ایسا تحفہ دینے سے فائدہ جو ان کے کام نہ آئے۔ آپ نے کسی پیش نماز کو بیڑ کی بوتل لاکے دی، یہ ہم آپ کے لیے لائے ہیں۔ تو بگڑ جائے گا۔ میں کیا بیڑ پیتا ہوں، جو آپ میرے لیے لائے ہیں۔ آپ کا دماغ صحیح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تحفہ وہ دینا چاہیے۔ جو قبول ہو۔ تو لہذا آپ کی بات ٹھیک ہے۔ کیا حسین بریانی کھاتے ہیں؟ کیا کرلا والے شربت پیتے ہیں؟ تو ایسی چیز دو جس کو وہ استعمال کریں۔ ہے نا یہی بات؟ تو آپ نے اسلام سمجھ لیا ہے، ٹھیک سمجھ لیا ہے۔ کہا ہم نے خوب سمجھ لیا ہے۔ یہ جناب ابراہیم نے جو مکان بنا کے اللہ کو دیا، جس کی طرف سب سر جھکاتے۔ بلنے اپنے دادا ابراہیم سے کہیں، آپ نبی ہیں، آپ اللہ کے رسول ہیں، ذرا ہوش کی باتیں کیجئے۔ آپ گھر بنا رہے ہیں خدا کے لیے، کیا خدا محتاج ہے گھر کا؟ کیا خدا کو مکان چاہیے ہے؟

قرب نہیں جاتا۔ کیوں نہیں جاتا؟ یہ تو الٰہی انتظام مجھے محسوس ہوتا ہے۔ اب وہاں پر آپ دیکھیں، آپ مسلمان ہیں۔ مسلمان کو کلمہ پڑھ کے کیا کرنا ہے؟ چکر لگاؤ، سات چکر لگاؤ اور جب حجر اسود کے سامنے پہنچو تو سلام کرو۔ پھر کو سلام کرا رہا ہے، یہ پتھر کیا ہے؟ کہا یہ حجر اسود ہے۔ ارے کوڑوں پتھر تو نے پیدا کیے۔ حجر اسود کو سلام کیوں، تعظیم کیوں؟ کما کعبہ کی دیوار میں نصب ہے۔ کیا خصوصیت ہے؟ تو کہا جاتا ہے کہ یہ پتھر وہ ہے جس نے رسول کی رسالت کی گواہی دی۔ ارے اگر پتھر بھی گواہی دے تو قابل احترام ہو جائے۔ تو جس پتھر نے گواہی دی وہ کعبہ کی دیوار میں لگا۔ جو اصلی گواہ تھا وہ کعبہ میں پیدا ہوا۔ تو اگر پتھر لگا ہے تو قابل احترام ہے اور اگر کوئی کعبہ میں پیدا ہوا ہے تو کیا لائق بحث ہے؟ جی نہیں، قابل احترام ہے۔ صلوٰۃ

اس لیے قابل احترام ہے کہ نسبت کس کی طرف ہے، یعنی اسلام میں عظمت نسبت سے ہوتی ہے۔ یہ مسجد کیا ہے؟ ایک ہال اور مسجد میں کیا فرق ہے؟ مسجد کے اپنے احکام ہیں۔ جو اللہ کے نام پر بتا دیا، محترم ہو گیا۔ گھر اور امام بارگاہ میں کیا فرق ہے؟ صرف اتنا فرق ہے کہ وہ حسین کے نام منسوب کر دیا۔ کعبہ چار دیواری ہے مگر محترم اس لیے ہے کہ اللہ کی طرف منسوب ہے۔ یہ عزا خانہ ہے مگر محترم اس لیے کہ حسین کی طرف منسوب ہے۔ تو اللہ کعبہ میں رہتا نہیں مگر کتا ہے کہ میرے گھر کی دیوار کے پاس اگر کوئی دعا کرے تو میں رد نہیں کرتا۔ حسین امام باڑوں میں رہتے نہیں مگر چونکہ ان کے لیے بنایا گیا ہے لہذا انہوں نے یہ تاثیر دیدی ہے کہ یہاں آکے مانگو گے تو میں تمہیں ضرور عطا کروں گا تاکہ تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ جیسے اللہ نے کعبہ کو قبول کر لیا ہم نے ضریح خانوں کو قبول کر لیا۔ ہم نے عزا خانوں کو قبول کر لیا۔ اب وہاں کعبہ میں ایک طرف تو حجر اسود لگا ہوا ہے، ایک طرف سونے کا دروازہ لگا ہوا ہے، چاروں طرف کعبہ پر پردہ پڑا ہوا ہے، ایک طرف رکن یمانی ہے، ایک طرف مقام ابراہیم ہے۔ ہر جگہ کی عبادت ہے۔ یہ کیا بات ہے؟ کہا یہ نشانیاں ہیں ان کی جنہوں نے ہم تک اسلام پہنچایا ہے۔ یہاں بھی نشانیاں ہیں۔ یہ علم ہے، یہ نشانی ہے اس عباس کی جس نے کربلا میں اسلام کے پرچم کو بلند کیا تھا۔ یہ جھولا ہے، یہ نشانی ہے اس شمشاہ کی جس نے کربلا میں چھ مہینے کے سن میں جان دی۔ یہ تابوت ہے، یہ شبیہ پیغمبر کی نشانی ہے۔ یہ عون و محمد کی نشانی ہے اور

ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ نہ کھانا، اسے نہ چھوٹا۔ یہ کیا ہے؟ نذر ہے۔ ہم نہیں چھوٹیں گے، ہم نہیں کھائیں گے۔ لوگوں کا نہ کھانا بتاتا ہے کہ حسین نے قبول کر لیا۔ وہی کھاتا ہے جسے محبت ہے، جسے محبت نہیں ہاتھ نہیں لگا پاتا۔ صلوٰۃ

اب جو حج پر نہیں گیا ہے۔ اس سے تو آپ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا آپ حج سے مشرف نہیں ہوئے؟ تو کہا نہیں۔ دعا کیجئے ابھی تک ہم حج سے مشرف نہیں ہوئے۔ اور جو حج کر آیا ہے اس کو لوگ مبارکباد دیتے ہیں کہ الحمد للہ آپ حج کر آئے۔ تو میں نہیں کتا آپ حج کرنے کیوں گئے تھے۔ ارے بھی حج کرنے کہاں گئے تھے۔ اس چار دیواری کے صدقے اترنے گئے تھے۔ کون سی چار دیواری؟ وہ چار دیواری جو جناب ابراہیم نے بنائی۔ اللہ نے نہیں بنائی، ابراہیم نے بنائی۔ ابراہیم نے دیوار بنا کے در بنادیا۔ کہا ”معبود تیرے لیے گھر بنایا۔“ کہا میرا گھر ہے، بیت اللہ ہے۔ سارے مسلمانوں کو حکم دیا کہ زندگی میں ایک بار جب مستطیع ہو تو آنا۔ گھر تیرا، ہم آکے کیا کریں گے؟ تو رہتا نہیں، ہم کو کیوں بلا رہا ہے؟ کہا اس لیے آنا کہ میرا گھر ہے۔ کیا یہ کراچی تیرا نہیں ہے؟ کیا لکھنؤ تیرا نہیں ہے؟ کیا ہالیوڈ کا پھاڑ تیرا نہیں ہے؟ کیا یہ سمندر تیرا نہیں ہے؟ ارے تو تو ہر چیز کا خالق ہے۔ کہا میں نے سب کچھ بنایا۔ یہ ابراہیم نے میرے لیے بنایا۔ اب کعبہ کی عظمت کیا ہے؟ کوئی خاص مصالحہ لگایا تھا، کوئی خاص مٹی تھی۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ محبت سے بنا کے کہا، تیرے لیے بنایا۔ اس نے کہا میں نے قبول کیا۔ اب جب قبول کیا تو احکام دے دیے۔ نجس نہ آنا، طہارت سے آنا، اسلام کا کلمہ پڑھ لینا، تب آنا۔ حالت کفر میں نہ آنا، حالت شرک میں نہ آنا۔

جو حج کر آئے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ کئی کلومیٹر پہلے نوٹس لکھا ہے ”غیر مسلموں کے لیے داخلہ ممنوع ہے۔“ یہ کیا مطلب ہے؟ اللہ کا گھر ہے، ابراہیم کا بنایا ہوا ہے۔ غیر مسلموں کا داخلہ بند ہے۔ ارے یہ کیا بات ہوئی؟ یہاں سے حرم شروع ہو گیا۔ تو حرم شروع ہو گیا، تو جب غیر مسلم جائے گا نہیں تو مسلمان کیسے ہو گا؟ کہا نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مسلمان ہو تو آنا نصیب ہو گا۔ معلوم یہ ہوا کہ جب کوئی چیز منسوب کرلو، ادھر منظور ہو جائے، تو منظور ہونے کی گارنٹی یہ ہوتی ہے کہ غیر کو اجازت نہیں ہوتی۔ اب یہ نذرو نیاز کی منظوری کی دلیل ہے کہ جو عقیدت نہیں رکھتا وہ اسے نہیں چھوٹا، وہ اس کے

آ رہے ہیں۔ جواب سنیں گے آپ، حسینؑ نے کیا جواب دیا؟ فرمایا علی اکبرؑ میں نہیں آ رہا ہوں، کلیجہ کھینچنے لارہا ہے۔ اسے کہتے ہیں محبت۔ محبت نے مجبور کیا، حسینؑ چلے، علی اکبرؑ نے اپنے حق کی قسم دی۔ بابا آپ واپس جائیں۔ حسینؑ در خیمہ پر واپس آئے۔ علی اکبرؑ میدان کربلا میں تشریف لائے۔ ام لیلیؑ نے حسینؑ کے چہرے پر نظریں جمادیں کہ اگر کوئی مصیبت آئے گی تو باپ کے چہرے سے اندازہ ہو جائے گا۔

لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حسینؑ کے چہرے کا رنگ بدلا۔ ام لیلیؑ نے کہا آقا میرے لال کی خیر ہے۔ حسینؑ نے کہا ام لیلیؑ بڑا زبردست اور نامی پهلوان مقابلے پر آیا ہے، اے ام لیلیؑ میرا بچہ تین دن کا بھوکا پیاسا ہے۔ ماں کی دعا بیٹے کے حق میں مستجاب ہے، جا کے دعا کرو۔ ام لیلیؑ صحن خیمہ گاہ میں آئیں۔ آواز دیتی ہیں بچوں آؤ، بیٹیوں آؤ میں اپنے لال کے لیے دعا کرتی ہوں۔ تم آئیں کہو۔ سر کے بال کھول دیئے۔ ہاتھ اٹھائے۔ ”معبود! اے اسماعیلؑ کو ہاجرہ کو پلانے والے، اے یوسفؑ کو یعقوبؑ سے ملانے والے، میرے لال کو مجھ سے ملا دے۔“

اجی دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ علی اکبرؑ کو فتح ہوئی۔ پیاس کا غلبہ ہوا۔ آئے، بابا گرانی آہنگ ستاری ہے۔ بابا پیاس مارے ڈال رہی ہے۔ کہا علی اکبرؑ اپنی زبان میرے دہن میں دے دو۔ علی اکبرؑ نے اپنی زبان دہن حسینؑ میں دی، فوراً کھینچ لی۔ کہا بابا آپ تو مجھ سے زیادہ پیاسے ہیں۔ یہ بیٹا باپ کی پیاس کا ثبوت دے رہا ہے۔ کہا جاؤ کوثر پر تمہارے دادا، تم کو سیراب کریں گے۔ بس عزاداروں علی اکبرؑ پلٹے۔ تاریخ نہیں کہتی، روایت نہیں کہتی، لیکن میرا یقین کہتا ہے کہ حسینؑ نے کہا ہوگا ”ام لیلیؑ اب دعا نہ کرنا۔“ ورنہ ام لیلیؑ دعا کرتی رہتیں، علی اکبرؑ پلٹ پلٹ کے آتے رہتے۔ کیوں میرا یقین کہتا ہے؟ اس لیے کہ علی اکبرؑ نہیں پلٹے۔ آواز آئی۔ کیا آواز آئی؟ آواز آئی بابا میرا آخری سلام قبول کیجئے۔ بھی بڑا نازک وقت ہے۔ حسینؑ صبح سے بیتیں لائے ہیں۔ حسینؑ ایک ایک کے جنازے پر گئے ہیں مگر عباسؑ ساتھ ہوتے تھے، علی اکبرؑ ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن جب کزیلؑ جو ان کا وقت آیا، حسینؑ کی بیکی، تنہا بڑھے۔ حمید کہتا ہے، میں نے دیکھا بار بار گر پڑتے تھے۔ کہتے تھے یا علیؑ یا علیؑ یا علیؑ اور جب اپنے جوان کے لاشے پر پہنچے تو خدا کسی ضعیف باپ کو اپنے کزیلؑ جو ان کا یہ منظر نہ دکھائے کہ جو ان بیٹا زمین گرم پر

علم عباسؑ کی نشانی ہے۔

بس حضورؐ، آج اٹھویں محرم ہے۔ آج کی رات اس شہزادے کا تذکرہ ہوگا جو شبیہ پیغمبرؐ ہے یعنی جناب علی اکبرؑ۔ اللہ اکبرؑ کون علی اکبرؑ؟ شبیہ پیغمبرؐ اللہ نے بتا دیا کہ دیکھو یہ مسلمان نہیں ہیں۔ اگر انہیں رسولؐ اللہ سے ذرا بھی عقیدت ہوتی تو کم سے کم شبیہ پیغمبرؐ پر حیرت نہ چلاتے، نیزے نہ چلاتے۔ کون علی اکبرؑ؟ جو بار بار کہتے تھے، بابا اب مجھے مرنے کی اجازت دے دیجئے۔ حسینؑ کہتے تھے، علی اکبرؑ ابھی نہ جاؤ، میں کیا کروں تمہیں تمہاری پھوپھی نے محنتوں سے پالا ہے۔ جناب علی اکبرؑ آئے بی بی زینبؑ کے پاس۔ کہا آپ مجھے مرنے کی اجازت دے دیجئے۔ فرمایا علی اکبرؑ میں اگر تمہیں مرنے کی اجازت دے دوں تو تمہاری ماں ام لیلیؑ تمہارے بغیر کیسے جیے گی۔ کہا یہ فرمائیے میری ماں ام لیلیؑ ہیں۔ میرے بابا کی ماں فاطمہ الزہراءؑ ہیں۔ کون افضل ہے؟ میری دادی افضل ہیں کہ میری ماں؟ جناب زینبؑ نے کہا تمہاری دادی افضل ہیں۔ کہا اب میں نہ جاؤں گا تو بابا جائیں گے۔ جناب زینبؑ چپ ہو گئیں۔ کہا علی اکبرؑ ایسی دلیل دی کہ پھوپھی کچھ کہہ نہیں سکتی ہے۔ علی اکبرؑ رخصت ہونے لگے۔ ایک عجیب عالم تھا۔

حمید لکھتا ہے کہ جب علی اکبرؑ خیمے سے نکل رہے تھے تو خیمے کا پردہ بار بار اٹھ رہا تھا، خیمے کا پردہ بار بار گر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بھرے گھر سے جنازہ نکل رہا ہے۔ علی اکبرؑ باہر تشریف لائے۔ حسینؑ نے جوان بیٹے کا بازو پکڑا، گھوڑے پر سوار کیا۔ کہا علی اکبرؑ خدا حافظ، میرے لال سدھارو، مگر جب تک سامنا رہے مڑ مڑ کے دیکھتے جانا۔ علی اکبرؑ آگے بڑھے۔ روایت کہتی ہے حسینؑ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ”معبود گواہ رہنا۔“ خدا آپ کے جوانوں کو صحیح اور سالم رکھے۔ خدا آپ کو اپنے بیٹے کی موت نہ دکھائے۔ حسینؑ اپنے جوان کا غم اٹھانے جارہے ہیں۔ ایک مرتبہ آواز دی علی اکبرؑ جب تک سامنا رہے مڑ مڑ کے دیکھتے جانا۔ خدا کو گواہ کر رہے ہیں کہ اب میں نے تیری راہ میں اسے بھیجا ہے جو صورت و سیرت میں تانا رسولؐ اللہ سے مشابہ تھا۔ جب میں تانا کو دیکھنا چاہتا تھا، علی اکبرؑ کو دیکھ لیتا تھا۔ اب میں تانا کی زیارت سے محروم ہو رہا ہوں۔ روایت کہتی ہے علی اکبرؑ نے مڑ کے دیکھا۔ کیا دیکھا کہ باپ کیلچے پر ہاتھ رکھے ہوئے آہستہ آہستہ چلا آ رہا ہے۔ ایک مرتبہ گھوڑے کو روک لیا۔ آواز دی بابا آپ کیوں

نویں مجلس

بسم الله الرحمن الرحيم

قل لا استلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی

برادران ملت!

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرما رہا ہے کہ ”میرے حبیب آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تم سے اجر رسالت کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرتے سوائے اس کے کہ جو ہمارے اقربا ہیں ان سے مودت اور محبت رکھو۔“

اس آیت کے ذیل میں ”محبت اہل بیت“ کے موضوع پر یہ مسلسل گفتگو آپ کے سامنے محفل مرتضیٰ کے مشرے میں جاری تھی۔ جس کی آج نویں مجلس ہے۔ جس میں مختلف زاویوں سے، مختلف پہلوؤں سے، اور مختلف باتوں سے، محبت کی اہمیت کہ ”محبت اہل بیت“ کیا ہے، اس کا فائدہ کیا ہے، اس کا مفاد کیا ہے؟ کیونکہ عام خیال لوگوں کے دماغ میں یہ بیٹھا ہوا ہے کہ یہ عزاداری، یہ ماتم، یہ محرم منانے والے، یہ فضائل اہل بیت پر خوش ہونے والے اور یہ مصیبت اہل بیت پر رونے والے، برائے محبت اور عقیدت ایسا کرتے ہیں۔ جبکہ اس کی اسلامی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تو مختلف پہلوؤں سے آپ کے سامنے میں نے عرض کیا کہ محبت کو اجر رسالت کے طور پر مانگا گیا ہے۔ ایسا

ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔

آج یہ نوجوان جو عزاداری میں پیش پیش رہتے ہیں، یہ جو سرودینہ کوٹتے ہیں، یہ جو زنجیرو قما کا ماتم کرتے ہیں، انہیں علی اکبرؑ کی جوانی تریا دیتی ہے، انہیں علی اکبرؑ کی جوانی رلا دیتی ہے۔ حسینؑ گئے، سراٹھا کے زانو پر رکھا، علی اکبرؑ تم نے پکارا تھا، باپ آگیا۔ آنکھیں کھولیں، باپ کو دیکھا۔ کہا بیٹا یہ کیجے پر ہاتھ کیوں رکھے ہو؟ کیا اذیت ہے؟ ایک مرتبہ علی اکبرؑ نے ہاتھ سخت کیا۔ حسینؑ نے ہٹایا۔ کیا دیکھا کہ کیجے میں برچھی کا پھل ٹوٹا ہے۔ بڑا عجیب وقت تھا۔ لکھا ہے کہ حسینؑ دوزانو بیٹھے، آسمان کی طرف دیکھا، آواز دی، ”مجدو حسینؑ ہر امتحان کے لیے تیار ہے۔“ کہا بسم للہ و باللہ و الا ملت رسول اللہ یہ کہہ کر برچھی کا پھل کھینچا۔ خون کا فوارہ نکلا۔ علی اکبرؑ نے آخری سانس لی۔ حسینؑ نے منہ پر منہ رکھ دیا۔ چاروں طرف سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اب تھا حسینؑ ”کمر عباس“ کے غم میں ٹوٹی ہوئی، آنکھوں کا نور علی اکبرؑ لے گئے۔ حسینؑ اکیلے جنازہ کیے اٹھائیں۔ روایت میں لکھا ہے کہ بھگے، سینے پر سینہ رکھ دیا، بانہیں ڈال دیں، گھٹنا ٹیکا، کہا یا علیؑ ایک مرتبہ کہہ کے اٹھے۔ حسینؑ جنازہ لے کے چلے۔ علی اکبرؑ کے پیر زمین پر خط دے رہے تھے کہ ایک مرتبہ خیمے کا پردہ اٹھا، آواز آئی، بھیا، بھیا زینبؑ آگئی۔ جب زینبؑ کو حسینؑ نے دیکھا، علی اکبرؑ کا جنازہ خاک پر رکھ دیا۔ کہا بن واپس جاؤ۔ ابھی بھائی زندہ ہے۔ پھر حسینؑ نے جنازہ نہیں اٹھایا۔ ایک مرتبہ آواز دی بچوں آؤ، آکے اپنے بھائی کا جنازہ لے جاؤ۔ چھوٹے چھوٹے بچے خیموں سے نکلے۔ وا اکبراؑ والعلیاؑ کہتے ہوئے جنازہ خیمہ میں لے گئے۔



یہ پوری بلڈنگ بنائے گا سال بھر تک، پھر بھی اس کے پیسے جوڑیے گا تو اتنے نہیں ہوں گے جتنا اس کی لکیریں کھینچنے کے پیسے ہیں۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ ایئر کنڈیشن روم میں بیٹھ کے، پنل کاغذ لے کے، ایک آدمی اسکیل سے ٹاپ کے نقشہ بناتا ہے، اسے آپ ہزاروں دیتے ہیں اور جو بیٹھ کے اینٹیں جوڑتا ہے، اسے آپ سینکڑوں بھی نہیں دیتے اور جو اینٹ ڈھوکے لاتا ہے اسے آپ پچاس فیصد بھی نہیں دیتے۔ یہ کون سی نا انصافی ہے؟ آپ کہیں گے نا انصافی نہیں۔ اس کو ہم نے اس کی محنت کے لحاظ سے دیا اور اس کو اس کے فن کے لحاظ سے دیا۔ تو اسلام میں بھی ایسا ہی ہے کہ نماز کی بھی جزا ہے، روزے کی بھی جزا ہے، حج کی بھی جزا ہے، ان تمام باتوں کی جزا ہے، لیکن اگر خالی لیبر ہے تو لیبر کی جزا ہے۔ اور اگر سمجھ کے نماز پڑھی ہے تو ٹیکنیکل جزا ہے۔ صلوٰۃ

ایجوکیشن لائن میں دیکھ لیجئے۔ پرائمری اسکول کے ٹیچر جتنا لیبر اور جتنا وزن ہوتا ہے، چھوٹے بچوں کو اے، بی، سی، ڈی پڑھانے میں جتنا ٹائم لگتا ہے۔ ایک پرائمری اسٹیج کے اوپر پڑھانے میں کتنا لیبر ہے، کتنی محنت ہے۔ چھوٹے چھوٹے نا سمجھ بچوں کو سمجھانا، ان کی دلچسپی باقی رکھنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ لیکن اتنی تنخواہ نہیں پاتے جتنے آٹھویں درجے کے پڑھانے والے اور آٹھویں درجے والے اتنی تنخواہ نہیں پاتے کہ جتنا ہائی اسکول کے ٹیچر اگرتا ہے۔ اور ہائی اسکول والا اتنا نہیں پاتا جتنی انٹرمیڈیٹ کو تنخواہ ملتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ والا بھی اتنا نہیں پاتا جتنا یونیورسٹی کے ٹیچر پاتے ہیں۔ ٹیچر اگرتا ہے، لیچر ہے، ریڈر ہے، پروفیسر ہے، ہیڈ آف وی ڈی پارٹمنٹ ہے، وائس چانسلر ہے۔ تنخواہوں میں فرق ہے کہ نہیں؟ ایک کانشیل کو دیکھئے۔ کتنی محنت پڑتی ہے۔ ایک سب انسپکٹر کو تو اتنی محنت پڑتی، مگر تنخواہ میں فرق ہے۔ ڈی ایس پی کو اتنی محنت نہیں ہے مگر تنخواہ زیادہ ہے۔ ایس پی کو اتنی محنت نہیں ہے مگر تنخواہ زیادہ ہے۔ یعنی جوں جوں آگے بڑھتے جاؤ، لیبر گھٹتا جاتا ہے، دام بڑھتے جاتے ہیں۔ قابلیت پر ہے۔ بس یہی معاملہ اسلام میں ہے۔ جتنی جتنی معرفت بڑھتی جاتی ہے، لیبر گھٹتا جاتا ہے، جزا بڑھتی جاتی ہے۔ صلوٰۃ

یہ تو واقعیت پر ہے اور یہ بیوپار میں بھی ہے۔ کاروباری لوگ بھی یہ دیکھتے ہیں کہ کس مال کے خریدنے میں، کس کے کاروبار کرنے میں لاگت کتنی آئے گی؟ نفع کا تناسب

نہیں ہے کہ اہل بیت کی محبت کے ہم موجد ہیں۔ یعنی ہم کو چونکہ محبت ہے لہذا ہم محبت کو سراہتے ہیں، محبت کی طرف داری کرتے ہیں، محبت کرتے ہیں۔ ارے بھی یہ محبت بھی جزو اسلام ہے، یہ حکم اسلام ہے، اللہ کا فرمان ہے، اور وہ بھی اجر رسالت کے طور پر۔ اس محبت کے مقابلے میں کسی چیز کو لانا حیرت کی بات ہے۔

اجرت کہتے ہیں اس چیز کو جو برابر ہو۔ میں نے آپ کی کوئی خدمت کی تو اس کی کوئی اجرت ہے۔ اجرت گھنٹوں سے نہیں جوڑی جاتی، اجرت کمال اور فن سے جوڑی جاتی ہے۔ ایک مزدور جو اینٹیں ڈھوتا ہے، آپ کی عمارت بنانے میں گارا ڈھوتا ہے، سینٹ اور کنکریٹ ڈھوتا ہے۔ اس کی اجرت کچھ اور ہوتی ہے اور جو اینٹوں کو جوڑتا ہے، اس کی اجرت کچھ اور ہوتی ہے۔ اور اس کی اجرت اس سے زیادہ ہے۔ حالانکہ لیبر اس کا زیادہ ہے، محنت اس کی زیادہ ہے اور اجرت اس کی زیادہ ہے۔ یہ بیٹھا ہوا اینٹوں کو جوڑا کرتا ہے اور وہ دور سے ڈھوکے، اپنے سر پر بوجھ لے کر آتا ہے۔ مگر چونکہ اس میں محنت ہے، کوئی عقل کا سوال نہیں ہے، اس لیے اس کی اجرت کم ہے۔ یہ چونکہ جوڑنا ایک فن ہے، اس کی اجرت زیادہ ہے۔ تو اجرت مزدوری پر نہیں ہوتی، فن پر ہوتی ہے۔ یعنی میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جہاں عقل کا دخل ہو وہیں دام بھی زیادہ ہوتے ہیں اور جہاں خالی ہاتھ بیروں کا دخل ہو وہاں دام زیادہ نہیں ہوتے۔ لوگ کہتے ہیں صاحب ہر مزدور دیوار نہیں بنا سکتا کیونکہ دیوار بنانے میں، دیوار بنانا ہی نہیں ہے، سیدھی بھی بنانا ہے۔ صلوٰۃ

سیدھی لائن میں بھی ہو یعنی عمودی بھی سیدھی اور چھٹی بھی سیدھی ہو۔ اگر دیوار ترجیحی ہوگئی تو پھر اوپر کی عمارت صحیح نہیں بن سکے گی۔ اس لیے دیکھتے ہیں آپ ایک ایک اینٹ کو جوڑنے والا دیکھا کرتا ہے، سیدھی ہے کہ نہیں۔ تو کم سے کم ہم عمارت بننے دیکھ کے اپنی عمارت بنالیں۔ یہ نہیں کہ دھندا من نمازیں پڑھے جارہے ہیں، روزے رکھے جارہے ہیں، حج پر حج کیے جارہے ہیں۔ کوئی سے یہ بھی نہیں دیکھتے کہ سیدھا ہے کہ ٹیڑھا ہے۔ صلوٰۃ

لیبر کو اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی ٹیکنیکل لیبر کو ہے۔ تو جو فن سے واقف ہے، اس کی اجرت ہے اور اس کو کتنے جس نے نقشہ بنایا ہے۔ جس انجینئر نے نقشہ بنایا ہے۔ ارے

پلڑے پر۔ یعنی محبت اتنی گراں ہے کہ پورا کار رسالت ایک پلڑے میں ہے، اہل بیت کی محبت ایک پلڑے میں ہے۔ تو اس سے اندازہ کیجئے کہ یہ کتنی قیمتی ہے۔ جب سارے اسلام اور نبی کی محنت کی اجرت محبت بنتی ہے تو محبت کی اجرت کون دے پائے گا۔ صلوٰۃ

جب محبت اور مودت کا حکم دیا۔ تو آج ایک چیز آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو غلط فہمی ہے، جو لوگ سوال کرتے ہیں، لوگوں کی بات جو سمجھ میں نہیں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ محبت کے جو فرائض ہیں، محبت کے اظہار کے جو طریقے ہیں، وہ سمجھ میں نہیں آتے۔ تو نہ سمجھ میں آئے ہیں، نہ کبھی سمجھ میں آئیں گے۔ اس لیے کہ کچھ چیزیں ہیں جو عقل کی کسوٹی پر جانچی جاتی ہیں اور کچھ چیزیں ہیں جو محبت کے ترازو پر تولی جاتی ہیں۔ عقل کبھی محبت کی شدت کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، ڈاکٹر اقبال تک نے اسی بات کو کہا ہے کہ۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوئے تماشائے لب بام ابھی

ڈاکٹر اقبال بھی کہتے ہیں کہ عشق و محبت، ظلیل خدا کو آگ میں لے گئی۔ عقل ابھی تک سوچ رہی ہے کہ یہ کیا تماشہ ہوا۔ تو جب محبت کو عقل نہیں سمجھ سکتی تو جن چیزوں کو عقل سے سمجھنا ہے، لوگ محبت سے سمجھتے ہیں۔ جسے محبت سے سمجھنا ہے اسے عقل سے سمجھتے ہیں اور عقل ایک ایسی چیز ہے کہ عقل ہی کے معیار کے اوپر عبادتوں کی جڑا ہے۔ جناب موسیٰ علیہ السلام کے دور کا مشہور اور معروف واقعہ ہے کہ ایک عابد شب زندہ دار، بے انتہا عبادت کرتا تھا۔ بے انتہا سجدے کرتا تھا، بے انتہا اللہ کی نماز پڑھتا تھا۔ جناب موسیٰ ادھر سے گزرتے تھے تو اللہ کو سلام بھی کہلاتا تھا۔ لیکن سلام کا جواب نہیں ملتا تھا۔ تو جناب موسیٰ پریشان ہوئے کہا ”معبود ایسا عبادت گزار، اس سجدے کرنے والا، ایسی تسبیح کرنے والا، ایسی تقدیس کرنے والا اور وہ تڑپ رہا ہے جواب سلام کو اور تو جواب سلام نہیں دیتا۔“ کہا اچھا کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے پاس جانا اور کہنا کہ تمہاری پریشانی کیا ہے۔ تم کس بات سے پریشان ہو، وہ بتاؤ تو خدا تمہاری پریشانی دور کر دے۔ یہی تمہارا جواب ہے۔ جناب موسیٰ آئے۔ کہا ابھی اتنی عبادت کر

کتنے؟ انہوں نے کہا صاحب آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، ایڈوائس آپ کی اچھی ہے کہ ہم یہ چیز خریدیں اور اس چیز کو بیچیں۔ مگر ایک تو یہ چیز اتنی سستی ہے کہ فنون میں لینا پڑے گی اور بڑے بڑے گوداموں میں رکھنا پڑے گی اور پھر نفع کا تناسب کچھ بھی نہیں ہے۔ تو ہم ایسا کاروبار کریں کہ نہ زیادہ جگہ گھیرے، نہ زیادہ وقت لے اور نفع بھی زیادہ ہو۔ تو پھر آپ کیا کرتے ہیں؟ کہا ہم ڈائنمنڈ کا کاروبار کرتے ہیں۔ آپ نے فنون مال جو بھرا ہوا ہے گوداموں میں، اس کے اتنے دام نہیں ہیں جتنے اس پڑیا کے ہیں جو ہماری جیب میں رکھی ہے۔ تو کیا وجہ ہے۔ آخر یہ جو سڑک پر پتھر کوٹا جاتا ہے اور یہ بھی پتھر ہے، وہ بھی پتھر ہے۔ لیکن اس میں نفع کا تناسب بھی کم ہے اور جگہ بھی زیادہ گھرتی ہے اور ٹرک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ڈائنمنڈ کے کاروبار میں خالی ایک جیب میں رکھی، آپ کو دکھائی، ہر گھر پر جانا بھی نہیں ہے۔ خریدار بھی کم ہیں اور ایک ہیرا بھی بک گیا تو ان کا سال بھر کا خرچہ نکل آیا۔ کیوں؟ وہ زیادہ ہے، یہ کیا ہے۔ معلوم ہوا ہوشیاری یہ ہے کہ جو چیز کیا ہے، وہ لائن پکڑ لو۔ کیونکہ اس میں بیوپاری بھی زیادہ نہیں ہوں گے اور مال کی قیمت بھی زیادہ ہوگی۔ دنیا خالی اعمال کو پکڑے ہے۔ ہم اجر رسالت کو پکڑے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اس میں محنت بھی کم ہے اور اس کی قیمت بھی زیادہ ہے۔ صلوٰۃ

یہ ”محبت اہل بیت“ اجر رسالت ہے۔ اجرت ہے۔ کس کی اجرت ہے؟ نبی کی اجرت ہے یعنی ان کا مختانہ ہے۔ مختانہ کا مطلب یہ ہے کہ برابر ہے۔ تو نبی نے کتنی محنت فرمائی ہے؟ تیس (۲۳) سال کی تبلیغی زندگی میں کون سا حکم الہی ایسا ہے جو اللہ کے رسول نے بندوں تک پہنچایا نہیں ہے؟ سارے ہی احکام پہنچائے اور اکملکت لکم دینکم کی سند بھی حاصل کی کہ مکمل دین پہنچا دیا۔ کامل دین پہنچا دیا۔ سب کچھ پہنچا دیا۔ کچھ واپس لے کے نہیں گئے۔ تو جو کچھ پہنچا کے گئے ہیں اس کی اجرت ہے محبت اہل بیت۔ تو سب کچھ ایک پلڑے میں ہے اور محبت ایک پلڑے میں ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ترازو پر اجرت کی جب مال تلے گا تو سارا اسلام ایک پلڑے میں ہوگا اور ”محبت اہل بیت“ ایک پلڑے میں ہوگی۔ ایک ہی پلڑے میں نماز بھی ہوگی، روزہ بھی ہوگا، حج بھی ہوگا، زکوٰۃ بھی ہوگی، جہاد بھی ہوگا، فس بھی ہوگا، نیکی بھی ہوگی، خیر بھی ہوگا، خیرات بھی ہوگی، ہر عمل ایک پلڑے میں ہوگا۔ اور اس کی اجرت ”محبت اہل بیت“ ہے تو وہ ایک

بات۔ تم سے تو کہا نہیں مجھ سے کہا ہے۔ کہا اس نے مرغاناٹا ہے۔ کہا اچھا ٹھیک ہے جاؤ۔ اب جو جناب موسیٰ پٹے تو دیکھا کہ وہ مرغاناٹا رہا ہے۔ کہا موسیٰ شکر یہ تمہارا۔ تم نے پیغام پہنچا دیا۔ جناب موسیٰ علیہ السلام پریشان ہوئے۔ جب مسجد کے قریب پہنچے اور ملا کو دیکھا تو کہا، کیا ہوا کھانا آیا؟ کہا کہیں بھی نہیں آیا، مجھے تو گھر جانے میں دیر ہو گئی، انتظار میں۔ شاید تم نے کہا نہیں۔ کہا، ابھی کہہ تو دیا تھا۔ اب جناب موسیٰ پریشان ہو گئے کہ یہ کیسی بات ہے۔ تو خدا انبیاء کی سمجھ میں تو آتا نہیں ہماری آپ کی سمجھ میں کیا آئے گا۔ بندے بندے کا ذاتی معاملہ ہے، آپ کیوں ٹھیکیدار ہیں کہ یہ کرتے ہو، جہنم جاؤ گے۔ یہ تو قیامت میں جب ڈبہ کھلے گا تو پتا چلے گا، کون جنت جا رہا ہے، کون جہنم جا رہا ہے۔ صلوٰۃ

لکھا ہے کہ جب جناب موسیٰ علیہ السلام دوسرے دن گئے تو عابد و زاہد نے پھر کہا، موسیٰ ہمارا پیغام آج پھر پہنچا دینا۔ آگے بڑھے تو اس نے کہا موسیٰ ہماری طرف سے کہہ دینا۔ جناب موسیٰ نے بات تو کہی مگر کہا ”میرے معبود! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ گناہگار کو تو نے دے دیا، اور اس نیکوکار کو نہیں بھیجا۔ اس کی فرائض پوری نہیں کی۔“ کہا آج بھی تو دونوں نے کہلایا ہے۔ کہا ہاں دونوں ہی نے کہلایا ہے۔ کہا اچھا کہہ دینا دونوں سے کہ آج مشکل ہے، آج نہیں ہو سکتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ آج میں پریشان ہوں اور میری پریشانی یہ ہے کہ سوئی کے ناکے سے ناقوں کی قطار نکالنا چاہتا ہوں۔ اونٹوں کی قطار، اور سوئی کا ناکہ بھی نہ بڑھے اور نہ چھوٹا ہو۔ اس لیے میں بڑی پریشانی میں ہوں۔ آج میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جناب موسیٰ علیہ السلام چلے اور اس عابد و زاہد سے کہا کہ آج اللہ نے کہا ہے کہ آج مشکل ہے، میں پریشان ہوں۔ کہا کیا پریشانی ہے؟ کہا سوئی کے ناکے سے ناقوں کی قطار نکالنا چاہتا ہے اور بیٹھا ہے پریشان۔ تو وہ عابد و زاہد سجدے میں گر گیا، اللہ! اللہ کی مشکل حل کرے۔ ارے موسیٰ تم نے تو ہم کو پریشان کر دیا۔ ہم دعا کریں گے کہ اللہ کی مصیبت دور ہو، کہ ہمیں کھانے کو ملے۔ جب شرابی کے پاس گئے۔ کہا موسیٰ آج ہماری بات نہیں کسی، مرغاناٹا نہیں۔ کہا اللہ آج بہت پریشان ہے۔ کیا پریشان ہے؟ کہا سوئی کے ناکے سے اونٹوں کی قطار نکالنا چاہتا ہے، نکل نہیں رہی ہے۔ کہا کیسے نبی ہو، کیسے صاحب کتاب ہو۔ ارے خدا اور پریشان

رہے ہو، اتنے سجدے کر رہے ہو، اتنی تسبیح و تہلیل کر رہے ہو، شب و روز جو اتنی دعا کر رہے ہو، تو تمہارا دعا کیا ہے؟ کہا موسیٰ مجھے ایک بات بہت پریشان کیے ہے۔ اسی کے لیے دن رات دعا کرتا رہتا ہوں۔ موسیٰ نے کہا، وہ کیا بات ہے۔ کہا جب میں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے اتنی گھاس پیدا کی کہ پورا میدان اور صحرا گھاس سے بھرا ہے تو مجھے صدمہ ہوتا ہے کہ یہ سب بیکار جا رہی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں خدا سے کہ گدھا بھی پیدا کر دے جو کم سے کم اس گھاس کو چر لے۔ جناب موسیٰ نے کہا، بس بس سمجھ میں آگیا۔ یعنی مطلب یہ کہ عبادت بھی عقل کے ساتھ ہوتی ہے۔ صلوٰۃ

خدا بے وقوفوں کی عبادت کو قبول نہیں فرماتا۔ اس لیے کہ جب عقل ہی نہیں ہے تو خدا کو کیا پہچانا ہے۔ یہ سب واقعات ہماری عبرت کے لیے ہیں اور اس میں ایک تفسیر کی منزل ہے۔ سن لیجئے، جتنا پردھوں، جتنا کھوں، اتنا ہی یاد رکھئے گا، اتنا ہی مطلب نکالیں گے۔ پریشانی جب ہوتی ہے کہ جب بیان کچھ کر دو، معنی کچھ نکالے جاتے ہیں۔ جناب موسیٰ علیہ السلام جا رہے ہیں اور راستے میں ایک عابد و زاہد ملا، جو اللہ کی عبادت کر رہا تھا۔ پوچھا موسیٰ کہاں جا رہے ہو؟ کہا ”طور“ پر جا رہا ہوں، حاضری ہے، پیشی ہے، جا رہا ہوں۔ کوئی پیغام ہے؟ کہا ہاں پیغام یہ ہے کہ میں نمازیں بہت پڑھتا ہوں، میں روزے بہت رکھتا ہوں اور بیچ میں مجھے گھر کھانا کھانے جانا پڑتا ہے۔ تو اگر اللہ میرا کھانا بیس بھیج دیا کرے تو اتنا وقت اور عبادت میں صرف ہو جائے گا۔ اگر رزق مسجد ہی میں آجائے۔ کہا، اچھا کہہ دوں گا۔ آگے بڑھے۔ ایک شخص اور ملا جو ذرا کردار کا اچھا نہیں تھا۔ شرابی تھا۔ پیسے بیٹھا تھا۔ پی رہا تھا۔ جو موسیٰ گزرے تو کہا استغفر اللہ وہی و اتوب الیہ... منہ پھیر لیا۔ کہا موسیٰ کہاں جا رہے ہو؟ کہا اللہ کے سامنے جا رہا ہوں، پیشی پر جا رہا ہوں۔ کہا میری نہیں سنو گے؟ تم شرابی کبابی، تمہاری کیا سنوں گا۔ اچھا تم نہ سنو، اس سے کہہ دینا۔ کیا کہہ دینا؟ کہہ دینا کہ بھنا ہوا مرغ ہوتا تو مزا آجاتا۔ جناب موسیٰ نے کہا، توبہ توبہ۔ چلے گئے ”طور“ پر۔ کہا وہ عابد و زاہد ہے۔ اس نے کھانا مانگا ہے تاکہ نماز کا حرج نہ ہو، گھر نہ جانا پڑے۔ کہا اچھی بات ہے اور فلاں نے یہ کہا، فلاں نے یہ کہا، اور بس۔ بس نہیں اور پتا۔ میرے ایک بندے نے کچھ اور بھی کہا ہے۔ کہا معبود شرم آتی ہے بتاتے ہوئے۔ کہا تم تو پیغام پہنچانے والے ہو، شربانے کی کیا

تھیں۔ جیسے مکان بنے تھے، بنے ہوئے تھے۔ مٹی نہیں تھی جنت۔ پھر آدمؑ کیوں روئے؟
منٹے پر نہیں رو رہے تھے، جدائی پر رو رہے تھے۔

ہم سے لوگ کہتے ہیں کہ حسینؑ کو کیا ہوا کہ تم رو رہے ہو۔ ان کا تو بہت بڑا درجہ ہے۔ تو کوئی معاذ اللہ ان کے منٹے پر تھوڑی روتے ہیں۔ ہم اپنی جدائی پر روتے ہیں۔ ارے آدمؑ جنت سے چھوٹے تو روئے، ہم مالک جنت سے چھوٹے تو رو رہے ہیں۔ آدمؑ فراق جنت پر رو رہے تھے، ہم فراق سردارانِ جنان جنت کے غم میں روتے ہیں۔ یہ غم تباہی نہیں ہے، یہ غم جدائی ہے اور بلکہ یہ غم ہم کو تباہیوں سے بچاتا ہے۔ تو محبت کی ابتدا تو جناب آدمؑ ہی سے ملتی ہے۔ جناب نوحؑ محبت رکھتے تھے کہ نہیں؟ اگر محبت کوئی شے نہ ہوتی تو جب یوی نے کشتی پر آنے سے انکار کیا تو جناب نوحؑ اصرار نہ کرتے۔ آجائے زوجہ کشتی پر آجا۔ اور زوجہ ہے کہ ضد پکڑے ہوئے ہے کہ کشتی پر نہ آؤں گی۔ نبیؑ کی محبت زوجہ سے مسلم ہے۔ مگر زوجہ ڈوب گئی، نبیؑ کی محبت کشتی پر نہ لاسکی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبیؑ کو زوجہ سے محبت تھی۔ تو سب نجات نہ بنی۔ لیکن کہیں زوجہ کو بھی واقعی نبیؑ سے محبت ہوتی تو سوچتی، لاؤ کلمہ پڑھ لو، ان کی ہی محبت میں۔ تو بچ جاتی۔ میں کچھ عرض کر رہا ہوں۔ نوحؑ کی محبت زوجہ کو نہ بچا سکی۔ زوجہ کو نوحؑ کی محبت ہوتی تو بچ جاتی۔ تو ہم نے مانا سارے مسلمانوں کو رسولؐ بہت چاہتے ہیں۔ لیکن رسولؐ کی محبت تھوڑی بچائے گی، جب تم کو محبت ہوگی تب بچو گے۔ صلوٰۃ

وہ محبت منقطع ہو جاتی ہے جب ایمان کا سوال آتا ہے۔ کس باپ کو اپنے بیٹے سے محبت نہیں ہوگی۔ جناب نوحؑ آواز دے رہے ہیں، مرے لال میرے فرزند کشتی پر آجا۔ کشتی پر آنے کی شرط کیا تھی؟ ایمان، ایمان شرط تھی۔ یعنی نبیؑ سے رشتے کی شرط حسبِ و نسب نہیں ہے بلکہ ایمان ہے اور بیٹا کہہ رہا ہے، ارے نہیں بابا میں ایمان لا کے کشتی پہ کیوں آؤں گا۔ میں بڑا قامت دار ہوں، میں بڑا بلند قامت ہوں، میں بچ جاؤں گا۔ اور جب دیکھا سیلاب کا پانی آگے بڑھنے لگا تو پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ جب آواز دی میرے لال آج کے دن کوئی نہیں بچے گا، جب تک ایمان نہیں لائے گا، کشتی پر نہیں آئے گا۔ کہا باوا مجھے یہ پہاڑ بچالے گا۔ یعنی مادیت کو ذریعہ نجات بتایا اور نبیؑ کہہ رہا تھا ایمان ذریعہ نجات ہے۔ یہ سب قصے قرآن میں اس لیے دہرائے گئے ہیں کہ آج کے دور

ہو جائے۔ بھلا اس کے لیے بھی کوئی چیز ناممکن ہے۔ وہ قادر ہے کہ سوئی کے ناکے سے اونٹوں کی قطار نکال دے۔ اب جناب موسیٰؑ کا منٹے لگے۔ تیرے دن پھر پیشی ہوئی۔ موسیٰؑ کیا ہوا؟ کہا وہ تیرے لیے دعائیں کر رہا تھا۔ کہا شرابی نے کیا جواب دیا؟ کہا اس نے تو مجھے ڈانٹا کہ کیسے نبی ہو۔ کہا دیکھا تم نے اس کا ایمان اور اس کا ایمان۔ معلوم ہوا خدا ایمان پر دیتا ہے۔ صلوٰۃ

میں نے اس لیے کہا تھا کہ جتنا میں پڑھوں اتنا ہی یاد رکھوں گا۔ اسے دلیل نہ بنائیے گا۔ جب بھی دعا قبول کرانا ہو تو پینے لگیں۔ میں پہلے ہی کہہ دیتا ہوں، ورنہ بعد میں لوگ کہیں گے، ظاہر صاحب کہہ گئے، مرغا کھانا ہو تو پی کے دعا کرو۔ یہ بات نہیں ہے۔ ایمان کی منزل کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ یعنی خالی عبادت جنت میں نہیں لے جائے گی۔ ایمان جنت میں لے جائے گا اور ایمان پیدا ہوتا ہے محبت سے۔ ایمان برقرار رہتا ہے محبت سے۔ اس لیے کہہ دیا گیا کہ اہل بیتؑ کی محبت کو واجب قرار دیا جاتا ہے تاکہ مرتے مرتے بالایمان رہو۔ صلوٰۃ

تو یہ قیمت ہے محبت کی۔ جب محبت کی منزل آتی ہے تو جو لوگ عقل کے پیمانوں پر جانچتے ہیں، تفسیر کی منزل میں دیکھتے ہیں، حدیث سے ملا کے دیکھتے ہیں اور عقل کے اسکیل سے ناپتے ہیں، ان کی سمجھ میں محبت کی دنیا سمجھ آتی ہی نہیں۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ جب جناب آدمؑ زمین پر روتے ہوئے گھومتے تھے اور حواؑ کو تلاش کر رہے تھے۔ تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ جب جناب آدمؑ زمین پر آئے اور جناب حواؑ بھی آئیں۔ تو اللہ نے آدمؑ کو کہیں اتارا، حواؑ کو کہیں اتارا۔ فراق حواؑ میں آدمؑ رو رہے تھے۔ اللہ کے نبیؑ پہلے نبیؑ باوا آدمؑ گریہ کر رہے ہیں۔ ڈھونڈ رہے ہیں جناب حواؑ کو اور رو رہے ہیں۔ کیوں رو رہے تھے؟ محبت ہی میں تو رو رہے تھے۔ تو محبت تو آدمی کی فطرت ہے۔ کس بات پر رو رہے تھے؟ جدائی پر رو رہے تھے۔ جناب آدمؑ بیٹھے ہوئے جنت پر رو رہے تھے۔ تمام تفسیریں لکھتی ہیں، مولانا حرز الرحمنؒ نے قصص القرآن میں لکھا ہے کہ بہت دن تک جناب آدمؑ نے جدائی میں جنت کے گریہ کیا۔ کیوں روئے؟ کیا جنت مٹ گئی تھی، کیا جنت میں آگ لگ گئی تھی، کیا جنت پر ایٹم بم گرا تھا جو آدمؑ رو رہے تھے۔ جنت تھی، جیسی تھی ویسی ہی تھی۔ جیسی ہماریں تھیں، قائم تھیں۔ جیسی سربراہ تھیں، جاری

اسلعل پیا سے ہوئے تو جناب ہاجرہ بے قرار ہو گئیں اور کوہ صفا و مروہ میں پانی کی تلاش میں دوڑیں اور جب جناب اسلعل کی طرف نگاہ کی تو دیکھا ایک چشمہ جاری ہے۔ وہ چشمہ جناب اسلعل کی ٹھوکر سے پیدا ہوا۔

اب آپ ذرا عقل کو استعمال کر کے دیکھئے۔ عقل میں یہ بات آتی ہے کہ پھاوڑے سے، بیلچے سے، زمین کھودی جائے اور پانی نہ نکلے اور کم سن بچہ اڑھی مارے اور پانی نکل آئے۔ عقل کہاں سمجھ سکتی ہے اس چیز کو، عقل تو دو اور دو چار جانتی ہے۔ اور محبت میں کبھی دو اور دو پانچ بھی ہو جاتے ہیں۔ اب جو جناب ہاجرہ نے چشمہ دیکھا تو جناب اسلعل کو پانی پلا دیا۔ ایک تاریخی واقعہ ہے، ایک تاریخ اسلام کا واقعہ ہے۔ ہاجرہ بھی کامیاب ہو گئیں محبت میں، اسلعل بھی کامیاب ہو گئے، ابراہیم بھی کامیاب ہو گئے۔ بس کافی ہے، مگر آج تک مشق کرائی جا رہی ہے کہ جب بھی حج کے لیے آنا، صفا اور مروہ کے درمیان سنی کرنا، دوڑو۔ ہر آدمی سنی کرتا ہے کہ نہیں؟ یہاں بیٹھ کر کوئی عقل استعمال نہیں کرتا کہ یہ اسلام کا کیا حکم ہے کہ جب حاجی جائے تو صفا اور مروہ کے درمیان دوڑے؟ اور تھوڑا سا فاصلہ وہ ہے جس کے لیے حکم ہے ”شانے اچکا کے دوڑو“ کیونکہ ہاجرہ یونہی مضطرب ہو رہی تھیں۔ ایک بی بی دوڑی تھیں، سب کیوں دوڑیں؟ کہا دوڑنے سے یاد آئے کہ امتحان محبت کسے کتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں ایسی باتوں کو یاد رکھنا بھی تقویت محبت کا سبب ہے۔ بس وہی ہمارا ماتم ہے۔ سنجیدہ لوگ کہتے ہیں یہ پڑھے لکھے لوگ، یہ کروڑ پتی لوگ، یہ نوجوان، ابھی اچھے خاصے سنجیدہ خاموش بیٹھے تھے۔ یہ ہاتھ کیوں اچکانے لگے، یہ شانے کیوں اٹھنے لگے، یہ بچنے پر ہاتھ کیوں مارنے لگے؟ ارے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ، سربراہان مملکت، اسلامی ملک کے صدر و وزیر اعظم، بڑے بڑے فوجی افسر، لکھ پتی، کروڑ پتی، سینٹھ، بڑے بڑے علماء، یہ صفا اور مروہ کے درمیان اچکتے کیوں ہیں؟ کہا حکم خدا ہے۔ کیوں حکم خدا ہے تاکہ تمہیں یاد رہے کہ کوئی بی بی ہماری محبت میں مضطرب ہوئی تھی۔ تو یہ ماتم بھی اسی کی یادگار ہے۔ کہا مگر کس حکم نہیں دیا؟ کیا کرے حکم دے کے، جب اسے یقین ہے کہ کچھ لوگ بے کسے ماتم کریں گے۔ میں کچھ کہہ رہا ہوں۔ جہاں پر شک ہے کہ لوگ بھول جائیں گے، وہاں پر حکم دیا۔ یہاں پر یقین ہے کہ کوئی بھولے گا نہیں، حکم کی ضرورت

میں ہم ان سے سبق حاصل کریں۔ کھٹے کھٹے پانی آیا، کمر کربانی آیا، گلے گلے پانی آیا۔ آخری آواز بھردی نوحؑ نے، میرے بیٹے کشتی پر آجا، ایمان لے آ۔ مگر اس نے کہا نہیں۔ ٹھیک ہے۔ گئے گئے پانی تھا، سمجھ کا فرق تھا۔ کھٹے کھٹے پانی آیا، سمجھ کا فرق تھا۔ لیکن انصاف سے بتائیے جس کے گلے گلے پانی آجائے پھر اس کو سمجھنے میں کیا دیر ہے کہ اب ڈوب جائیں گے مگر پھر بھی کتا ہے کہ میں ڈوب جاؤں گا مگر کشتی پر نہ آؤں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں کشتی کی عداوت آجاتی ہے جب اس کو نبی نہیں سمجھا سکتا تو ہم اور آپ کیا سمجھا سکتے ہیں۔ شاید اسی لیے نبیؐ نے اپنے اہل بیتؑ کی مثال کشتی نوحؑ سے دی۔ صلوٰۃ

تاکہ مسلمان سمجھ لے کہ اس معاملے میں ضد کی، تو نجات نصیب نہیں ہوگی۔ مگر بیٹا تھا، نوحؑ کا بیٹا تھا، نبیؐ کا بیٹا تھا۔ جب ڈوبتے دیکھا، بیٹے کی سمجھ میں نہ آیا مگر محبت پوری اور تھی اور ایک مرتبہ سراٹھا کے کہا ”معبود کیا میرا بیٹا ڈوب جائے گا؟“ تو آواز آئی ”لعلی من اہلی“ اے نوحؑ یہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے۔ ذرا غور فرمایا آپ نے، جب نجات نہ حاصل کی تو اہل سے خارج کر دیا، مگر بغیر کشتی پہ آئے بخشش نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو فطری رشتے ہوتے ہیں نبیوں کے، اللہ انہیں کاٹ دیتا ہے۔ تمہارے اہل سے نہیں ہے۔ کیوں؟ صاحب ایمان نہیں ہے۔ تو قربت داروں میں قربت داری نہ ڈھونڈیے گا بلکہ قربت ایمان تلاش کیجئے گا۔ صلوٰۃ

اب یہ منزل ہے عقل کی اور ضد کی کہ نوحؑ کا بیٹا نہیں آیا تو فوج نہیں سکا۔ وہ محبت جو ایک باپ کے دل میں بیٹے کی ہوتی ہے وہ کام نہ آسکی، پہچانہ سکی بیٹے کو، کیونکہ اس نے ایمان قبول نہیں کیا۔ آگے بڑھ جائیے۔ جناب ابراہیمؑ کی منزل کو دیکھ لیجئے۔ کس طرح سے اللہ نے جناب ابراہیمؑ سے محبت کا امتحان لیا ہے۔ اس سے بڑا اور کیا امتحان ہوگا جس وقت جناب اسلعلؑ کی ولادت ہوئی اور آپ کو معلوم ہے کہ جناب ابراہیمؑ کی دو بیویاں تھیں۔ ایک سے جناب اسلعلؑ پیدا ہوئی اور ایک سے جناب اسحاقؑ۔ جناب اسحاقؑ کی ماں نے یہ پسند نہ کیا کہ اسلعلؑ اور ان کی ماں ساتھ رہیں۔ چنانچہ نبیؐ کو حکم ہوا۔ نبیؐ لے گئے جناب ہاجرہ کو اور لے جا کر وادی مکہ میں خانہ کعبہ میں چھوڑ دیا۔ جناب ہاجرہ و جناب اسلعلؑ اسی جگہ رہ گئے۔ جب سورج بلند ہوا اور

آپ کہیں گے کہ کوئی عمارت کیسے گواہ بنے گی؟ آج کروڑوں ڈالر ہندوستان کما رہا ہے محبت کی وجہ سے۔ آپ کہیں گے محبت کی وجہ سے انڈیا کو کروڑوں ڈالر کیسے ملے ہیں؟ تھوڑا سا فکر کرنے کی بات ہے۔ اتنے سیاح تاج محل دیکھنے کو جاتے ہیں۔ تو سیاح سے غیر ملکی پیسہ ملتا ہے کہ نہیں ملتا ہے؟ یہ تاج محل کیا ہے؟ کسی سے کسی کی محبت کی نشانی ہے۔ تو ایک بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی زوجہ کی محبت میں اس کی قبر پر ایک ایسی عمارت بنادی کہ ساری دنیا سے لوگ چلے آرہے ہیں۔ ارے بھی ہندوستان میں تو جمالت ہے، پاکستان میں تو جمالت ہے۔ امریکہ سے چلے آرہے ہیں، کینیڈا سے چلے آرہے ہیں، لندن سے چلے آرہے ہیں۔ تاج محل دیکھیں گے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کیا دیکھیں گے؟ تصویر دیکھ لیجئے۔ تاج محل کا فوٹو ہر جگہ ملتا ہے۔ کما بھی جو اصل دیکھنے میں مزہ ہے وہ تصویر میں نہیں ہے۔ ارے کروڑوں ڈالر خرچ ہو جائیں گے۔ ہو جائیں، کہنے کو تو ہوگا ہم تاج محل دیکھ آئے۔ یہ بھی ایک شہرت کی بات ہے۔ اور جب گئے تو وہاں چھوٹے چھوٹے تاج محل تک رہے تھے، خرید بھی لائے اور لاکے ڈرائنگ روم میں رکھ بھی دیا۔ آپ کہاں سے لائے؟ ہم اگر سے لائے۔ کیا آپ واقعی انڈیا گئے تھے؟ جی ہاں، ہم گئے تھے۔ یہ ہم وہاں سے لائے۔ کیا یہ وہ اصلی تاج محل اٹھا لائے۔ کما شہید تاج محل لائے۔ اگر آپ پاکستان میں بھی ڈھونڈیں گے تو بہت سے مسلمانوں کے گھر تاج محل رکھا مل جائے گا، لیکن بدعت کا فتویٰ نہیں ملے گا۔ تاج محل کی نقل رکھیں تو گناہ نہیں ہے۔ حسینؑ کے روضے کی نقل رکھیں تو گناہ ہے۔ یہ محبت ہے ایک بادشاہ کی اپنی بیوی سے۔ شاہجہاں کو ممتاز سے محبت تھی تو ایسی عمارت بنادی کہ دنیا کے لیے قابل زیارت ہو گئی۔ اور نانا کو نواسے سے محبت تھی تو اس کی قبر کی زیارت کو کیوں نہ واجب قرار دیدے؟ اس لیے کہ جب کوئی جاتا ہے تاج محل۔ اگر اکیلا گیا تو خیر مگر اگر اپنی بیوی کو لے کر تاج محل گیا اور اس نے تاریخ سنائی کہ شاہجہاں نے اپنی بیوی کی جدائی کے غم میں اس کی محبت میں یہ تاج محل بنوایا ہے۔ تو بیوی کہتی ہے دیکھو ایسے بھی چاہنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی بیوی کے لیے ایک موقع ہے اپنے شوہر کو نصیحت محبت کرنے کا، نمونہ محبت دیکھ کے۔ بس وہی تعزیر کا فائدہ ہے کہ جب ہم عزیمت کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں، دیکھو اللہ کے ایسے چاہنے والے ہوتے ہیں جو سجدے میں گھٹا کتا دیتے

نہیں۔ صلوٰۃ

آپ انصاف سے بتائیں کہ کوئی حکم دیتا ہے ماتم کرنے کا؟ کوئی نہیں دیتا۔ ایک جذبہ ابھرتا ہے اور آدمی ماتم کرتا ہے۔ تو یہ کیا ہے؟ یہ علامات محبت میں سے ہے۔ اور پھر صرف یہی نہیں بلکہ آج جتنے جگ کرنے والے جاتے ہیں۔ وہ جب طواف کرتے ہیں تو حجر اسود کو سلام بھی کرتے ہیں۔ حکم ہے ”دیکھو حجر اسود کی طرف اور سلام کرو۔“ ارے سوچئے، پتھر کو اور سلام۔ پتھر میں بھی کہیں حس ہوتی ہے۔ اللہ بیٹھا ہو تو سلام کریں، رسول اللہ تشریف فرما ہوں تو سلام کریں۔ یہ پتھر کو سلام کیسا؟ کما دیکھنے میں پتھر ہے مگر ہمارا گواہ ہے۔ پتھر گواہی دیدے تو اس کا سلام واجب ہو جائے۔ تو جو مر کے، جان دے کے، گواہی دیدے، اس کی زیارت کیوں نہ واجب ہو جائے۔ لوگ کہتے ہیں آپ زیارت پڑھتے ہیں حسینؑ کی، تو کہاں حسینؑ کہاں آپ۔ حسینؑ تو مر گئے، شہید ہو گئے۔ کبھی آپ کہتے ہیں شہید زندہ ہے، ماتم نہ کرو۔ اور جب ہم سلام کرتے ہیں تو آپ کہتے ہیں، سلام نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ صرف اعتراض ہے۔ ایک ہی زبان سے دو باتیں نکلتی ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں السلام علیک یا عبا عبداللہ تو ان مسلمانوں پر جو نبیؐ زادے کو سلام کرتا ہے، اعتراض کرتے ہیں۔ کہتے ہیں حسینؑ تو شہید ہو گئے، سلام کیسا؟ سلام تو حاضر پر کیا جاتا ہے، غائب پر نہیں کیا جاتا۔ ہم نے سوچا واقعی وہ شہید ہو گئے، تو آؤ رو لیں، ماتم کر لیں۔ تو کہتے ہیں ارے حسینؑ تو زندہ ہیں، ماتم کیوں کرتے ہو۔ تو اب ہم زندہ مانیں کہ مردہ مانیں؟ زندہ مانیں گے تو سلام کریں گے، مردہ مانیں گے تو ماتم کریں گے۔ جب ہم ماتم کریں تو وہ زندہ اور جب ہم سلام کریں تو وہ مردہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بات سمجھنا نہیں ہے۔ صرف اعتراض کرنا ہے۔ تو سلام پتھر کو ہے۔ اب آپ اتنا بتا دیجئے حجر اسود زندہ ہے کہ مردہ؟ آپ نے کما وہ تو پتھر ہے۔ زندہ اور مردہ ہونے کا کیا سوال ہے! پھر کیوں سلام کریں؟ کما وہ کعبہ میں لاکے اس لیے نصب کیا گیا تھا کہ اس پتھر نے اللہ کے رسولؐ کو سلام کیا تھا اور گواہی دی تھی رسولؐ کی رسالت کی۔ تو پتھر اگر نبیؐ کی گواہی دے تو محترم ہو جائے۔ یہ تعزیر و علم گواہی دیتے ہیں کہ حسینؑ ابن علیؑ حق پر تھے۔ اگر پتھر جو ما جاسکتا ہے تو تعزیر بھی چوما جاسکتا ہے۔ کیونکہ پتھر گواہ بنا محمدؐ کا، تعزیر گواہ بنا ہے حسینؑ کا۔

پہنچ سکتے تو شبیہ بنا لو جیسے نبیؐ نے کعبہ کے بدلے مسجد بنالی۔ تم کر بلا کے بدلے امام بارگاہ بنا لو۔ شبیہ بنا کے رکھ لو، ہم شبیہ بنانے کو حرام نہیں کہتے۔ ہم تم کو وہی ثواب دے دیں گے، بدرجہ مجبوری کیونکہ تم نہیں جاسکتے۔ اللہ اللہ یہ روضہ ہائے حسینؑ یہ ان کی شبیہیں۔

لوگ کہتے ہیں ان سے کیوں مانگتے ہو؟ مانگتے اللہ سے ہیں، ذریعہ انہی کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر ایک کی بات رد ہو سکتی ہے، حسینؑ کی بات رد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حسینؑ نے اللہ کی راہ میں اتنا دیا ہے کہ خدا کی عدالت کے خلاف ہے کہ کوئی بات کے لیے حسینؑ سے انکار کرے۔ چنانچہ ایک مشہور و معروف واقعہ ہے کہ ایک شخص نے نجف اشرف میں عالم دین سے سوال کیا کہ آخر جو آپ کہتے ہیں کہ اللہ نے حسینؑ ابن علیؑ کو ساری کائنات کے اختیارات دے دیئے ہیں۔ یہ کیسی بات ہے، سمجھ میں نہیں آتا؟ عالم دین غور کرتے رہے۔ آخر میں عمل کیا، مسجد سلا جا کر تاکہ امام زمانہؑ سے سوال کریں۔ جب پنج شنبہ کو مسجد سلا جا رہے تھے، تو تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک لوہار کی دکان پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آواز دی۔ کہاں جا رہے ہو؟ کہا مسجد سلا جا رہا ہوں۔ کہا کس لیے جا رہے ہو؟ کہا دعا کر رہا ہوں کہ امامؑ اس سوال کا جواب بتادیں۔ کہا سوال بتاؤ؟ کہا امامؑ سے پوچھیں گے۔ کہا پوچھنا امامؑ سے، ہمیں بھی بتاؤ؟ کہا سوال یہ ہے کہ ایک شخص نے یہ پوچھا ہے کہ حسینؑ سے دعا کیوں کی جاتی ہے؟ حسینؑ سے کیوں مانگا جاتا ہے۔ ملکیت تو خدا کی ہے، حسینؑ کی نہیں ہے۔ تو کہا اس میں کیا پریشانی کی بات ہے۔ کیا یہ واقعہ تم نے نہیں پڑھا کہ ایک بادشاہ شکار کے لیے گیا تھا۔ قافلے سے چھوٹ گیا، پیاسا ہو گیا۔ ایک ضعیف کی جھونپڑی کے پاس پہنچا۔ کہا میں پیاسا ہوں۔ اس نے پانی پلایا۔ کہا میں بھوکا ہوں۔ ایک بکری تھی۔ اس نے ذبح کر کے بھون کے کھلا دی۔ جتنا پانی تھا، پلایا۔ بادشاہ نے ایک انگوٹھی دے دی کہ تم شہر میں آنا اور اس انگوٹھی کے ذریعے مجھ تک پہنچ جانا۔ وہ ضعیف انگوٹھی لیے ہوئے پہنچی۔ شہر والوں نے پہچانا کہ یہ بادشاہ کی انگوٹھی ہے۔ اعلان بھی کر دیا تھا کہ کوئی ضعیف میری انگوٹھی لے کر آئے تو میرے دربار میں لے کر آنا۔ جب وہ ضعیف آئی اور انگوٹھی بادشاہ کو دکھائی۔ تو کہا میں نے پہچانا، تو میری محنت ہے۔ تو نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ درباریوں کو واقعہ بتایا۔ وزراء سے پوچھا کہ

ہیں۔ یعنی دوسرے کی محبت آپ کی محبت پر غالب آ جاتی ہے۔
تو فلسفہ رونے کا، ضریح کا، تابوت کا، علم و تعزیر کا یہ ہے کہ جب تاج محل دیکھ کے شاہجہاں کی محبت ممتاز سے یاد آتی ہے تو جو سامان و تحریک دیکھ کے حسینؑ کی محبت خدا سے یاد آتی ہے کہ ہائے کر بلا کے چاہنے والے، کیسے چاہنے والے تھے جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے گلے کٹا دیئے، جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دی۔ یہ دس دن ذکر محبت ہوتا ہے۔ یہ مجلسیں کیا ہیں؟ یہ جلوس عز کیا ہے؟ یہ نوحہ و ماتم کیا ہے؟ کچھ نہیں ہے۔ سب یادگار محبت ہے۔ انہی کو اچھا لگتا ہے جن کو محبت ہے اور جنہیں محبت نہیں ہوتی انہیں پسند نہیں آتا۔ اور پھر یہ محبت جو اجر رسالت قرار دی جاتی ہے اس کی ادائیگی کا ایک ذریعہ ہے۔ غم حسینؑ۔ یہ یادگاریں دوری کی وجہ سے ہیں۔ جب نبیؐ کے سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ تو کہا ”میرے حبیب تمہیں میرا گھر چھنے کا بڑا غم ہے۔ مسجد بنا لو، کعبہ کا رخ کر کے مسجد بنا لو۔ ہم تم کو مسجد میں نماز کا وہی ثواب دیں گے جو کعبے میں نماز پڑھنے کا ثواب ہے۔“ مسجد نبویؐ میں اب تک نماز کا ثواب وہی ہے جو کعبے میں اللہ کے گھر نماز پڑھنے کا ثواب ہے۔ ایک مسجد بنی، تو جہاں مسلمان جاتا ہے مسجد بناتا ہے۔ کیوں؟ یہ تاسی ہے تعمیر مسجد کی۔ مسجد بننے کی بنیاد کیا ہے؟ کعبے سے دوری، کعبے سے دوری۔ تو اللہ نے کہا کہ اگر تم میرے گھر سے دور ہو گئے تو یہاں گھر بنا لو۔ ہم اس کو وہی مرتبہ دے دیں گے۔ جو احکام خانہ کعبہ کے ہیں، وہی احکام مسجد نبویؐ کے ہیں۔ جیسے کافر و مشرک وہاں نہیں جاسکتا، کافر و مشرک یہاں نہیں آسکتا۔ جس حالت نجاست میں آپ کعبہ میں نہیں جاسکتے، اسی حالت نجاست میں آپ مدینے کی مسجد میں نہیں جاسکتے۔ وہ اصل، یہ نقل مگر نقل کو بھی وہی شرف دے دیا جو اصل کا ہے۔ صرف ایک طواف نہیں رکھا تاکہ کعبہ کعبہ رہے، مسجد مسجد رہے۔ مگر احترام مسجد و کعبہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تو ہم حسینؑ کے روضے پر جانے کے لیے تڑپتے ہیں کہ آج شب عاشور ہے۔ کاش آج ہم کر بلا میں ہوتے۔ کاش آج ہم حرم حسینؑ میں ہوتے۔ کاش آج ہم وہاں زیارت وارث پڑھ رہے ہوتے۔ آج کی رات بڑا مجمع ہوتا ہے کر بلا میں۔ ساری دنیا سے لوگ سٹ کے آتے ہیں نبیؐ زادے کو سلام کرنے کے لیے۔ اللہ اکبر۔ تو کہا ”اچھا ہندوستان میں ہو، پاکستان میں ہو، نہیں

بتایا جائے گا۔ کہا جب سوئی سے بھی خون نکالنا گناہ ہے تو چھری لگانا، خون بہانا، کتا بڑا گناہ ہوگا۔ جی یہ نہیں ہے۔ کئے کیسے؟ تو میں کون گا کسی مجسٹریٹ سے پوچھئے، کسی ایڈووکیٹ سے پوچھئے، کسی کانٹیل سے پوچھئے، کسی ڈی ایس پی یا ایس پی سے پوچھئے کہ اگر ہم سڑک پر کھڑے ہو کر اپنے چھرا ماریں تو پاکستان میں جرم تو نہیں ہے؟ کہا جرم ہے۔ انڈین پیٹل کورٹ میں ممانعت ہے۔ آپ اپنے اوپر خود زخم نہیں لگا سکتے۔ چھ مینے کی سزا ہے۔ مگر جلوس میں ماتم ہوتا ہے، کتنے گرفتار ہوتے ہیں؟ چالان کیوں نہیں ہوتا؟ کہا یہ قانون نہیں توڑ رہے ہیں ملک کا، اپنے امام کی محبت میں خون نکال رہے ہیں۔ تو کراچی کی پولیس سمجھا رہے ہیں اور اللہ کے فرشتے کیا بے وقوف ہیں کہ گناہ لکھ لیں گے۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ یعنی Intention کیا ہوتی ہے جرم کے پیچھے؟ وجہ یہ نہیں ہے کہ کیونکہ اللہ نے خون نکالنے کی ممانعت کی ہے لہذا عاشور کو ہم اپنا خون نکالیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ آج کربلا میں بچے خون میں نہائے ہوئے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے آپ نے کراچی میں بھی دیکھا ہوگا۔ میں نے کلکتہ اور لکھنؤ میں بھی دیکھا۔ دنیا بھر میں مائیں چھوٹے چھوٹے بچوں کو گود میں لے کے آتی ہیں اور کہتی ہیں، اس کو قتل لگا دو۔ کوئی ماں بچے کا خون دیکھ سکتی ہے۔ مگر اللہ یہ محبت کا جذبہ ہے کہ بچے کو خون میں نہایا دیکھتی ہے اور خوش ہوتی ہے۔ آج ہمارے بچے نے خوب ماتم کیا ہے۔ یہ جذبہ عقل میں کہاں سے آئے گا۔ یہ لیلیٰ کی دین ہے، یہ رباب کی دین ہے، یہ ام فروہ کی دین ہے، جنہوں نے شب عاشور اپنے بچوں کو آمادہ کیا تھا۔ اللہ اللہ یہ غم حسینؑ، یہ ماتم حسینؑ، اس کی جزا کی انتہا نہیں ہے۔ حسینؑ کہتے ہیں ”جو میرے غم میں روئے گا، میں اول شب اس کی قبر میں آؤں گا۔ جو میری زیارت کو آئے گا، میں پہلی رات اس کی قبر میں زیارت کو آؤں گا۔“ یہی اتنا بڑا فائدہ ہے محبت حسینؑ کا۔ (جس کا کوئی ذریعہ نہیں ہے) کسی کی قبر میں کوئی آسکتا ہے۔ باپ آئے گا، دادا آئے گا، کون آئے گا؟ کوئی نہیں آئے گا۔ مگر یہ غریب الوطن ماتم دار کی قبر میں آتا ہے۔ تو میرا رونے والا ہے۔ فرشتوں سے سفارش کرتا ہے۔ جانتے ہو یہ کون ہے؟ یہ میرا عزا دار ہے۔ یہ میری مجلس میں روتا تھا، یہ میرے نام پر گریہ کرتا تھا۔ کیا اختیارات ہیں حسینؑ کو، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ بس حضورؐ، آپ رولیں۔ اس لیے کہ رونے کی رات آگئی۔ روز آپ رو رہے تھے،

بتاؤ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ کسی نے کہا ایک لاکھ دیدے۔ کسی نے کہا پانچ لاکھ دیدے۔ کسی نے کہا شرمیں ایک گھر دیدے۔ کسی نے کہا کھیتی باڑی دیدے۔ کسی نے کچھ کہا۔ ایک وزیر چپ بیٹھا تھا۔ کہا تم نہیں بول رہے ہو؟ کہا جو کچھ یہ کہہ رہے تھے وہ عدالت کا تقاضہ نہیں ہے۔ کہا کیوں؟ کہا اس لیے نہیں ہے کہ اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے تجھے دے دیا۔ تو اب اس کا بدلہ تو یہ ہے کہ تیرے پاس جو کچھ ہے اسے دے دے۔ تو بادشاہ نے کہا کہ بات تو تم صحیح کہتے ہو۔ اس نے کل پونجی ہم کو دیدی تھی، تو ہمیں کل بادشاہت انہیں دے دینا چاہیے۔ مگر دیا نہیں، کیونکہ عادل نہ تھا۔ تو حسینؑ کے پاس جو کچھ تھا، سب اللہ کو دیدیا۔ تو اب عدالت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے، سب حسینؑ کو دیدے۔ میں گناہوں کا بخشے والا ہوں، میں نے یہ حق تمہیں دیا۔ جس کا گناہ چاہے بخشو۔ میں جہنم سے بچا کے جنت بھیجے والا ہوں، اے حسینؑ یہ حق تم کو دیا۔ جس کو کو اس کو نار جہنم سے آزاد کر دوں۔ اس لیے کہ حسینؑ نے سب کچھ اللہ کو دیدیا۔ مدینے سے جو کچھ لے کے آئے تھے وہ سب خدا کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔

آج کی رات آگئی۔ آپ برابر سنتے ہیں کہ بی بیائیں اپنے بچوں کو لیے بیٹھی ہیں۔ آپ نے اعلان سنا ہے، زنجیر کا ماتم ہوگا۔ لوگ حیران ہیں، یہ زنجیر کا ماتم کیوں کرتے ہو؟ یہ خون کیوں نکالتے ہو؟ اعتراض آسان ہے، محبت کا جانچنا بہت ہی مشکل بات ہے۔ اولیں قرنیٰ کو جب یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ کا دندان مبارک شہید ہو گیا۔ تو پھر لے کے دانت توڑ لیے۔ پھر سوچا، پتا نہیں آگے کے دانت ٹوٹے ہیں کہ پہلو کے؟ پہلو کے توڑ لیے۔ پھر سوچا، کہیں بائیں پہلو کے نہ ٹوٹے ہوں، وہ توڑ لیے۔ سارے دانت توڑ لیے۔ جب رسولؐ کو معلوم ہوا تو اصحاب سے کہا۔ دیکھا، اولیں قرنیٰ میرا کتنا چاہنے والا ہے کہ اس نے اپنے دانتوں کو توڑ لیا۔ اگر نبیؐ کہہ دیتے، تو نے اسلام کے خلاف کیا۔ آپ بھی آج فتویٰ دے سکتے تھے۔ مگر جب نبیؐ نے اس محبت کو قبول کیا۔ اور یہ فتاویٰ جو چلتے ہیں، صاحب زنجیر کا ماتم جائز ہے کہ ناجائز ہے؟ آپ کو کرنا ہے؟ جسے کرنا ہوتا ہے، فتویٰ نہیں پوچھتا۔ جسے نہیں کرنا ہوتا ہے وہی فتویٰ پوچھتا ہے۔ اب جب آپ عالم سے پوچھیں گے کہ خون نکالنا جائز ہے کہ نہیں چھری سے؟ تو چھری سے کیوں پوچھتے ہیں۔ سوئی سے پوچھئے۔ سوئی سے بھی خون نکالنا ناجائز ہے۔ قانون اسلام ہے۔ قانون پوچھئے گا تو قانون

تقریریں کی ہیں، کہتے ہیں ”مولا ہم آپ کا ساتھ چھوڑ کر کیسے جائیں گے۔ آپ امام وقت ہیں۔ اگر ستر (۷۰) مرتبہ قتل کیے جائیں، ہماری خاک فضا میں اڑا دی جائے، جب بھی ہم انہی قدموں پر جان دیں گے۔“ جب یہ کہا، تو حسینؑ نے کہا۔ حبیبؑ مبارک ہو، تمہارا نام بھی فرد شہدا میں ہے۔ زہیرؑ تمہارا نام بھی فرد شہدا میں ہے۔ مسلمؑ تمہارا نام بھی فرد شہدا میں ہے۔

کوئی سپہ سالار لشکر، کوئی بھی فوج کا سردار اپنی فوج کو مرنے کی خبر دے گا؟ آخر آخر تک سرداری سنبھالیا کرتے ہیں، گھبراؤ نہیں، فتح ہماری ہوگی۔ یہ کیسا لشکر ہے؟ یہ کیسا سردار ہے؟ جو رات کو مرنے کی اطلاع دے رہا ہے۔ مگر نہ ایسا لشکر ہوگا، نہ ایسا سردار۔ حسینؑ کہیں گے کہ اگر نہ بتا دوں گا تو انہیں رات بھر قرار نہیں آئے گا۔ جس کے لیے کہتے تھے کہ تمہارا نام ہے، اس کے چہرے پر رونق آجاتی تھی۔ سجدہ شکر میں جھک جاتا تھا۔ یہاں تک کہ فرست کو روک دیا۔ بس ایک شہزادہ اٹھا۔ چچا جان کیا شہداء کی فرست تمام ہوگئی؟ کہا نہیں میرے لال، کیا بات ہے؟ کہا میرا نام نہیں ہے۔ آپ سمجھ گئے۔ یہ شہزادہ قاسمؑ ہیں۔ کہا تمہارے نزدیک موت کیسی ہے؟ کہا چچا جان آج کے دن شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ یہ سننا تھا، کہا تمہارا نام بھی ہے۔ تمہارے چھوٹے بھائی علی اصغرؑ کا بھی نام ہے۔ بس علی اصغرؑ کا نام سننا تھا کہ ہاشمی خون رگوں میں جوش مارنے لگا۔ کہا آقا کیا اشیاء خیموں میں آجائیں گے؟ حسینؑ نے کہا نہیں قاسمؑ میں علی اصغرؑ کو لے جاؤں گا۔ میں عرض کروں گا شہزادے ذرا آہستہ بولیں۔ اگر بیسیوں نے سن لیا تو کل آپ کو بہت یاد کریں گی۔ انصار و اصحاب اٹھے، اپنے اپنے خیموں میں گئے۔ جناب زہیرؑ قین اپنے خیمے میں گئے۔ زوجہ سے کہا کہ جا غلام کو ساتھ لے لے۔ کونے چلی جا۔ میں نے اپنی ساری جائیداد تجھے حبہ کی۔ کیا کہا زہیرؑ میں کونے چلی جاؤں؟ کیوں چلی جاؤں کونے؟ اور آپ؟ کہا میں نہ جاؤں گا۔ کہا کیوں؟ کہا میں کل امامؑ کے قدموں پر جان نثار کروں گا۔ کہا سبحان اللہ، میں نے ہی آپ کو آمادہ کیا آنے کے لیے۔ آپ رسول اللہ سے سرخرو ہو جائیں، میں بی بی سیدہؑ کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ آخر آپ مجھے کیوں کونے بھیج رہے ہیں؟ امامؑ کیا کہیں گے، بی بی زینبؑ کیا کہیں گی؟ تو کیا یہ بات نہیں ہے۔ امامؑ ہی نے کہا ہے۔ کہا اچھا زہیرؑ یہ بتائیے وہ کیا بات امامؑ نے کہی جو آپ سب لوگ اتنی زور

آج حسینؑ کی رخصت کی شب ہے۔ ہم رات بھر جاگتے ہیں تو لوگ سوتے ہیں۔ کیوں جاگ رہے ہو؟ جاگتے نہیں ہیں، نیند ہی نہیں آتی۔ ہائے کل یہ رونق نہ ہوگی، کل یہ یہاں چراغ نہ ہوں گے، کل یہ یہاں اہتمام مجلس نہ ہوگا۔ نو (۹) دن دوڑ کے آپ آئے تھے، چلو چلو مجلس ہے۔ ایک عجب رونق تھی، ایک عجب شان تھی۔ جو شب عاشور کی شان ہے، وہ شام غریباں میں نہیں رہتی۔ کیوں آج اتنی رونق ہے؟ آج خیموں میں چراغ جل رہے ہیں۔ کوئی ماں جھولا جھلا رہی ہے، کوئی ماں علی اکبرؑ کے سرہانے بیٹھی ہے، کوئی ماں عونؑ و محمدؑ کو خیر و خندق کے واقعات سنارہی ہے اور ایک بی بی شب عاشور ایک خیمے میں بیٹھی رو رہی ہیں۔ کسی طرح سے آنسو نہیں تھمتے۔ جناب زینبؑ نے سمجھایا، آنسو نہیں رکے۔ لیلیٰ اور ربابؑ نے سمجھایا، آنسو نہیں رکے۔ یہ خبر عباسؑ تک پہنچ گئی کہ بی بی ام کلثومؑ اکیلی بیٹھی خیمے میں رو رہی ہیں۔ دروازے پر آئے۔ شہزادی اجازت ہے کہ غلام خیمے میں آئے۔ کہا آؤ آؤ بھیا عباسؑ۔ سامنے دو زانوں بیٹھ گئے۔ کہا بی بی رونے کا سبب کیا ہے؟ کہا کچھ نہیں۔ کہا نہیں، آپ کو میرے حق کی قسم بتا دیجئے۔ کہا عباسؑ کیا پوچھتے ہو۔ ابھی میں خیمہ خیمہ گئی تھی۔ بی بیاں اپنے بچوں کو تیار کر رہی تھیں۔ کل بھیا حسینؑ پر سب نثار کریں گی۔ میرے کوئی اولاد نہیں جو میں اپنے بھائی پر قربان کروں۔ بس تلواریں نکال کے نیام سے رکھ دی۔ بی بی کیا چھوٹا بھائی اولاد کے برابر نہیں ہوتا؟ کہا بے شک ہوتا ہے۔ تو کہا کل مجھے پیش کر دیجئے گا۔ میں آپ کی طرف سے اپنی جان دے دوں گا۔ جس خیمے میں جائیے، تیاری۔ ادھر خیموں کے باہر انصاران حسینؑ تلواریں پر مقل کر رہے ہیں، عبادت کر رہے ہیں، فخر و مباہات کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا ہے، دیکھیں کل پہلے کون جان دیتا ہے۔ حسینؑ نے ایک خیمے میں سب کو جمع کیا۔ جمع کرنے کے بعد فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ”میں نے تمہاری گردنوں سے بیعت اٹھالی۔ تمہارا جی چاہے ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں تم سے کوئی محاسبہ نہیں کروں گا۔“ دیکھا کہ کوئی نہیں اٹھا کہ ایک مرتبہ چراغ گل کرویا۔ کہا اگر تمہیں جانے میں شرم آرہی ہے تو لو، میں نے اندھیرا کرویا، تم چلے جاؤ۔ چراغ روشن کیا، تو کیا دیکھا بیٹھے ہوئے ہیں انصاران باوفا۔ سوال کیا حبیبؑ کیوں نہیں گئے، زہیرؑ کیوں نہیں گئے، مسلمؑ کیوں نہیں گئے؟ اب جو انصاران حسینؑ نے

دسویں مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اناللہ وانا الیہ راجعون

عزاداران امام حسین!

آج دس محرم ہے، عاشور کا دن ہے۔ آپ برابر ”محبت اہل بیت“ اور اس کی اہمیت کو سماعت فرماتے تھے۔ مگر آج اس مجلس کی نوعیت کچھ اور ہے۔ کل تک منبر پر علم لگے ہوئے تھے، چراغ جل رہے تھے، عزائے میں علم استادہ تھے، تبرکات رکھے ہوئے تھے۔ مگر آج سب بڑھا دیئے گئے ہیں۔ اس لیے کہ جس سے رونق تھی وہ ہم سے رخصت ہو گیا۔ آپ سارا دن مجلس و ماتم میں مصروف رہے اور جلوس کو پہنچا کر واپس تشریف لائے ہیں۔ دستور ہے ہم مسلمانوں کا کہ جب کسی کا انتقال ہو جاتا ہے، تو اس کا جنازہ قبرستان تک پہنچاتے ہیں۔ جب میت کو قبر میں دفن کر دیتے ہیں تو جو قریبی اعزاء ہیں یا جن کو مرنے والے سے زیادہ قربت اور محبت ہے، وہ گھر پر سے لے لے جاتے ہیں تاکہ وارثوں کو سمجھائیں، پر سہ دیں، انہیں کچھ کھلائیں، اس لیے کہ جس گھر میں موت ہو جاتی ہے، اس گھر میں چولہا نہیں سلگتا۔ لہذا جا کے بچوں کو سمجھایا جاتا ہے۔ اس دستور میں دنیا شریک ہے لیکن ہائے کر بلا والے کہ جنہیں کوئی پر سہ دینے والا

سے روئے کہ ہم سن نہ سکے کہ امام کیا کہہ رہے ہیں۔ کہا وہی تو کہہ رہا ہوں۔ امام نے فرمایا ”ارے اصحاب باؤفا، تم اپنی ازواج کو کونے بھجوا دو۔“ ہم نے پوچھا کیوں؟ کہا میری شہادت کے بعد خیموں میں آگ لگے گی، سیدانوں کے سروں سے چادریں چھینی جائیں گی۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ ان کی بے حرمتی ہو۔ جیسی تو کہہ رہا ہوں۔ کہا سبحان اللہ تم گلا کٹا کے شہداء میں شامل ہو، میں رس بندھوا کے کونے نہ جاؤں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

یہ شب وداع آگئی۔ کل عاشور کا دن ہے۔ تعزیئے اٹھ جائیں گے، علم اٹھ جائیں گے، عزائے غنائوں پہ بے رونقی آجائے گی۔ آج اتنا بڑا مجمع خدا حافظ کئے کے لیے آیا ہے۔ آقا خدا حافظ، فاطمہؑ کے جانی خدا حافظ، کر بلا کے پیارے مہمان خدا حافظ۔ اے آقا آپ جارہے ہیں، سدھاریئے، مگر غلاموں کو یاد رکھئے گا، کینوں کو یاد رکھئے گا۔ اے آقا ہم آپ کی کچھ خاطر نہ کر سکے۔ جو حق رونے کا تھا، نہ رو سکے۔ جو حق ماتم کا تھا، ادا نہ کر سکے۔ مولا ہمیں یاد رکھئے گا۔ پھر ہمارے گھروں میں مہمان آئیے گا۔ پھر ہمارے گھروں کو رونق بخشنے گا۔ آقا ہماری خطائیں معاف کرتے جائیے۔ جس نے حر کو معاف کر دیا۔ وہ تم چاہنے والوں کو کیوں نہ معاف کرے گا۔ اے آقا خدا حافظ۔ ہاں میری ماؤں، ہاں میری بہنوں، ہاں میرے جوانوں، ہاں میرے بزرگوں، الوداع کہہ لو۔ حسینؑ جارہے ہیں۔ جب آپ کے دل پر یہ اثر ہے کہ کل عشرہ ہے۔ یہ شب عاشور کی مجلس ہے۔ تو آج کر بلا میں بیسیوں کا کیا حال ہوگا۔ کوئی علی اکبرؑ کو دیکھ رہی تھی۔ علی اکبرؑ یہ تیری جوانی کی آخری رات ہے۔ کوئی عونؑ و محمدؑ کو دیکھ رہی تھی، عونؑ و محمدؑ بیٹا، کل اپنی جان ماموں کے قدموں پر نثار کرنا۔ کوئی قاسمؑ سے کہہ رہی تھی کہ کل یہ جوانی خاک میں مل جائے گی۔ ارے بی بیوں بچوں کو تیار کر رہی تھیں۔



کہ نماز عشاء کے بعد سید سجادؑ نے جب سجدے میں سر رکھا تو میار ہویں محرم کی نماز صبح کے وقت سجدے سے سر اٹھایا۔ رات بھر فرماتے رہے شکوا "لله شکوا" "اللہ" اے اللہ تیرا شکر ہے۔" رات بھر سوگوار بیٹے نے قربانیوں کے قبول ہونے کا شکریہ ادا کیا۔ سید سجادؑ سجدے میں تھے اور کوئی مردوں میں تھا نہیں۔ سب کے جنازے خاک پر پڑے تھے۔ ایک مرتبہ جناب زینبؑ نے فرمایا، "ہن ام کلثومؑ" بھیا مجھے گھر سوئپ گئے ہیں۔ چلو بچوں کو جمع کر لیں اور بچوں کو جمع کر کے شمار کر لیں اور ہم پہرہ دیں گے تاکہ ان بچوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ جناب زینبؑ نے بچوں کو جمع کیا، شمار کیا، تو دیکھا کہ تین بچے شمار میں کم ہیں۔ جلی ہوئی قاتلوں کے پیچھے شزا دیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔ جناب زینبؑ و ام کلثومؑ جب خیمہ گاہ کے پیچھے پہنچیں تو روایت میں ہے کہ دیکھا دو بچے خاک پر لیٹے سو رہے ہیں۔ جناب ام کلثومؑ نے آواز دی بی بی زینبؑ تشریف لائیے۔ الحمد للہ بچے مل گئے ہیں۔ جناب زینبؑ و ام کلثومؑ قریب آئیں۔ کہا یہ تھک کے سو گئے ہیں، ایک کو ہم اٹھالیں، ایک کو آپ آہستہ سے اٹھالیں تاکہ ان کی نیند نہ ٹوٹے مگر جب بی بی ایں جھکیں تو دیکھا بچے سانس نہیں لے رہے ہیں۔ دونوں بچے وفات پا چکے ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ یہ بچے شدت پیاس سے مر گئے ہیں۔ بچوں کو اٹھایا۔ اب بچوں کی طرف نہیں بڑھیں، گنج شہیداں میں لگیں۔ جہاں شہداء کے جنازے رکھے تھے۔ دو جنازے اور رکھ دیئے۔ آواز دی بھیا، دو شہیدوں کا اور اضافہ ہو گیا۔

اس کے بعد پلٹ کر آئیں۔ اب جو بچوں کو شمار کیا تو دیکھا کہ بی بی سکینہؑ نہیں ہیں۔ پریشان ہوئیں۔ کہا ام کلثومؑ سب ہیں، سکینہؑ نہیں ہے۔ بھیا نے کہا تھا، "ہن میری سکینہؑ کا خیال رکھنا، اس لیے کہ سکینہؑ میرے سینے پر سوتی تھی۔ آج رات اسے میرا سینہ نہیں ملے گا۔ ایک مرتبہ شزا دیاں بڑھیں۔ راوی کہتا ہے میدان کربلا میں آئیں۔ خیال یہ ہوا کہ کہیں سکینہؑ پیاس سے مضطر ہو کر چچا کی محبت میں فرات کے کنارے نہ چلی گئی ہوں۔ داد دیجئے شجاعت کی شزا دیوں کی کہ جس میدان سے کوئی زندہ واپس نہیں آیا، اس میدان کی طرف بڑھیں۔ قریب فرات جا کے آواز دی، عباسؑ، عباسؑ کیا سکینہؑ تمہارے پاس ہے؟ اک مرتبہ کٹے ہوئے گلے سے آواز آئی، شزا دی سکینہؑ ادھر نہیں آئی۔ مگر چچا کا جنازہ تو پنے لگا۔ ادھر ڈھونڈا، ادھر ڈھونڈا۔ بی بی ایں بے چین ہیں، مضطر

نہ تھا۔ آج ہی نہیں، وہ تین دن سے بھوکے پیاسے تھے، وہ بے والی و وارث خاک پر بیٹھے تھے اور کوئی انہیں پر سہ دینے والا، ہمدردی کرنے والا نہیں تھا۔ اسی لیے باوجود دن بھر کی تھکن، فاقہ اور محنت کے، جو اہل محبت ہیں اور اجر رسالت ادا کرتے ہیں، وہ ہر اس عزا خانے میں تشریف لاتے ہیں جس میں روز مجلسیں سنتے تھے کہ چلو چل کے پر سہ دے آئیں۔

ہاں جس کا وارث ہوتا ہے، اسے پر سہ دیا جاتا ہے۔ حسینؑ لاوارث نہیں ہیں۔ حسینؑ کا ایک پوتا اب بھی پردہ غیب میں موجود ہے۔ تو ہم امام زمانہؑ کو پر سہ دیتے ہیں۔ آقا کربلا کے شہیدوں کا پر سہ قبول کیجئے۔ آقا انصار ان حسینؑ کا پر سہ قبول کیجئے۔ حبیبؑ اور زہیرؑ، مسلمؑ ابن عوجہؑ، بریرؑ، ہلالؑ ابن نافعؑ، اے آقا جونؑ غلام کا بھی پر سہ۔ اے آقا یہ آپ کے چاہنے والے آپ کو عونؑ و محمدؑ کا پر سہ دینے آئے ہیں۔ یہ آپ کے چاہنے والے آپ کو قاسمؑ ابن حسنؑ کا پر سہ دینے آئے ہیں۔ یہ آپ کے چاہنے والے عبد اللہؑ ابن حسنؑ کا پر سہ دینے آئے ہیں۔ اے یہ آپ کے چاہنے والے قبر بن ہاشم ابو الفضل العباسؑ کا پر سہ دینے آئے ہیں۔ آقا یہ آپ کے چاہنے والے شبیبہؑ پیغمبرؐ علی اکبرؑ کا پر سہ دینے آئے ہیں۔ آقا آخر میں ہم سے اپنے جد سید الشہداء امام حسینؑ کا پر سہ قبول کیجئے۔ آپ وارث ہیں ان کے، آپ ہمارا پر سہ قبول فرمائیں۔ اور ان عزاداروں نے جو اجرت اہل بیتؑ میں آنسو نذر کیے ہیں، انہیں شرف قبولیت بخشئے۔ ان کو صبح و سالم رکھئے تاکہ آئندہ سال پھر یہ آپ کے جد کی مسمانی کے لیے آئیں، اور اسی طرح پر سہ کی مجلس میں شریک ہوں۔ اے عزاداروں! ایک ایسی شام تھی، جسے شام غریباں کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو حیرت ہے کہ کل تک کی مجلسوں میں چراغ جلتے ہیں، روشنی ہوتی ہے۔ آج کی مجلس میں اندھیرا ہوتا ہے، لوگ خاک پہ بیٹھے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کل کی رات خیام حسینیؑ میں چراغ جل رہے تھے۔ کسی خیمے میں علی اکبرؑ تھے، کسی خیمے میں علی اصغرؑ کا جھولا تھا، کسی خیمے میں قاسمؑ ابن حسنؑ تھے، کسی خیمے میں انصار و اصحاب تھے۔ مگر آج وہ خیمے جل گئے، وہ خیمے خاک پر ہیں۔

جب شام غریباں کربلا میں آئی، تو ایک مرتبہ سناٹا چھایا۔ سید سجاد امام زین العابدین علیہ السلام نے تمہم فرمایا۔ نماز شروع کر دی۔ بیبیوں نے نماز ادا کی۔ لکھا ہے

ایک مرتبہ سوار نے نقاب الٹی، بیٹی میں تیرا باپ علی ہو۔ اے میری مظلومہ بیٹی، جا، جا کے خاک پر آرام کر، اب علی پہرہ دے گا۔ زینب کا دل بھر آیا، قدموں سے پلٹ گئیں۔ کہا بابا، اے بابا آپ اب آئے ہیں۔ اے بابا اس وقت کیوں نہ آئے جب قاسم کا جنازہ پامال ہو رہا تھا۔ اے بابا جب میرے لال عون و محمد تلواریں کھا رہے تھے، آپ کہاں تھے بابا۔ اے بابا جب میرے بھائی عباس کے شانے قلم ہوئے، آپ کہاں تھے بابا۔ اے بابا جب عباس کے سر پر گرز پڑا، آپ کہاں تھے بابا۔ بابا جب میری اٹھارہ برس کی کمائی علی اکبر گھوڑے سے گرا، آپ کہاں تھے۔ اے بابا جب علی اکبر کے سینے پہ برجمی لگی، آپ کہاں تھے بابا۔ جب میرا بھائی اکیلا جوان کالا لاشہ لارہا تھا، آپ کہاں تھے بابا۔ اے بابا جب رباب کی گودا جڑی، علی اصغر نے تیر کھایا، اے بابا آپ کہاں تھے۔ گریہ بڑھا۔ کہا بابا میرا ماں جایہ مار ڈالا گیا، بابا پیا سا حسین، جب اس کے گلے پر خنجر چل رہا تھا، آپ کہاں تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ علی ابن ابی طالب نے دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کیا۔ گھوڑے سے اتر آئے، بیٹی کو کلیجے سے لگایا۔ زینب میں نہیں تھا۔ اس وقت میں تیری مدد کے لیے آیا ہوں۔ تم امتحان دے رہی تھیں، میں آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ بس تڑپ گئیں۔ کہا بابا آپ اس وقت بھی تھے، جب میرے سر سے چادر چھینی گئی۔ اے بابا میں نے بالوں سے منہ چھپایا۔ بابا، اے بابا آپ کی بیٹی کو آفتاب نے بھی برہنہ سر نہ دیکھا تھا۔ میرے سر کی چادر چھن گئی، میری کمائی کر بلا میں اجڑ گئی۔ اے بابا چلو زرا سید سجاد کے سرہانے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں خاردار طوق۔ وا عمر! وا علی!



ختم شد

حیدری کتب خانہ

۱۴/۱۵ مرزا علی اسٹریٹ امام بارہ روڈ بمبئی

ہیں، تڑپ رہی ہیں۔ آپ صاحب اولاد ہیں۔ ذرا ہاتھ دل پر رکھ کر سوچئے کہ اگر آپ کا بچہ غائب ہو جاتا ہے تو کتنی طبیعت مضطرب ہو جاتی ہے۔ پھر ایسے ماحول میں۔ اک مرتبہ آگے بڑھیں۔ جناب زینب نے کہا بن ام کلثوم ٹھہر جاؤ، کیونکہ کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ یہ آواز میری بیٹی کی ہے، یہ آواز میری بیٹی کی ہے۔

آہستہ آہستہ آواز کی طرف بڑھیں، تو کیا دیکھا کیونکہ نشیب میں ایک لاش بے سر سے لپٹی رو رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔ بابا! رات اندھیری آگئی۔ بابا! کیونکہ کس کے سینے پر سوئے گی بابا؟ اے بابا! آپ نے جو گوشوارے پہنائے تھے، شر (عین) نے جھین لیے۔ بابا! شر (عین) نے لمبا نچے لگائے۔ بابا! چچا عباس بھی مجھے پچانے نہیں آئے۔ جناب زینب و ام کلثوم آگے بڑھیں، آواز دی کیونکہ! کیونکہ! نے سراٹھایا، پھوپھی اماں آپ اس اندھیرے میں کیوں آگئیں؟ کہا بیٹی ہم تم کو ڈھونڈتے ہوئے آئے ہیں۔ اے کیونکہ! یہ کس کے جنازے سے لپٹی رو رہی ہو؟ کہا پھوپھی اماں آپ نے نہیں پچانا؟ یہ میرے بابا کا جنازہ ہے۔ اے کیونکہ! کیسے پچانا؟ کہا میں میدان میں آواز دیتی چلی آ رہی تھی۔ بابا! اے میرے بابا! کیونکہ! پکار رہی ہے اور آپ بولتے نہیں۔ اے پھوپھی اماں، اس کٹے ہوئے گلے سے آواز آئی، ادھر آجا کیونکہ! تیرا باپ ادھر ہے۔ ابھی میں نے بابا سے باتیں کی ہیں۔ جناب زینب نے سینے سے لگایا اور سینے سے لگا کے خیمہ گاہ کے قریب آئیں۔ جلی قاتیں، جلے خیمے، سنان میدان، بھیا تک سناٹا اور جناب کیونکہ! کو بچوں میں بیبیوں کے درمیان بٹھا دیا۔ ایک ٹوٹا نیزہ لے کے جناب زینب نے بیبیوں کے گرد پھرنا شروع کیا۔ کہا آپ سو جائیں، زینب جاگ رہی ہے۔ اللہ اللہ اے بی بی زینب، بھائی نے آپ کو گھر سوپنا تو آپ نے بھائی کا حق ادا کر دیا۔ کہا جاتا ہے نصف شب گزر گئی۔ بی بی زینب پہرہ دے رہی تھیں کہ دیکھا ایک سوار چلا آ رہا ہے۔ آگے بڑھیں، آواز دی، بس ٹھہر جا، آگے نہ بڑھنا، ہمارے بچے ابھی تھک کے سوئے ہیں، ہمارے بچے بھوکے ہیں، ہمارے بچے پیاسے ہیں، ہمارے بچے بے والی و وارث ہیں۔ ہمارا سامان لٹ چکا ہے۔ اگر تجھے پھر لوٹنا ہے تو صبح کو لوٹ لینا۔ واپس جا۔ جب وہ سوار نہ رکا، بڑھتا چلا آیا۔ تو جناب زینب آگے بڑھ گئیں۔ لگام فرس پر ہاتھ ڈالا، تو نہیں جانتا میں علی کی بیٹی ہوں، کیا تجھے خبر نہیں کہ میں علی کی بیٹی ہوں۔ تجھے منع کر رہی ہوں، تو نہیں مانتا۔

مولانا سید منیم کاظم جرولی صاحب

کا ارشادِ گرامی

بسمہ سبحانہ تعالیٰ



مجھے یہ جان کر نہایت مسرت حاصل ہو رہی ہے کہ جناب سیدنا ظہار حسین حیدری صاحب مالک حیدری کتب خانہ بمبئی میرے والد ماجد حضرت خطیب الایمان شیرہندوستان مولانا سید مظفر حسین طاہر جرولی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کی عشرہ مجالس کو ترتیب دیکر کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں یہ تقاریر کو دوام کیسٹوں وغیرہ سے نہیں مل سکتا تھا کیونکہ کیسٹوں کی بھی ایک حیات ہوتی ہے مگر جب تقاریر کو دامن قرطاس کے حوالے کر دیا ہے تو تقریر کو یہ شکل تحریر دوام مل جاتا ہے اور نسل بعد نسل استفادہ کیا جاتا ہے۔ لائق مبارک باد ہیں جناب سیدنا ظہار حسین حیدری صاحب جنہوں نے اس سے پہلے ”قرآن و اہلبیت“ کو کتابی شکل دیکر مومنین کو مستفیض کیا یہ کتاب نوجوان خطباء و ذاکرین کے لئے بہترین ذریعہ استفادہ ہے۔ آخر میں ہم بمعہ سب برادران جناب سیدنا ظہار حسین حیدری صاحب کو اس کتاب کی اشاعت کی بخوشی اجازت دیتے ہیں اور قارئین سے خطیب الایمان اعلیٰ اللہ مقامہ کے لئے ایک سورہ فاتحہ کی التماس کرتے ہیں۔ والسلام

خاکبائے غلامانِ اہلبیتؑ

سید منیم کاظم جرولی

۱۱۵۔ حیدر مرزا روڈ نزد مقبرہ عالیہ۔ گولہ گنج۔ سکشن نمبر ۱۸